اشفاق اللہ خاں شہید

(حیات و افکار)

کاکوری کیس کا ہیرو

ترتیب و تالیف

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

اشفاق اللہ خاں شہید

(حیات و افکار)

کاکوری کیس کا ہیرو

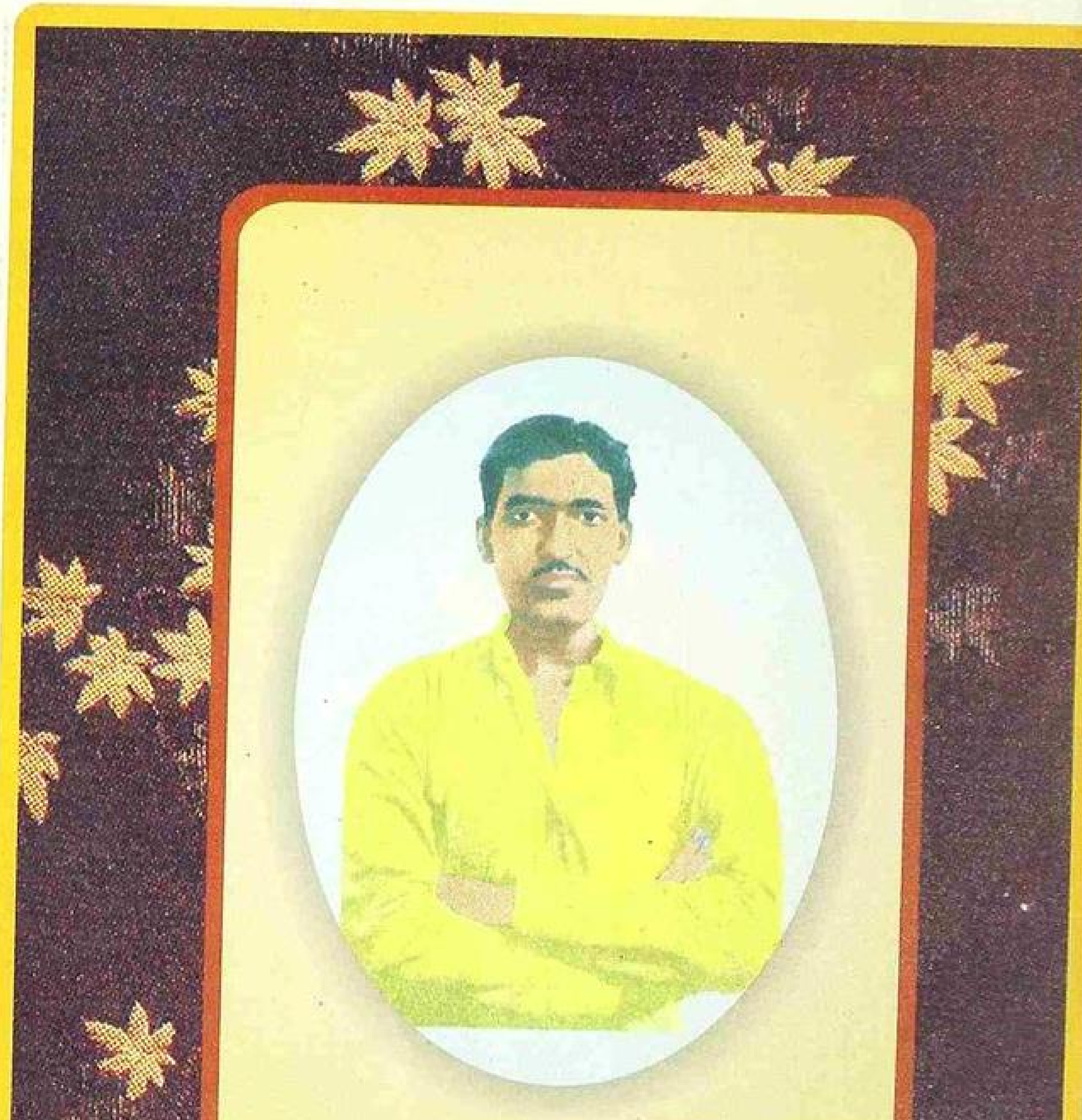
ترتیب و تالیف

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

اشاعت : ۲۰۰۴ء
قیمت : -/۲۳۰ روپے

طابع : اسلامک ونڈرس بیورو، ۲۸۳۳ کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی
ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴



اشفاق اللہ خاں (شہید)

۲۶؍ جنوری ۲۰۰۴ء

ہندوستان کے پچپنویں یوم آزادی کے پُرمسرت موقع پر

شہیدان وطن کی یاد میں!

جس ملک کی آزادی کی بنیادوں میں

اشفاق اللہ خاں، رام پرشاد، راجندر لاہڑی، روشن سنگھ

جیسے بہادروں، حریت پسندوں

اور

شہدائے وطن

کا

خون ہو، اس کے مستقبل کے لیے

کوئی خطرہ نہیں!

حرفِ آغاز

جنگ آزادیٔ ہند دورِ جدید کی تاریخ عالم کا ایک اہم اور درخشاں باب ہے۔ اس مجاہدۂ عظیم میں مذہب وملّت اور سیاسی افکار وعقائد کی تفریق کے بغیر تمام محبان وطن نے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں۔ ان مجاہدین آزادی کی صفِ اوّل میں اشفاق اللہ خاں شہید شامل ہیں۔

جنگ آزادی کے مختلف ادوار ہیں۔ اسے مؤثر عوامی تحریک کی شکل عدم تعاون نیز خلافت تحریک سے حاصل ہوئی۔ لیکن جب ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی اور ۱۹۲۴ء میں کمال پاشا کے ذریعہ خلافت کے خاتمہ نے خلافت تحریک کو بے مقصد بنادیا تو عموماً ملک میں مایوسی کی فضا طاری ہوگئی۔ اسی کیفیت سے باہر آنے کی کوشش اکتوبر ۱۹۲۴ء میں چند باعزم نوجوانوں نے کی جنھوں نے کانپور میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن (بعدہٗ آرمی) Hindustan Republican Association (Later, Army) کا قیام کیا۔ ان کا مقصد خونی انقلاب کے ذریعہ استعماری نظام کو ختم کرنا اور ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت قائم کرنا تھا۔ لیکن اس مسلح جدوجہد کے لیے وسائل کی ضرورت تھی اور ماحول سازی کی بھی۔ چنانچہ ۹/اگست ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ کے نزدیک واقع کاکوری میں ۱۰ جیالوں نے ۸ڈاؤن ٹرین کو روک کر اس میں لے جائے جارہے سرکاری خزانہ کو لوٹ لیا۔ اس واقعہ نے حکومت کو چونکادیا۔ سرکاری ردّ عمل بہت شدید رہا۔ کئی افراد گرفتار کیے گئے اور ان پر مقدمہ چلا۔ ان میں چار کو سزائے موت ہوئی : اشفاق اللہ خاں، رام بہادر بسمل، روشن سنگھ اور راجندر سنگھ لاہری؛ مزید چار کو جزیرہ انڈمان میں قید کیا گیا اور ۷ دیگر افراد کو مختلف مدتوں کی سزائے قید سنائی گئی۔

کاکوری کا واقعہ جنگ آزادی میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا جس میں پر تشدد اور انتہا پسندانہ اقدام کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانے کی کوششیں تقریباً ایک دہائی تک جاری رہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں جنگ آزادی کی تاریخ ایک مخصوص انداز میں لکھی گئی اور اس لڑائی کی مختلف جہتوں کے ساتھ مکمل انصاف نہیں ہو سکا۔ آج اشفاق اللہ خاں شہید کو قوم نے یکسر فراموش کر دیا ہے۔

جناب ابو سلمان شاہ جہاں پوری کی زیر نظر کاوش انتہائی قابل قدر ہے۔ انھوں نے ایک جامع اور مربوط تاریخ مرتّب کی ہے جس میں اشفاق اللہ خاں کے ذاتی حالات، ان کی سیاسی سرگرمیوں، ان کے افکار و خیالات اور ان کی خود نوشت کے اقتباسات شامل ہیں۔ مزید براں برطانوی حکومت کے خلاف انتہا پسند اور مسلح جدوجہد کی تفصیلی تاریخ اور اس سے متعلق دستاویزات بھی انھوں نے یکجا کر دیئے ہیں۔ انھوں نے یقیناً تحقیق و تدوین کے کام میں انتہائی دیانت برتی ہے۔ اس سے قبل بھی ان کی چند تصانیف لائبریری سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ زیر نظر تصنیف کی بھی خاطر خواہ پذیرائی قارئین کے بیچ ہو گی۔

ایک آخری بات اور عرض کر دوں۔ ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دریائے راوی کے کنارے لاہور شہر میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں ترنگا پرچم لہرا کر ہندوستان کے لیے خود اختیاری یا پورن سوراج کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ اسی کے بعد ۲۶/ جنوری ۱۹۳۰ء کو سارے ملک میں ”یومِ آزادی“ منایا گیا۔ گویا آج سے کوئی ۷۵ سال پہلے۔ اسی واقعہ کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کی اشاعت لائبریری اس موقع پر کر رہی ہے۔ یہ نہ صرف اشفاق اللہ خاں بلکہ ان تمام شہدائے قوم و ملت کو خراج عقیدت ہے جن کی قربانیوں نے ہمیں ایک آزاد اور باوقار شناخت عطا کی۔

امتیاز احمد
ڈائرکٹر

۱۸/ نومبر ۲۰۰۴ء

فہرست

باب دوم :

باب سوم :

باب چہارم :

باب پنجم :

باب ششم :

—— (حصہ دوم) ——

خودنوشت

پیش لفظ

میرے پردادا انجو خاں ۱۸۵۷ء میں بچپوریا (ضلع شاہ جہاں پور) کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ سنا ہے کہ بہت اچھے گولہ انداز تھے۔ بچپوریا کے معرکے میں جب انھوں نے دیکھا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا ہے تو اپنے چھوٹے بھائی امان خاں کو جوان کے ساتھ جنگ میں شریک تھے کچھ خوشامد کر کے، کچھ ڈانٹ ڈپٹ کے، کچھ اپنے بڑے بھائی ہونے کا واسطہ دے کر اور یہ کہہ کر آخر خاندان کی دیکھ بھال کون کرے گا، محاذ جنگ سے گھر بھیج دیا تھا اور خود لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب گولہ اندوزی کا موقع نہ رہا تو تلوار سونت لی، دست بہ دست جنگ میں حصہ لیا اور آخر دم تک شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے رہے۔ والد مرحوم محمد حسین خاں عرف مدّی خاں (جو پورے علاقے میں "مدّی بھیا" کے نام سے مشہور تھے)۔ حضرت پردادا مرحوم کے قصے اور ۱۸۵۷ء میں وطن کی آزادی کے لیے ان کے بہادرانہ کارنامے بڑے فخر اور شوق سے سناتے تھے۔ کوئی قصہ چھیڑتے تھے تو ان پر بے خودی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور پھر ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن چھوٹے پردادا کو خاندان کے جس اُجڑنے سے بچانے کے لیے گھر واپس کیا گیا تھا، وہ مقصد تو پورا نہ ہوا۔ خاندان کے مقدر میں جو اُجڑنا لکھا جا چکا تھا، وہ اُجاڑ تو ہو کر ہی رہا اور ایسا اُجڑا کہ پھر کبھی آبادی، اور خوش حالی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

والد مرحوم اپنی نوجوانی کے ایام ہی میں اپنی خالہ خالو کے پاس جلیاں دولت پور (ڈاک خانہ جلال آباد) میں آ گئے تھے۔ پھر وہیں خالہ زاد بہن سے ان کی شادی ہو گئی اور وہیں رہ پڑے تھے۔ ہمارے نانا جمعہ خاں کا خاندان بھی ۱۸۵۷ء کا ایک تباہ شدہ خاندان تھا۔ ہم پانچ بھائی اور ایک بہن وہیں پیدا ہوئے اور پڑھے پلے اور وہیں سے پاکستان کے لیے رخت سفر

باندھا تھا تو علاقے کے ایک زمیندار بلدیو سنگھ ان سے ملنے آئے تھے۔ دروازے پر دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ بلدیو سنگھ نے یہ کہہ کر سکوت توڑا :

خاں صاحب تم بھی جارہے ہو؟

ابا نے کہا : ہاں!

بلدیو سنگھ نے کہا : خاں صاحب! بھلا ہم سے کیا غلطی ہوئی جو تم ہمیں ... وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی آواز رندھ گئی اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکے۔

ابا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ زور سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں دنیا سے بے خبر رو رہے تھے!

میں اس منظر کو آج تک نہ بھلا سکا۔

چند برس ہوئے میرے چھوٹے بھائی یوسف حسین خاں شاہ جہاں پور گئے تھے۔ واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ بلدیو سنگھ کا پوتا (پرمیت سنگھ) جلال آباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں سینئر ٹیچر ہے یا اشفاق اللہ خاں کالج (جلال آباد) سے اس کا تعلق ہے۔ یہ سُن کر مجھے احساس ہوا کہ ابھی میرا کوئی ہے۔ جی چاہا کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور اسے دیکھ آؤں؛ لیکن اب ہندوستان کا سفر اُڑ کر پہنچنے سے زیادہ دشوار ہو گیا ہے، خدا سے دعا ہے، وہ خوش رہے!

جب تک جلیاں دولت پور (ننہیال) میں رہا، حضرت والد مرحوم کی صحبت میسر رہی۔ جنگ آزادی میں اپنے خاندان کی قربانی اور ایثار کے قصے سنتا رہا۔ شاہ جہاں پور کے ضلع میں ایک چھوٹی سی جاگیر "پنہتی" کی تھی۔ نانا مرحوم کے خاندان سے ان کی رشتہ داری تھی۔ یہ جاگیر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ضبط کرلی تھی اور اس کے سربراہ قادر علی خاں (۱۸۷۱ء) کو کالے پانی بھیج دیا گیا تھا۔ والد مرحوم کو اس خاندان کے بعض اخلاف مثلاً قادر علی خاں کے پوتے کوثر علی خاں ابن جعفر علی خاں سے خاصہ تعلق تھا، وہ ان کا تذکرہ بھی اکثر کیا کرتے تھے۔ مجھے ان سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

جب میں تعلیم کے سلسلے میں ایک بزرگ چچا مولانا محمد عبدالہادی خاں (تاجر کتب بازار بہادر گنج) کے پاس شہر گیا تو وہ چوں کہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی کے خاص شاگرد اور مدرسہ امینیہ، دہلی کے فارغ التحصیل تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد

ایک طویل عرصہ دہلی میں گزارا تھا اور دہلی کے مرکز علم و تہذیب میں سیاسی اور صحافتی زندگی کے ناتے بزرگانِ دیوبند اور اکابر جمعیت علماء ہند سے بہت قریبی تعلق رہا تھا۔ وہ ان کے علم و عمل، بزرگی اور سیاسی خدمات کے قصے سنایا کرتے تھے۔ مجھے مرحوم چچا کی صحبت و تربیت سے بہت فائدہ ہوا۔ دینی ذوق بھی پیدا ہوا اور سیاسی و سماجی خیالات کو بھی تقویت ملی۔ ان حالات اور صحبتوں میں مجھے جو کچھ بننا چاہیے تھا، وہی بنا۔ اور ایک ایسے شخص کے بارے میں جس کے حالات دنیا کے سامنے ہوں، جس نے اپنے اچھے یا برے خیالات کو چھپایا نہ ہو، جس کے قلم نے ہمیشہ اس کے دلی خیالات کی ترجمانی کی ہو اور جس کی تحریرات اس کے افکار کی پردہ پوش نہ بنی ہوں، دور و نزدیک کے لوگوں کی رائے بھی وہی ہیں جو اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہو سکتا تھا۔

مولانا عبدالہادی خاں جن کے زیر نگرانی اللہ تعالیٰ نے میری تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا، انھی کی بھتیجی سے میری شادی ہوئی۔ آں مرحوم کی صحبت سے مجھے ایک تو یہی فائدہ پہنچا کہ وقت کے علمائے کرام، رجال کار اور بزرگان دیوبند اور اہل حدیث کے انقلابی سلسلوں اور ان کی تحریکوں سے واقفیت ہوئی اور مطالعہ و تحریر کا شوق بھی انھی مرحوم کی صحبت کا فیضان ہے۔

اشفاق اللہ خاں شہید کا چوں کہ اس خاندان سے رشتہ داری کا تعلق تھا، سیاسی ذوق کے لحاظ سے بھی عم محترم اور آں شہید ایک ہی دایرے کی شخصیت تھے اور شہادت کے واقعے نے عقیدت اور فخر کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے گھر میں اور باہر اکثر ان کا ذکر ہوتا تھا۔ نیز پریم کشن کھنا مرحوم چچا کے دوستوں میں ایسے تھے جن کا تعلق کاکوری کیس سے براہ راست تھا اور اس کیس میں انھوں نے سزا پائی تھی، ان سے بھی کسی نہ کسی تقریب سے ذکر آجاتا تھا۔ میرے لیے یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ میں ان باتوں کو بہت شوق سے سنتا تھا۔ لیکن ان کی باتیں مختصر ہوتی تھیں اور میرے شوق کی انتہا نہ تھی۔ نہ تو ان حضرات کے سامنے بولنے اور کچھ پوچھنے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ اس واقعے کے بارے میں پڑھنے کی کوئی چیز میسر تھی۔ اس وقت واقعے کی تفصیل اور اشفاق اللہ خاں شہید کے حالات جاننے کے شوق کی تسکین کا کوئی سامان میسر نہ ہوا، اور جب پاکستان آگیا تو ان باتوں سے بھی دور اور ان صحبتوں سے بھی محروم ہو گیا۔ اگر کبھی ان کی یاد آتی تو دل مسوس کر رہ جاتا!

مجھے اس موقع پر اپنے برادرِ نسبتی پروفیسر عصمت اللہ خاں کا ذکر ضرور کرنا چاہیے۔ وہ اگرچہ میرے استاد تھے۔ لیکن میں انھیں محسن بھیا کہا کرتا تھا۔ ان سے اشفاق اللہ خاں سے قریب کا رشتہ تھا اور پڑوس کا تعلق بھی تھا۔ محسن بھیا محلّہ جلال نگر میں رہتے تھے۔ اشفاق اللہ خاں اس کے قریب محلے ایمن زئی میں رہتے تھے۔ اشفاق شہید کے بہادرانہ کارنامے نے ان کے دل میں فخر و احترام اور شہادت نے عقیدت پیدا کر دی تھی۔ لیکن کاکوری کے واقعے کی تفصیل اور شہید کے حالات کا انھیں بھی علم نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ وہی میری دلی مراد پوری ہونے کا سبب بنے۔ اس روز میری خوشی کی انتہا نہ تھی، جب مئی ۱۹۷۱ء کی ایک شام کو انھوں نے اشفاق شہید پر ایک کتاب لا کر دی۔ یہ کتاب "یادگار اشفاق" کے نام سے بنارسی داس چترویدی اور فہیم فیروز آبادی کی مرتبہ چند تحریرات کا ایک مجموعہ تھا۔ جس میں اشفاق اللہ خاں کے خود نوشت حالات، خطوط، پیغامات، کلام اور ان کے بھائی، مقدمے کے وکیل، چند ساتھیوں وغیرہ کے مضامین تھے۔ اس کتاب کا مطالبہ میرے شوق کی تسکین کا موجب ہوا۔ اس کے بعد اگرچہ بہت سا مواد میرے مطالعے میں آیا اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ لیکن اشفاق اللہ خاں شہید پر کتاب لکھنے کا پہلا محرک اسی یادگار مجموعے کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔ زیرِ نظر تالیف میں میں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اسی لیے کتاب کے آخر میں اس کے مندرجات و مشمولات کی مکمل فہرست شامل کر دی ہے۔

محسن بھیا کی اس عنایت کے لیے میں ان کا بہت شکر گزار ہوا اور وہ میری اس خوشی کو دیکھ کر لطف اندوز ہوئے تھے۔ آج وہ اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گویا میرے پاس ہیں اور بہت خوش ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مراتب بلند کرے۔

"یادگار اشفاق" کے سوا ان پر کوئی کتاب تو نہیں آئی، لیکن دسیوں کتابوں میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مضامین نظر سے گزرے ہیں اور اخبارات کے فائلوں میں کاکوری کے مقدمے کی تفصیلات پڑھی ہیں۔ اخبارات سے مراد صرف دو اخبار روزنامہ 'ہمدرد' دہلی اور روزنامہ 'عصر جدید' کلکتہ ہیں۔ ان اخبارات کی فائلیں کراچی میں مدینۃ الحکمت کی ہمدرد لائبریری میں موجود ہیں۔ جن کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، ہمدرد میں تو جو کچھ تھا، مجھے اس کا عکس بنوانے کا بھی موقع مل گیا اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ عصر جدید کی صرف چند

تحریرات کی نقل حاصل کر سکا۔ ان فتوحات کو میں نے اس کتاب کے حصہ سوم میں مرتب کر دیا ہے، تاکہ آیندہ آنے والے محقق کے لیے محفوظ رہیں۔

خفیہ انقلابی تحریکات جنھیں انگریزوں نے دہشت گردی اور ڈاکے کے واقعات سے تعبیر کیا ہے، تحریک آزادئ وطن کا بہت اہم موضوع ہے اور ابھی تک کسی آزاد محقق نے اس پر توجہ نہیں کی، یا ایسا کوئی میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کچھ ملتا ہے تو وہی ہے جو انگریزی حکومت کی پالیسی اور اس کی سیاسی مصلحتوں کے مطابق تھا اور اپنی ضرورت سے اس نے محفوظ کیا تھا۔ اگرچہ اخبارات کی مجرد رپورٹیں بھی غلطیوں سے قطعی پاک نہیں ہوتیں لیکن ایک محقق کو ان میں واقعے کی جڑ تک پہنچنے اور اس کے واقعی پس منظر کو جان لینے کے لیے اشارات ضرور مل جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے اخبارات سے دستیاب شدہ مواد سے اس تالیف میں فائدہ اٹھانے کے بعد اسے ضائع کر دینے کے مقابلے میں اس کا محفوظ کر دیا جانا زیادہ مفید سمجھا۔

خفیہ اور انقلابی تحریکات کا ہماری آزادی اور آزادی کے لیے آئینی تحریکات کو آگے بڑھانے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ ان تحریکوں اور ان کی کارگزاریوں نے اس وقت عوام کے خون کو گرم اور جذبۂ حریت کو زندہ رکھا تھا، جب آئینی حدود میں رہ کر بھی کسی کو حکومت سے کوئی مطالبہ کرنے اور مراعات مانگنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ۱۸۸۵ء تک، جب کانگریس کا نقش ظہور ہوا تھا۔ خفیہ اور انقلابی تحریکیں اپنا ایک دور مکمل کر چکی تھیں۔

ان تحریکوں نے کانگریس کے لیے وہی خدمات انجام دی تھیں، جو فوج کا وہ دستہ انجام دیتا ہے، جو دشمن کی فوج، اس کی تیاری، اس کے سامانِ حرب و ضرب اور اس کے ارادوں کو بھانپنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر خطرات میں کودتا ہے، آگے بڑھتا ہے اور حالات کو پوری طرح سمجھ کر اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ انقلابی تحریکات نے آئین کی حدوں میں رہ کر کام کرنے والی جماعتوں اور تنظیموں کے لیے اپنے فداکارانہ اقدامات سے انھیں اشارہ کیا کہ وہ اپنی مانگوں میں کس حد تک آگے بڑھ سکتے اور مطالبوں میں کس درجہ زور و قوت پیدا کر سکتے ہیں؟

کوئی تحریک سرمایے کے بغیر نہیں چل سکتی۔ انقلابی تحریکوں کو چلانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کوئی شخص کھل کر ان کی امداد کا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ملک

میں سیاسی ذوق رکھنے والوں ہی کی نہیں وطن کی آزادی سے عشق کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی اور کسی نہ کسی ذریعے سے ان کو امداد حاصل ہو جاتی تھی اور کام چلتا رہتا تھا۔ کانگریسی خیال کے لوگ بھی ان کی مدد کرتے تھے۔

۱۹۳۰ء کے بعد جب کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں عدم تشدد کو لازمی طریقۂ کار کے طور پر اپنا لیا تھا۔ ہزاروں وطن دوستوں اور آزادی پسندوں نے انقلابیوں اور خفیہ تنظیموں کی مالی امداد سے ہاتھ روک لیے تھے۔ ان کے راستے میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے ہو گئے تھے۔ ان حالات میں انھیں کام جاری رکھنے کے لیے سرمایے کی تلاش میں بعض ایسے طریقے اختیار کرنے پڑے جن کی سچائی منوانا بڑا مشکل تھا۔ مین پوری، بچپوری، برولی وغیرہ کی وارداتوں کا تعلق حصول سرمایہ کے انھی طریقوں سے تھا۔ یہ احساس کاکوری کیس کے انقلابیوں کا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ سوچ مثبت اور انداز فکر درست تھا۔

ان حالات نے ان کی کامیابی کی راہ کو مشکل تر بنا دیا تھا۔ ان کی کارگزاریاں کم ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اس کے دوسرے اسباب بھی تھے۔ اس کے باوجود آزادیٔ وطن کی راہ میں ان خفیہ انقلابی تحریکات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا!

ہندوستان کے عوام کے لیے جو فطرۃً نرم مزاج، برداشت والے، غریب، نہتے، قناعت پسند، اپنے حالات میں مگن رہنے والے اور کھیتی باڑی کرنے والے ہیں۔ ستیہ گرہ (طریق مقاومت بالصبر)، عدم تشدد (نان وائیلنس)، ساتھ چھوڑ دینے (ترک موالات) اور خاموشی کے ساتھ فرمانبرداری سے انکار کر دینے (سول نافرمانی) کی پالیسی کے سوا کوئی دوسرا طریق کار مناسب ہی نہ تھا۔ اگر یہ طریق کار پورا پورا گاندھی جی کی دریافت تھا تو اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی شاباشی کے مستحق اور داد کے حقدار ہیں۔ لیکن کیا ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء کے بعد تشدد کی پالیسی بالکل ترک کر دی گئی تھی اور یہ محض ایک عقیدہ تھا؟ اس بارے میں میرا ذہن صاف نہیں ہے!

(۱) ۱۹۴۲ء میں پنجاب کے دورے میں لاہور، امرتسر اور دیگر مقامات پر مولانا آزاد نے جو تقریریں کی تھیں، وہ صاف طور پر تشدد آمیز تھیں۔ بادشاہی مسجد میں انھوں نے جو تقریر کی تھی، سرکاری اخبار میں اس کا عنوان "صحن مسجد میں باغیانہ تقریر" قرار دیا گیا تھا۔ ۲۳؍ مارچ کو جمعیت علمائے ہند کے جلسے کی تقریر میں ان کا یہ جملہ

یادگار ہے: ''انگریزی حکومت کے خلاف جو چولھا دہک رہا ہے، میرا فرض ہے کہ میں اس میں لکڑیاں ڈال دوں''۔ وائسرائے نے گاندھی جی سے شکایت کی کہ مولانا کی یہ تقاریر کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی سے تجاوز ہے۔ اس میں تشدد کی کھلی دعوت ہے! کیا گاندھی جی کی انھیں روکنے سے معذرت اس پالیسی سے انحراف نہ تھا؟

(۲) کیا اگست ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں عوام کو خود اپنے لیے راہ عمل اختیار کرنے کی اجازت عدم تشدد سے مشروط اور اس کے دایرے میں تھی؟

(۳) اس زمانے میں سنگاپور میں ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت اور انڈین نیشنل آرمی کا قیام اس کے اقدامات اور کارگزاریوں پر کانگریس کی خاموشی، ۱۹۴۱ء میں سبھاش بابو کے ملک سے فرار سے ۱۹۴۵ء میں ان کے حادثۂ انتقال تک ان کی سرگرمیوں پر تبصرہ و تنقید سے صرف نظر اور انتقال کے حادثے پر گاندھی جی کی کمال رنجیدگی ستیہ گرہ کے ذوق میں دل کے کھوٹ کی طرف اشارہ نہیں کرتی؟

(۴) اور ۱۹۴۹ء میں جب کہ آزادی کی صبح نمودار نہ ہوئی تھی اور ملک ابھی تحریک آزادی کے دور سے گزر رہا تھا۔ انڈین آرمی کے نوجوانوں کے دفاع کے لیے پنڈت جی جواہر لال نہرو کا گون پہن کر عدالت میں حاضر ہونا اور صفائی کے وکلاء کا فوجی قانون اور کورٹ مارشل کی دھجیاں اُڑا دینا اور یہ ثابت کرنا کہ آزاد ہند فوج نے جو کچھ کیا، اسے وہی کرنا چاہیے تھا، وہی وقت کا تقاضا تھا، وہی درست تھا۔ کوئی محبّ وطن اور قوم پرور جماعت اس کے سوا کچھ کر ہی نہ سکتی تھی! مولانا آزاد کا ۲۱/ اگست کا بیان اس کا غماز ہے۔ عدالت کے باہر مظاہروں کو منظم کرنے یا ان کے احتجاجوں اور ہڑتالوں سے صرفِ نظر کر لینا کیا ستیہ گرہ کے ''اصول'' کی خلاف ورزی اور ''عقیدے'' سے روگردانی نہ تھی؟ بہ ظاہر تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ''عدم تشدد'' محض ایک طریق کار یا صرف ایک پالیسی تھی، عقیدہ نہ تھا۔ اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اگر کسی وقت اس کی ضرورت پڑی تو اس ہتھیار سے کام لیا جائے گا!

پس اگر ۱۹۲۰ء کے بعد بھی ایک حد تک کانگریس ان انقلابی تحریکات کو اپنا ہراول دستہ سمجھتی اور اس کی جانب سے کسی نہ کسی صورت میں، انھیں تھوڑی یا بہت امداد ملتی رہتی اور کانگریس سے متاثر سرمایہ دار کانگریس کے اصول عدم تشدد کو بہانہ نہ بناتے، مقدمات میں ان کے دفاع کا کانگریس کے نام سے نہ سہی، کوئی آزادانہ عوامی نظام دفاع قائم کر دیا جاتا، گاندھی اروِن پیکٹ میں ان کی رہائی کے لیے شق رکھ دیتے، جس کا عوامی مطالبات کی آڑ میں کوئی نہ کوئی جواز پیدا کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ نہ صرف کاکوری کیس میں بلکہ مین پوری، بمرولی، میرٹھ وغیرہ نیز لاہور کے پہلے اور دوسرے سازشی کیسوں، "چٹ گاؤں اور آرمری حملے کے مقدمے"، بم کیسوں، برٹش حکومت کے چھوٹے بڑے آفیسران کے قتل کے واقعات میں خواہ ہندوستان میں ہوئے ہوں، خواہ جزائر انڈمان میں، خواہ انگلینڈ میں ہوئے ہوں، عوام کی ساری ہمدردیاں تو استغاثے کے ملزمان کے ساتھ تھیں۔ اگر ایسا تھا تو ان کی حمایت کے لیے کوئی اصول اور دفاع کے لیے کوئی طریق عمل بھی دریافت کر لیا جاسکتا تھا۔

بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ کانگریس کی خاموشی اور عدم دلچسپی سے حکومت کو من مانی سزائیں دینے اور ملزمان کے خلاف تشدد کا رویہ اختیار کرنے کی شہ ملی ہے!

جیل میں قید و بند کی زندگی "بھگتنے والے" کے ذوق، مزاج، سیرت، عادات و خصایل، انداز فکر اور خیالات میں کسی نہ کسی قسم کی اور کسی نہ کسی حد تک تبدیلی ضرور آتی ہے۔ بعض اوقات تو جیل کی زندگی قیدی کی پوری شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کا ردِّعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ نئی نفسیات جنم لیتی ہیں۔ کوئی انتہا پسندانہ فکر یا رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر قیدی اپنے جرم میں پختہ کار ہو جاتے ہیں۔ نئے خیالات اور جرائم سے آشنا ہوتے ہیں۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کے بارے میں کہا جائے تو ہم ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہر انقلابی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ اشتراکی اور کمیونسٹ ہو گیا تھا تو یہ بات یقین کر لینے کے لائق نہیں ہے۔

جیل کی زندگی میں جہاں کسی ہم ذوق، ہم خیال، پہلے کا ساتھی اور ہمراز کی صحبت میسر نہ ہو، قیدی میں ہر کسی کو برداشت کرنے اور کمپرمائز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرے کا ہم خیال نہ ہو اور ہم خیال نہ بن سکے، تب بھی وہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا یا

خاموش رہے گا۔ اور اگر کوئی شخص مصیبت کے دنوں کے کئی ساتھی سے رہائی کے بعد کی زندگی میں رواداری برتتا ہے، میل جول رکھتا ہے اور اس کی محفلوں میں شریک ہوتا ہے تو اس کے رویئے سے ہم فکری اور ہم خیالی کی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا چاہیے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے وطن واپس آنے کی اجازت کے وقت، یہ مسئلہ بھی اٹھا تھا کہ اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کے بارے میں آیندہ ان کا رویّہ کیا ہوگا؟ اس کا جواب انھوں نے اس قسم کا دیا تھا:

> ''پردیس میں ان سے ملنا جلنا ہماری ضرورت تھی کہ غریب الوطنی میں ان کے سوا کوئی صحبت بہم نہ تھی اور اب ان سے تعلقات ہماری رواداری اور محض اخلاق و مروّت کا تقاضا ہوگا۔ ہماری ان کی فکری راہیں جدا اور عمل کے میدان الگ ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ ان کی سیاسی، مذہبی خیالات ہم سے مختلف ہیں، ان سے سماجی تعلقات کیسے بگاڑ سکتے ہیں؟''

کسی وطن دوست اور قوم پرور شخص سے تو اس کی توقع ہی نہ رکھنی چاہیے کہ وہ مارکس کا فلسفۂ حیات یا لینن کا نظریۂ عمل یا اشتراکیت یا کمیونزم کی آئیڈیالوجی اختیار کرلے گا۔ آخر وہ اپنے وطن اور عوام کے حالات اور وقت کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے کسی دوسرے ملک کے مخصوص نظریات اور فلسفۂ عمل کو کیوں اختیار کرنے لگا؟

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند پاکستان میں فکری اور سیاسی بنیادوں پر کمیونسٹ اور اشتراکی کبھی نہ اتنے مضبوط ہوئے نہ موثر کہ وہ بحیثیت ایک جماعت اور اس کے فلسفے کے سیاسی میدان میں اپنا کوئی نقش جما سکے ہوں۔ اس کے رہنماؤں کو اپنے لیے متعدد بار کانگریس کے شلٹر (سائباں) کی ضرورت پیش آئی۔ اور کانگریس میں رہ کر وہ کبھی اس کے انداز فکر کو بدلنے اور کسی تحریک کے وقت اس کا رُخ موڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکے اور اگر کبھی سوشلسٹ یا کسی اور پارٹی کے نام سے منظم ہونے کی کوشش کی تو سیاسی میدان میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کرسکے۔

اس کے تمام نامور رہنما، سوائے معدودے چند کے اونچے طبقے سے یا ملازم پیشہ درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور بعض تو اسی استعماری حکومت کی آرمی کے ملازم یا انتظامیہ کا حصہ تھے، جن کے خلاف تحریک انقلاب کے وہ مدعی تھے۔ وہ ملک میں کبھی ایسی

قوت نہیں بن سکے جو کوئی مؤثر تحریک پیدا کرتے۔ انقلابیوں میں اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو اس کے وجوہ دوسرے تھے۔

اس کی ایک اور سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ خفیہ تحریکات کا وقت گزر چکا تھا۔ تحریک خلافت سے پہلے جو باتیں خفیہ کی جاتی تھیں، اب وہ باتیں اخبار کی زینت بنتی تھیں۔ پہلے ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں گذارشات پیش کی جاتی تھیں، اب وہ کسی تکلف و تخاطب کے بغیر مطالبات بن گئی تھیں۔ تحریک خلافت کے زمانے میں اور اس کے بعد حکومت سے ان کاموں میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا گیا، عدالتوں اور تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ کیا اور حکومت کی امداد لینے سے انکار! حکومت کی پالیسیوں اور اس کے اقدامات پر تنقیدیں ہوتی تھیں، ملک کی آزادی اور استعمار سے گلو خلاصی پر جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے علی الاعلان تجویزیں پاس ہوتی تھیں۔ جشن فتح منانے سے، گھروں کو سجانے سے اور چراغاں کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حکومت کے جبر و تشدد کا خوف عوام کے دلوں سے نکل گیا تھا اور جیل جانا بچوں کا کھیل بن گیا تھا۔ شاہی مہمان (شہزادہ ویلز) کا احترام و تواضع اور خیر مقدم تو دور کی بات تھی، وہ لاہور، دہلی، کلکتہ وغیرہ جہاں گئے، عوام نے حکومت کے خلاف اظہار ناراضگی کے لیے ہڑتال کر دی۔ برطانوی حکومت کے نمائندے سائمن کمیشن کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کیا گیا۔

سول نافرمانی کی تحریک چلی، نمک کے قانون کو علی الاعلان توڑا گیا، حکومت کے قوانین اور احکام ماننے اور ٹیکسوں کی ادائیگی سے عوام کو روک دیا گیا اور حکومت محض لاچار ہو کر رہ گئی۔ جنگ چھڑی تو جنگ میں ملک کی شرکت کے حکومتی فیصلے کو ماننے سے، وار کمیٹیوں میں شرکت سے، وار فنڈ میں حصے لینے سے نہ صرف کانگریس اور قوم ہمدرد جماعتوں نے انکار کیا بلکہ عوام کو چندہ دینے سے منع کر دیا اور حکومت ان کے خلاف کوئی تعزیری یا انضباطی قدم نہ اٹھا سکی۔ ہندوستان کے جنگی بجٹ پر سخت تنقید کی گئی۔ گورنروں کی مٹی پلید ہو گئی تھی۔ ہز ایکسی لینسی وائسرائے سے ملنے سے انکار کر دیا جاتا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے دوران اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس کا "ہندوستان چھوڑو" ریزولیوشن بہت بڑی جرأت اور اہم اقدام تھا۔ یہ محض ایک جماعت کی رسمی قرارداد نہیں حکم تھا۔ اس میں اہنسا، ستیہ گرہ اور عدم تشدد کا کوئی اصول کارفرما نہیں تھا۔ رہنماؤں کی گرفتاری کی

صورت میں تحریک کی ذمہ داری ملک کے عوام پر ڈال دینا عوام پر کانگریس کا بہت بڑا اعتماد تھا اور مابعد نتائج سے گاندھی اور ان کے پیروانِ خاص کا بے نیاز ہو جانا ایک طرف تو گویا عدم تشدد کے عقیدے کی رسم تدفین کی ادائیگی کا عمل تھا اور دوسری طرف ہندوستان میں برٹش اقتدار کے تابوت میں کیل ٹھوکنا تھا۔

اب چوری چورا کے واقعے پر گاندھی کے لرز اٹھنے، ترک موالات کے پروگرام کو روک دینے اور اس کہنے کا کہ ابھی عوام اس حد تک تیار نہیں ہوئے کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے اور کہاں عوام پر یہ اعتماد کہ اب جو کچھ کریں گے عوام ہی کریں گے۔ ایک ہی بزرگ کے ان دونوں رویّوں کا موازنہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کانگریس عوام سے وہی کچھ کروانا چاہتی تھی جس کی اجازت اس کا دستور نہ دیتا تھا اور جو کام انقلابی جماعتیں چھپ کر کرتی تھیں اب کانگریس نے اعلانیہ اسی طریقہ کار کو اپنا لیا ہے۔ اب کانگریس ایک آئینی جماعت اور عدم تشدد کی پابند نہیں رہی تھی۔ اب وہی وقت کی سب سے بڑی انقلابی جماعت ہے، جسے تشدد کے استعمال کے بغیر تشدد کا فائدہ اٹھانے کا گُر معلوم ہو گیا ہے۔

کانگریس کو یہ مقام ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کے ریزولیوشن کے بعد سول نافرمانی کی کئی ادوار میں منقسم طویل تحریک کی آزمائش اور تجربے سے گزر کر حاصل ہوا تھا۔ اس میں کوئی ڈھکی چھپی اور خفیہ بات نہ تھی۔ کانگریس کی جس تحریک نے ملک کے سینتیس کروڑ عوام کا مزاج بدل کر رکھ دیا تھا، کیا خفیہ انقلابی جماعتوں کے عام و خاص کی نظریں اس تبدیلی پر نہ ہوں گی اور وہ سبق حاصل کرنے اور اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالنے کے بجائے اشتراکیت اور کمیونزم کے فلسفہ و نظریات کو پڑھ رہے ہوں اور اس فلسفے کے استادوں اور اُن نظریات کے ماہرین کی طرف دیکھ رہے ہوں گے؟

اگلے سال اکتوبر ۱۹۴۳ء میں پیش آنے والا سب سے اہم واقعہ سنگاپور میں آزاد ہندوستان گورنمنٹ کا قیام، آزاد ہند فوج کی تنظیم اور اس سلسلے کے دوسرے انتظامات ہیں۔ اس سلسلے میں چوں کہ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کر رہے ہیں۔ اس سے سنگاپور میں قائم شدہ ہندوستان کی آزاد قومی حکومت اور فوج کے قیام کی تاریخ، مقاصد اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں ہندوستان کی آزادی کی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس موقع پر اس بحث سے گریز کرتے ہیں اور حکومت کی بے بسی اور لاچاری کی اس کیفیت کی طرف توجہ

دلانا چاہتے ہیں کہ جس برٹش امپائر کی ہیبت دنیا کے دلوں پر طاری تھی، جو ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرتی تھی، جس کی دہشت گردی کے سامنے جاپان نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے، وہ آزاد ہند فوج کے سپاہیوں اور آفیسروں کو جنھوں نے برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کا تختہ اُلٹ دینے کی کوشش کی تھی، انھیں باعزت رِہا کرنے پر مجبور تھی۔ اور
۱۹۴۷ء کے شروع میں جس نے جون ۱۹۴۸ء میں ملک کو آزاد کرنے کا اعلان کیا تھا، چند ہی روز میں ہندوستان کے اقتدار سے الگ ہو جانے کے انتظامات کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کی عظیم الشان کامیابی کے بعد کا ہندوستان، وہ ہندوستان نہیں تھا، جس میں انقلابی ذوق رکھنے والے محبان وطن نے حصول آزادی کے لیے ایک طریق کار اختیار کیا تھا اور خفیہ جماعتیں بنائی تھیں اور وطن کی آزادی کے لیے مرنے جینے کی قسمیں اور سوگندیں کھائی تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں جس روز کانگریس نے مکمل آزادی کو اپنا کریڈ بنایا تھا، ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا تھا۔ اس دور کے تقاضوں کے بارے میں غور و فکر اور فیصلے کے لیے کسی نئی آئیڈیالوجی، مارکس کے فلسفے یا لینن یا مسولینی کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ لیکن اس وقت جو لوگ حکومت کے شکنجے میں آگئے تھے یا ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء تک جو انقلابی وقت کے تقاضے اور حالات کے رفتار کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے اور کوئی اقدام بھی کر چکے تھے۔ ان کے لازمی نتیجوں کو بھگتنا ان کا مقدر تھا۔ وہ ان سے کیسے بچ سکتے تھے؟

اس سلسلے میں بڑی بات یہ ہوئی کہ ہندوستان نے انھیں قبول کر لیا، معاشرے نے انھیں عزت کا مقام دیا اور وقت کی حکومت نے بھی ان کے پچھلے کسی رویّے کے مارے بازپُرس نہ کی اور نہ کسی فکر و عقیدے کی بنا پر ان سے کوئی لاگ رکھی۔ جیسا کہ برصغیر کے ایک حصے میں چودھری رحمت علی کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ اقبال شیدائی کے ساتھ ایوب خاں کے دور تک ایک خاص رویّہ روا رکھا گیا اور بادشاہ خاں کے ساتھ ان کی زندگی بھر یہی کچھ ہوتا رہا۔

دوسرے انقلابیوں اور مجاہدین آزادی کے بارے میں کیا کہا جائے۔ جو برٹش استعمار کے دور میں جیلوں میں ڈالے گئے، گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہوئے لیکن کبھی ہمت نہ ہاری تھی۔ لیکن آزادی کے بعد اپنی حکومت کے مقابلے میں انھوں نے شکست

تسلیم کرلی۔ خاموشی کو شعار بنائے رکھااور گمنامی کی زندگی گزار کر موت سے ہم کنار ہو گئے۔ آزادیٔ وطن کے لیے نہ تو ہم ان کی خدمات سے واقف ہو سکے اور نہ ان کی خدمات پر ہم انھیں خراج تحسین ہی پیش کر سکے۔

اس کے باوجود ہم اعتراف کرتے ہیں کہ جس آزادی سے ہم لطف اندوز ہو رہے ہیں، اس کے حصول میں بہت سے معلوم و نامعلوم، نظر انداز شدہ اور گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کا حصہ ہے۔ان کا تعلق برصغیر ہند پاکستان کی کسی ایک قوم،ایک طبقے اور ایک ہی عقیدہ و مذہب رکھنے والوں سے نہیں۔ان سب کے احترام سے ہمارا سینہ معمور ہے اور ہم سب کے شکر گزار ہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری
یکم جولائی ۲۰۰۳ء

R. 10, 5C/3
North Karachi Town
Karachi 75850
Pakistan

کاکوری سازش کیس ۲۷-۱۹۲۵ء

(مختصرات)

وقوعہ :

۹/ اگست ۱۹۲۵ء کی شب میں کاکوری کے قریب سہارنپور سے لکھنؤ جانے والی ٹرین کو روک کر اس میں موجود سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا تھا۔ یہ انڈین ری پبلک ایسوسی ایشن کے صرف دس نوجوان تھے، جو اس وقوعہ کے ذمہ دار تھے۔

ملزمین کی تعداد اور فردِ جرم :

شروع میں ۳۷ گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں، لیکن ماخوذ ملزمین کی تعداد ۲۴ تھی۔ ان کے نام سپرنٹنڈنٹ پولس مسٹر ہارنس نے دفعہ ۳۹۶، ۳۰۲ اور ۱۲۰/ب تعزیرات ہند کے تحت فردِ جرم لگائی تھی اور دفعہ ۱۲۱/ الف کے تحت استغاثہ دایر کیا گیا تھا۔

اس وقت تک تمام ملزمان گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ کئی افراد مفرور تھے۔ وہ بعد میں گرفتار ہوئے اور انھیں مقدمہ میں شامل کرلیا گیا۔

(روزنامہ 'ہمدرد' دہلی، ۹/ دسمبر و ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۵ء)

منصفین :

(۱) سید عین الدین، اسپیشل مجسٹریٹ

(۲) مسٹر اے ہملٹن، اسپیشل جج

(۳) مسٹر آر جینٹ، اشفاق اللہ اور ایس این بخشی کے مقدمے کے سیشن جج

وکلا :

(الف) استغاثے کے :

(۱) مسٹر خیرات نبی۔ پبلک پراسی کیوٹر و مشیر قانونی خفیہ پولیس

(۲) سر راس اسٹن بیرسٹر الہ آباد۔ (یہی صاحب کراچی کے مشہور مقدمہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں حکومت کے وکیل تھے)۔

(۳) پنڈت جگت نرائن مُلّا۔ ہر پیشی پر مبلغ پانچ سو روپے محنتانہ وصول کرتے تھے۔

(۴) پنڈت آنند نرائن مُلّا۔ جونیر وکیل تھے۔ مبلغ ایک سو روپے محنتانہ ہر پیشی پر وصول کرتے۔

(۵) شیام سندر نرائن۔ چند پیشیوں پر وکالت کے فرائض انجام دیئے۔ پھر الگ ہو گئے۔

(ب) صفائی کے :

(۱) پنڈت ہرکرن ناتھ مشرا

(۲) بابو موہن لال سکسینہ

(۳) بابو سیتارام ایم ایل اے

(۴) گلزار محمد خاں، کانپور کے ایک ملزم راج سنہا طالب علم بنارس ہندو یونیورسٹی کی پیروی کی۔

(۵) مسٹر بنرجی وکیل بنارس۔ سچیندر ناتھ بخشی مفرور ملزم کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کے حکم نے خلاف ملزم کے باپ کی طرف سے عذر داری کی۔

(۶) احسان الرحمٰن قدوائی۔ اشفاق اللہ خاں کے بھائیوں کی طرف سے اسی قسم کی عذر داری۔

(۷) پنڈت گووند ولبھ پنتھ

(۸) مسٹر چودھری۔ سینئر وکیل ملزمان عدالت سیشن۔

(۹) مسٹر کرپا شنکر ہجیلا۔ اشفاق اللہ خاں کے سیشن کورٹ میں پیروکار۔

اسیسرز :

(۱) مسٹر بنواری لال بھارگو

(۲) مسٹر محمد یعقوب

(۳) مسٹر چٹرجی

(۴) مسٹر عبدالسلام خاں (ہمدرد۔ دہلی، ۵/ مئی ۱۹۲۶ء)

اسیسروں کی رائے (ہمدرد۔ دہلی، ۲۶/ مارچ ۱۹۲۷ء)

(عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۶/ مارچ ۱۹۲۷ء، ص ۳)

اشفاق اللہ خاں اور ایس این بخشی کے اسیسرز :

(۱) محمد زکی (۲) ایم ایس کوشل (۳) مرزا محمد علی

ایک رکن کا دورانِ مقدمہ انتقال ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ پُر نہیں کی گئی۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۸/ جون ۱۹۲۷ء)

ملزمانِ کاکوری کیس :

کاکوری کے قریب ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹنے کے الزام میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کے لیے مسٹر آر۔ اے۔ نارائن نے ۲۵/ ستمبر ۱۹۲۵ء کو وارنٹ جاری کیے تھے، جن کے تحت صوبے کے مختلف شہروں میں ابتداء میں ۳۷ گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں اور خانہ تلاشیاں لی گئی تھیں۔ ان میں سے ۱۳ افراد کو تو پولیس نے ابتدائی کارروائی میں اطمینان کر دو ماہ کے بعد چھوڑ دیا تھا اور جن کا چالان پیش کیا تھا، ان میں سے بعض کو عدالت نے بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ تمام گرفتار ہونے والوں کے ناموں کا پتا نہیں چل سکا۔ لیکن مختلف حوالوں سے بنائی ہوئی ایک فہرست یہ ہے :

۱- رام پرشاد بسمل، شاہ جہاں پور

۲- بھوپندر ناتھ، کرنل گنج الٰہ آباد، طالب علم فورتھ ایئر الٰہ آباد یونیورسٹی

۳- جوگیش چندر چٹرجی

۴- راجندر لاہڑی

۵- ستیندر ناتھ سانیال

۶- بنواری لال (اقبالی مجرم)

۷- بنارسی لال (سرکاری گواہ)

۸- اندر بھوشن مترا (سرکاری گواہ)
۹- ہربال سندر لال
۱۰- بھیرون سنگھ
۱۱- ستیلا سہائے
۱۲- موہن لال
۱۳- گوتم رام دت شکلا
۱۴- پریم کشن ولد شیو لال کھتری (بدایوں)
۱۵- چندر بھان
۱۶- مدن لال
۱۷- راج کمار سنہا، ساکن کانپور۔ طالب علم بنارس ہندو یونیورسٹی
۱۸- دامودر سروپ، سیٹھ
۱۹- من متھا (من موہن) ناتھ گپتا (ولد بابو بشیشر ناتھ گپتا بنارس۔ طالب علم کاشی ودیاپیٹھ
۲۰- بامسید لو جاہا طالب علم کاشی ودیاپیٹھ
۲۱- کالی داس بوس
۲۲- وشنو سرن ولیس ساکن میرٹھ ولیس یتیم خانہ میرٹھ کا سپرنٹنڈنٹ
۲۳- رام سرن کھتری
۲۴- پریم کشن کھنا، شاہ جہاں پور
۲۵- سچن بسواس
۲۶- سریس چندر بھٹاچارجی، ساکن کانپور
۲۷- رام دلارے
۲۸- بیر بھدر تواری
۲۹- ہر گووند، شاہ جہاں پور
۳۰- جی۔ سی۔ کار
۳۱- رام ناتھ پانڈے

۳۲- روشن سنگھ بمرولی ضلع پیلی بھیت کے ڈاکے کا ملزم

۳۳- جیوتی شنکر ڈکشت

۳۴- اشفاق اللہ خاں، شاہ جہاں پور۔ ترک موالات کے سزایافتہ۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں دہلی سے گرفتار ہوئے۔

۳۵- ایس۔ این۔ بخشی (سچیندر ناتھ بخشی) ۲۴ر جنوری ۱۹۲۷ء کو گاندھی آشرم بھاگلپور سے گرفتار ہوئے۔

۳۶- چندر شیکھر آزاد

۳۷- پی کے چٹرجی (پرتوش کمار چٹرجی) ولد راجندر ناتھ چٹرجی۔ بنگالی برہمن ساکن جبل پور۔

۳۸- ڈی۔ این۔ چودھری

۳۹- جادو ناتھ سین

۴۰- مکندی لال، ساکن اٹاوہ

۴۱- سندر موہن ملک، بنارس ہندو یونیورسٹی۔ (انجنیرنگ کے طالب علم)

۴۲- بی کے بسواس

۴۳- بسواناتھ

۴۴- رام کشن کھتری

مفرور ملزمین:

جب استغاثہ مرتب کیا گیا تھا تو ذیل کے افراد مفرور تھے اور پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تھے:

(۱) اشفاق اللہ خاں (۲) سچیندر ناتھ بخشی

(۳) بی۔ کے۔ بسواس (۴) بسواناتھ

(۵) بھوپندر ناتھ سانیال (۶) روشن سنگھ

اوائل دسمبر ۱۹۲۵ء تک جو گرفتاریاں ہوئی تھیں، ان میں سے مختلف رہائیوں کے بعد ملزمان کی تعداد ۲۴ رہ گئی تھی۔ اوپر کے ۶ افراد اس کے بعد گرفتار ہوئے تھے۔

اقبالی مجرم :

(۱) اندر بھوشن مترا (ملزم نمبر ۱۶)، (۲) بنارسی لال (ملزم نمبر ۲۷) اور (۳) بنواری لال اقبالی مجرم تھے۔ یہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ انھوں نے اقبال جرم کر لیا اور سرکاری گواہ بن گئے۔ ان کے حالات اور رویّے کے لیے دیکھیے : روزنامہ 'ہمدرد' دہلی، ۲۳/ دسمبر و ۲۴/ دسمبر ۱۹۲۵ء، روزنامہ 'عصر جدید' کلکتہ، ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۵ء، روزنامہ 'ہمدرد' دہلی، ۱۱/ جنوری و ۱۵/ فروری ۱۹۲۶ء، روزنامہ 'ہمدرد' دہلی، ۲۵/ مارچ و ۸/ ستمبر ۱۹۲۶ء۔

ضمانت و مچلکہ پر رہائی پانے والے :

جن ملزمان کا پولیس نے عدالت میں چالان پیش کیا تھا۔ ان میں سے ۱۱ کی ضمانت اور مچلکوں پر رہائی ہو گئی تھی۔ ان کی فہرست یہ ہے۔ دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

(۱) ہرنام (ہرنال) سندر سنگھ۔ تین ہزار روپے کی ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۱۵/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۵۔

(۲) بھیروں سنگھ۔ تین ہزار روپے کی ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۱۵/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۵۔

(۳) ستیلا سہائے (صوبہ متحدہ کانگریس کمیٹی کے سابق سکریٹری)۔ ایک ہزار روپے ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴۔

(۴) موہن لال۔ ایک ہزار روپے ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴۔

(۵) گوتم رام دت شکلا۔ ایک ہزار روپے ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴۔

(۶) چندر بھان۔ ایک ہزار روپے ضمانت اور مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴۔

(۷) مدن لال۔ بلا ضمانت و مچلکہ۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴۔

(۸، ۹، ۱۰) کالی داس بوس (+ ۲ نامعلوم الاسم)۔ ہمدرد۔ دہلی، ۹/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵۔

(۱۱) دامودر سروپ، سیٹھ۔ ضمانت پر رِہا ہوئے۔ ہمدرد۔ دہلی، ۲۱/ فروری ۱۹۲۶ء، ص۶۔

گواہ اور ثبوت :

کاکوری ڈکیتی وسازش کے اس مقدمے میں استغاثے کی جانب سے تقریباً ڈھائی سو گواہ اور ایک ہزار ایک سو ثبوت پیش کیے گئے تھے۔

(الف) استغاثے کے گواہ : (ہمدرد۔ دہلی، ۷/ اپریل ۱۹۲۷ء)

اس کیس کی مختلف تاریخوں میں جو گواہ پیش ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں :

(۱) ۱۰/ فروری ۱۹۲۶ء کو پیش ہونے والے گواہ :

۱- ڈاکٹر درگا پال (شاہ جہاں پور)

۲- اصغر علی خاں (شاہ جہاں پور)

۳- سید مرتضےٰ حسین (کان پور)

۴- سردار... سنگھ۔ اورسیر (شاہ جہاں پور)

۵- چندن سنگھ۔ سب انسپکٹر پولیس (کان پور)

۶- چودھری اشفاق حسین۔ سب انسپکٹر انچارج تھانہ (حضرت گنج لکھنؤ)

(۲) ۱۱/ فروری ۱۹۲۶ء کو پیش ہونے والے گواہ :

۱- بھولاناتھ

۲- چھید سنگھ۔ کانسٹبل چارباغ پولیس اسٹیشن لکھنؤ

۳- شیو بخش سنگھ " " "

۴- حشمت علی " " "

(۳) ۲۱/ فروری سے قبل کسی تاریخ کو پیش ہونے والے گواہ :

۱- پربھودیال۔ ملازم پنجاب نیشنل بنک

۲- شنکر سہائے۔ سناتن دھرم کالج

(۴) ۲۵/ مارچ کو پیش ہونے والے گواہ :

☆ گواہ نمبر ۷ اور ۹ نے اشفاق اللہ خاں کے خلاف گواہی دی تھی۔

۱- جگناتھ پرشاد۔ انسپکٹر پولیس
۲- لالہ تواری۔ سب انسپکٹر، سی۔ آئی۔ ڈی۔ الہ آباد
۳- جوالا پرشاد دوبے۔ انسپکٹر سینٹری آگرہ
۴- عبدالشکور۔ ڈپٹی جیلر، لکھنؤ
۵- جگناتھ ۔ مدرس چرچ مشن ہائی اسکول
۶- عبدالودود۔ آئس ونڈر
۷- مہاراج سنگھ (ساکن محلہ کٹیاٹولہ شاہ جہاں پور)
۸- مسٹر اسٹاٹ۔ اسٹنٹ گورنمنٹ...... (ماہر خط)

(۵) ۲۸ / مارچ ۱۹۲۶ء کو پیش ہونے والے گواہ :

۱- خان بہادر مولوی وحید بخش، چیئرمین میونسپل بورڈ بدایوں ۲- شب چرن
۳- بابو سریندر ناتھ مکرجی، سب انسپکٹر شعبۂ خبر رسانی، الہ آباد ۴- کلن خاں
۵- پی۔ سی۔ بسواس، تاجر اسلحہ مالک میسرز بسواس کمپنی، کانپور ۶- روپ نرائن
۷- وضاحت حسین خاں☆، سب انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور ۸- ویدمو
۹- رگھبیر دیال☆، سب انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور ۱۰- جگناتھ گارڈ
۱۱- چودھری اشفاق حسین، حضرت گنج پولیس، لکھنؤ ۱۲- ستیلا باسی
۱۳- مسٹر آسٹن، خفیہ پولیس الہ آباد ۱۴- کلو چمار
۱۵- برہما سنگھ، انسپکٹر پولیس ۱۶- جیوتی کورمی
۱۷- بھیرا سنگھ، پولیس والا ۱۸- شانتی کورمی

(ب) صفائی کے گواہ :

۲۳/ جنوری ۱۹۲۷ء کو ذیل کے گواہ ملزمان کی طرف سے ان کے خلاف الزامات کی صفائی میں پیش ہوئے تھے۔ یقین ہے کہ ان کی تعداد بھی ۹ سے زیادہ ہو گی۔ لیکن پتا انھی کی چلا سکا ہوں۔

۱- رام غلام بنیا، بمرولی ضلع پیلی بھیت
۲- گنگا پرشاد برہمن " "
۳- گجراج سنگھ " "

۴- این۔ آر۔ وہا، لندن و پیرس کی یونیورسٹیوں کے ڈاکٹر آف سائنس

۵- للت موہن مکرجی
۶- سچیندر ناتھ چکرورتی

] الٰہ آباد یونیورسٹی کے چہارم اور پنجم درجوں کے طالب علم۔

۷- دیبی پرشاد
۸- نرائن لال

] رام سرن کھتری کی صفائی میں بیانات دیے۔

۹- موہن لال کھتری، رام سرن کھتری کی صفائی میں بیان دیا۔

(ج) چند مزید سرکاری گواہ :

۱- بنارسی لال (مجرم نمبر ۲۷)۔ ۱۵/ فروری کی کارروائی مقدمہ میں اس کا تعارف ہے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۲۳/ دسمبر و ۲۴/ دسمبر ۱۹۲۵ء و عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۵ء)

۲- اندر بھوشن مشرا (مجرم نمبر ۱۶) بنگالی، ساکن شاہ جہاں پور۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کا طالب علم۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۲۳/ دسمبر و ۲۴/ دسمبر ۱۹۲۵ء و عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۵ء)

۳- بنواری لال (۲۲/ مارچ کی کارروائی میں اقبالی بیان واپس لینے کا ارادہ ہے)۔
(ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/ مارچ ۱۹۲۶ء)
اقبالی بیان دے دیا۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/ مارچ ۱۹۲۶ء)
اقبال جرم کر لیا۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۸/ ستمبر ۱۹۲۶ء)

ملزمان اور ان کی سزائیں :

کاکوری کیس میں صرف دس افراد نے حصہ لیا تھا۔ لیکن پولیس کا کردار یہ تھا کہ اس اٹھارہ افراد کو مجرم ثابت کر دیا۔ عدالت نے انھیں سزائیں دے دیں اور پولیس کی کارگزاری کی تحسین بھی فرمادی۔ البتہ اس کیس کے سلسلے میں اندھا دھند گرفتاریوں میں چند وہ لوگ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے جو بچپوری اور بمرولی (ضلع پیلی بھیت) کے کیسوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ پولیس نے کاکوری کیس میں ان کی شمولیت ثابت کر دی۔ ان کے مطلقاً مجرم ہونے سے تو ہم انکار نہیں کر سکتے لیکن پولیس کا کارنامہ داد و تحسین سے بہت بلند ہے۔

اس مقدمے میں سزایافتگان کے نام اور ان کی سزائیں یہ ہیں :

۱- پنڈت رام پرشاد بسمل	سزائے موت
۲- راجندر لاہڑی	سزائے موت
۳- روشن سنگھ	سزائے موت
۴- سچیندر ناتھ سانیال	عمر قید
۵- من متھ (من موہن) ناتھ گپتا	چودہ سال قید
۶- گوبند چرن کمار	دس سال قید
۷- مکندی لال	دس سال قید
۸- جوگیش چندر چٹرجی	دس سال قید
۹- راج کمار سنہا	دس سال قید
۱۰- رام کشن کھتری	دس سال قید
۱۱- سریش بھٹاچاریہ	سات سال قید
۱۲- وشنو شرن ولیس	سات سال قید
۱۳- پریم کشن کھنا	پانچ سال قید
۱۴- پورن دیش چٹرجی	پانچ سال قید
۱۵- رام دلارے	پانچ سال قید
۱۶- رام ناتھ	پانچ سال قید
۱۷- بنواری لال	پانچ سال قید
۱۸- بھوپندر سانیال	پانچ سال قید

اپیل اور ان کی سماعت :

(الف) سانیال برادران اور بنواری لال کے سوا تمام ملزمان نے سزاؤں کے خلاف چیف کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔

(ب) چیف جج و جسٹس سر لوئس شرٹ اور سید محمد رضا نے اپیل کی سماعت کی۔

(ج) استغاثے کی جانب سے ذیل کے وکلا نے پیروی کی۔

۱- پنڈت جگت نرائن ملا

۲- مسٹر ایچ طامس، بیرسٹر
۳- خان بہادر خیرات نبی، افسر سی۔ آئی۔ ڈی

(د) ملزمان کی جانب سے ذیل کے وکلا نے اپیل کی پیروی کی۔

۱- ایل۔ ایس۔ مصر۔ رام پرشاد کی طرف سے گورنمنٹ کے مقرر کردہ وکیل
۲- ہرکرن ناتھ مصر نے دوسرے ملزموں کی طرف سے پیروی کی۔
۳- جان جیکس بیرسٹر لکھنؤ و مسٹر پاٹن بیرسٹر کلکتہ نے پریم کشن کھتری کی طرف سے وکالت کی۔
۴- پنڈت کپل دیو مالوی نے وشنو شرن ولیس کی اپیل کی پیروی کی۔

(روزنامہ ہمدرد۔ دہلی، ۲۰/جولائی ۱۹۲۷ء)

۵- اشفاق اللہ خاں کی جانب سے پریوی کونسل میں اپیل پیش کی گئی۔ اس سے قبل سیشن کے فیصلہ کے خلاف چیف کورٹ نے ان کی اپیل کو مسترد کر دیا تھا۔ اپیل کی پیروی مسٹر کرپا شنکر ہجیلا ایڈوکیٹ نے کی تھی۔ پریوی کونسل میں بھیجی جانے والی درخواست بھی مسترد ہو گئی۔

(روزنامہ ہمدرد۔ دہلی، ۱۳/اکتوبر ۱۹۲۷ء)

میڈیکل بورڈ :

سیٹھ دامودر سروپ کے معائنے کے لیے اور اس امر کا سُراغ لگانے کے لیے کہ آیا وہ واقعی بیمار ہیں؟ ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا تھا جو ذیل کے ارکان پر مشتمل تھا :

۱- ڈاکٹر کرنل ہنٹر : سول سرجن لکھنؤ
۲- ڈاکٹر بواٹیر : پروفیسر سرجری کنگ جارج میڈیکل کالج، لکھنؤ
۳- میجر سلامت اللہ : سپرنٹنڈنٹ جیل، لکھنؤ

(روزنامہ ہمدرد۔ دہلی، ۵/مئی ۱۹۲۶ء)

حصّہ اوّل

حیات و افکار

باب اول

اشفاق اللہ خاں

ابتدائی سوانح اور پس منظر کے حالات

اشفاق اللہ خاں شاہ جہاں پور کے ایک پٹھان خاندان میں ۲۲/اکتوبر ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیق اللہ خاں پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر تھے۔ اشفاق اللہ خاں کی سیرت کی تعمیر میں شاہ جہاں پور کے پٹھانوں کی بہترین تہذیبی اور اخلاقی روایات نے حصہ لیا تھا۔ وہ نہایت جری، بہادر اور بے باک نوجوان تھے۔ بات کے دھنی، وعدے کا پاس اور عہد کو نبھانے والے تھے۔ تواضع اور انکساری ان کی شخصیت کا خاص جوہر تھا۔ آزمائش میں پیچھے قدم نہ ہٹانے اور ایثار و قربانی کی کٹھنائیوں میں بے دھڑک کود پڑنے والے شخص تھے۔ وہ جرأت و ہمت کا پیکر، بے خوفی کا مجسمہ اور جاں بازی کی علامت تھے۔ وہ اپنے ظاہر کی شہامت کے ساتھ قوی جگر اور فراخ قلب کے مالک تھے۔ ان کا جسم کسرتی، گٹھا ہوا اور فولاد کی طرح مضبوط تھا، تو ان کا عزم پہاڑ کی طرح بلند اور چٹان کی طرح سخت تھا۔

سیرت اور شخصیت کی ان خوبیوں کے ساتھ وہ ایک سچے مسلمان، کھرے پٹھان، حقیقی وطن دوست اور واقعی قوم پرور تھے۔ اسلام کی صداقت پر انھیں پختہ یقین تھا، لیکن مذہبی تعصب کی تاریکی ان کے قلب کے کسی گوشے میں نہ تھی۔ فرقہ پرستی کی نجاست سے ان کا ضمیر پاک اور قلب آئینہ تھا۔

خاندان :

ان کے خاندان کے بزرگوں میں ننھیال کا شمار برٹش حکومت کے وفاشعاروں اور اطاعت گزاروں میں ہوتا تھا۔ ان کے ددھیال میں بھی قوم پرستی اور حریت نوازی کی کوئی روایت نظر نہیں آتی۔ ان کے والد کی زندگی انگریزی حکومت کی ملازمت میں گزری تھی۔

ان کے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ڈپٹی کلکٹر اور خان بہادر قسم کے لوگ ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ برٹش استعمار کے سخت ترین دشمن اور حکومت کے باغی کی حیثیت سے اس کے سیاسی نظام اور فوجی قوت کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قوم پروری اور وطن دوستی کی راہ بنانے میں ان کی اپنی انقلابی فکر، ان کی اپنی صائب رائے، راسخ عقیدے اور بلند ہمت کے سوا کوئی اور رہنما نہ تھا۔

شخصیت کی تعمیر:

ان کی انقلابی شخصیت کی تعمیر میں خاندان، ان کے ابتدائی ماحول اور گرد و پیش کا کوئی حصہ نہ تھا۔ کاکوری کے دلیرانہ معرکے میں وہ دیگر دس اہل ہمت میں تنہا مسلمان تھے۔ لیکن کمتری کے احساس سے ان کے ذہن وخیال کا ایک ریشہ بھی متاثر نہ تھا۔ ان کی روایتی تعلیم آٹھویں جماعت سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے ذہن کو بہترین دینی اور وقت کے اعلیٰ سیاسی اور انقلابی افکار سے آراستہ کیا تھا۔

یہ ان کی شخصیت کا وہ نقش ہے جو ان کی شخصیت، سیرت اور افکار کے مطالعے کے بعد لوحِ فکر ورائے پر مرتسم ہوا ہے۔ لیکن ہم کسی شخصیت کو اس کے خاندان، ماحول، اور گرد و پیش سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہر شخصیت اپنی فکر و سیرت کی اچھی یا بری تربیت اپنے خاندان، ماحول اور گرد و پیش سے ہی پاتی ہے۔ ہمیں اشفاق اللہ خاں کے انقلابِ فکر و حال کی جڑیں بھی ان کی ابتدائی ماحول ہی میں تلاش کرنی چاہئیں۔

مارشل اسپرٹ :

شاہ جہاں پور کے پٹھانوں کے گھروں میں اسلحہ ایک عام چیز سمجھا جاتا ہے۔ شاید لاٹھی کو اسلحہ میں شمار نہ کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت مؤثر اور مفید ہتھیار ہے۔ لاٹھی کا استعمال ایک فن ہے اور شاہ جہاں پور میں اس کے خاص ماہر اور استاد تھے۔ ''چھری گھرکا'' جو لاٹھی کے خاص فن ''بنوٹ'' کی تعلیم وتربیت ، ابتدائی درجہ ہے، اس کے اکھاڑے شہر کے ہر محلے اور ہر ٹولے میں قائم تھے۔ بڑے بوڑھے نوجوانوں کو اس فن کے سیکھنے کی طرف رغبت دلاتے تھے۔ اگر چہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہندو اور مسلمان نوجوان اس

فن کو سیکھتے تھے لیکن یہ فن مسلمانوں ہی کا سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ اس فن کا زوال آ گیا ہے، شاہ جہاں پور میں اب بھی اس فن کے خاص ماہر پائے جاتے ہیں۔ اس فن میں استاد عبد المجید خاں کا نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وہ دورِ آخر میں بنوٹ کے بڑے ماہر تھے اور اپنے اس کمال کی بنا پر ۴۷ء، ۴۸ء میں انھیں دار العلوم دیوبند میں شعبۂ ورزش کا نگراں مقرر کیا گیا تھا۔

تلوار پر لائسنس ہو جانے کے باوجود کسی غریب سے غریب پٹھان کا گھر بھی شاید ہی ایسا ہو جس میں ایک دو تلواریں نہ ہوں۔ جہاں تک بندوق کا تعلق ہے اس کے حصول کے لیے لائسنس اور اس کے لیے طرح طرح کی شرائط پر کسی کے لیے اور خصوصاً عام لوگوں کے لیے اس کا حصول دشوار بنا دیا تھا اور اسے امراء کا ہتھیار سمجھا جانے لگا تھا، اس کے باوجود شاہ جہاں پور کا شاید ہی کوئی شخص ہو جو آتشیں اسلحہ کے استعمال کے ذوق سے نا آشنا ہو۔

اشفاق اللہ خاں ایک سپاہی کے بیٹے تھے۔ ان کے والد پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر تھے۔ ان کے پاس بندوق کے علاوہ بھی کئی قسم کا اسلحہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اشفاق اللہ خاں کے بڑے بھائی کو بندوق کا لائسنس مل گیا تھا۔ اس لیے تیغ و تفنگ کا ذوق اشفاق اللہ خاں کی فطرت کا لازمی جز تھا۔ وہ اگرچہ ادیب و شاعر تھے لیکن فطری طور پر وہ ایک سپاہی اور انقلابی تھے۔ یہ ذوق ان کا پیدائشی تھا اور یہی ذوق ان کی آیندہ زندگی میں انقلاب و احتجاج کے رویے میں محرک و رہنما ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنے بچپن کے سپاہیانہ ذوق کی طرف خود بھی اشارہ کیا ہے۔ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں :

> "مجھے جب اپنے بچپن کی یاد آتی ہے اور اس زمانے کے واقعات جب ذہن میں آتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے۔ کیوں کہ بچپن ہی سے میں مارشل اسپرٹ لیے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ مجھے میلے سے اگر کسی چیز کے لانے کا شوق ہوتا تھا تو وہ ٹین کی تلوار ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے والد سے کہا : میاں! مجھے آپ ایک تلوار لا دیں! انھوں نے جواب دیا کہ بیٹا تم سے کوئی چھین لے گا، اس پر میں نے کہا : آپ چاندی کی تلوار نہ لائیں، لوہے کی تلوار لا دیں، اسے کوئی نہ چھینے گا۔ اس بات پر میری والدہ اور والد بے تحاشا ہنسنے لگے اور کہا : اچھا! وہ جب تک زندہ رہے، میرا یہی تقاضا ان سے ہوتا رہا۔
>
> اس زمانے میں تلوار پر لائسنس تھا۔ مجھے اپنی زندگی کا یہ واقعہ

ہمیشہ یاد رہے گا۔ اور اس سوال و جواب سے لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کتنا بڑا تھا"۔

داستانوں کا شوق :

اشفاق اللہ خاں کی والدہ مظہر النساء ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ آج کل کے تعلیم یافتہ کے معنوں میں تو شاید انھیں تعلیم یافتہ نہ کہا جائے لیکن تعلیم کی جو غرض و غایت ہے، اس سے وہ پوری طرح بہرہ ور تھیں۔ انھیں صرف دینی کتابوں ہی کا شوق نہ تھا، بلکہ انھیں اسلامی تاریخ، بزرگوں کے قصوں کے ساتھ اخبار اور رسالے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اپنی والدہ ماجدہ کے ذوق و سیرت کے جس پہلو سے وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ ان کا یہی ذوق مطالعہ تھا۔ انھوں نے ابھی باقاعدہ طور پر مدرسے میں اردو کی تعلیم حاصل کرنا شروع بھی نہ کیا تھا کہ داستانوں کے شوق نے انھیں کتابوں میں سر کھپانے پر مجبور کر دیا۔ بزرگوں کے قصوں اور اسلامی تاریخ کے مطالعے کے شوق میں ان کی والدہ نے ان کی ہمت افزائی کی۔ جب انھیں کچھ شدبد حاصل ہوئی تو بڑی بڑی داستانوں کو ذوق و شوق سے پڑھنے لگے۔ خاندان نے ان کے سمندِ شوق کو مہمیز لگائی۔ وہ جلدی جلدی گھر کے کاموں سے فارغ ہو جاتیں اور اشفاق اللہ انھیں داستانیں پڑھ کر سناتے۔

گھر میں ان کی پرورش آزادانہ ہوئی تھی۔ گھر میں ان کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ والد ماجد کا انتقال چوں کہ کم عمری میں ہو گیا تھا اس لیے والدہ نے اس بات کا خیال رکھا کہ انھیں کسی وقت یتیمی کا احساس نہ ہو اور ان کے قلب پر کسی معاملے میں فکر و تردّد کی پرچھائیں نہ پڑے۔ آزادی اور بے فکری کے اس ماحول میں داستانوں کے مطالعے سے ان کے اندر شروع ہی سے بلند ہمّتی، مہم جوئی، حق گوئی، صداقت شعاری، مشکلات میں ثابت قدمی، مصائب و ابتلا میں صبر واستقامت کی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ بدی سے نفرت، مظلوموں سے محبت و ہمدردی، بے کسوں اور ناداروں کی دستگیری کے اعلیٰ جذبات ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ مصائب جھیلنے اور مشکلات کے مردانہ وار مقابلے کو وہ مصیبتوں اور مشکلوں کا حل سمجھتے تھے۔ باطل کے دیوؤں کے مقابلے میں نیکی اور سچائی کی پریوں کے نمودار ہونے اور بہر صورت حق کی فتح و نصرت پر ان کا یقین غیر متزلزل تھا۔

اس زمانے میں ان کی عمر ۱۳، ۱۴ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے فوراً بعد جنگ عظیم کا دور آجاتا ہے۔ جنگ میں انگریزوں کی شرکت کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی فضا خاص طور پر متاثر ہوئی لیکن جب ۱۹۱۴ء کے آخر میں ترکی بھی جنگ کا ایک فریق بن گیا تو گویا یہ مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کے اپنے جسم و جان کا مسئلہ بن گیا۔ مسلمانوں میں اتحاد اسلامی نے ایک عالمگیر تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اشفاق اللہ خاں کے گھر میں چوں کہ ان کی والدہ نے اخبار جاری کرالیا تھا، اس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف ایک نفرت کی فضا پروان چڑھنے لگی تھی، اس ماحول میں اشفاق اللہ خاں نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جب انور بے اور شکری پاشا اٹلی کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑتے ہیں تو مشرق سے مغرب تک مسلمانوں میں اتحاد واخوت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، بھولا ہوا سبق یاد آجاتا ہے اور کھوئی ہوئی منزل دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''پروپیگنڈا ہوتا ہے، اس کا اثر مسلمان نوجوانوں پر پڑتا ہے۔ اٹلی کا حال بھلا دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف شورش پیدا ہو جاتی ہے۔ ترکی خواتین کی حب الوطنی، نوجوان ترکوں کی سرفروشیاں اور طلبہ کی قربانیاں ایک نئی اسپرٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ میری والدہ اخبار کی مستقل خریدار بن جاتی ہیں اور اس طرح میں بھی اخبار پڑھنے لگا''۔

خودنوشت میں انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> ''پھر ایک زمانہ جلد وہ آگیا کہ ترکوں اور عیسائیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگوں کو پروپیگنڈے کا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ ادھر میری بھی دبی ہوئی آگ دہکنے لگی اور تعلیم کی طرف سے لاپروائی! کیوں کہ انگریزی ہمارے دشمنوں کی زبان تھی۔ اخبار بینی اپنا شعار ہو گیا۔ کتابیں لے کر اسکول تو جاتے تھے، مگر بے توجہی کے ساتھ''۔

ان حالات اور اخبار بینی کے نتیجے میں، اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں کہ انھیں انگریزوں سے نفرت پیدا ہو گئی اور وہ سمجھنے لگے کہ یہی بانئ فساد ہیں۔ اس لیے ان کی حکومت نیست و نابود ہو جانی چاہیے اور یہ اس طرح ہو کہ افغانستانی یا ترک لوگ حملہ کر دیں اور ہم بغاوت

کریں اوراس طرح انگریزوں کی حکومت درہم برہم ہو جائے۔

اشفاق اللہ خاں کے ذہن میں یہ بات از خود نہ آگئی ہو گی، بلکہ اس وقت انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستان پر بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت پیدا کرنے کا بہترین موقع سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء کے آغاز میں بہت سے مسلمان نوجوانوں نے اسی غرض سے افغانستان ہجرت کی تھی۔ مولوی محمد علی قصوری اور شیخ محمد ابراہیم سندھی کو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے مشورے سے اسی لیے کابل بھیجا اور حبیبیہ کالج (کابل) میں ملازم رکھوایا گیا تھا اور بعد میں اسی سال کے وسط میں مولانا عبید اللہ سندھی اسی قسم کا ایک منصوبہ لے کر افغانستان گئے تھے۔ اس کے بعد اسی سال کے آخر میں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا نے اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے ترکی و افغانستان پہنچنے کے لیے حجاز کا سفر کیا تھا۔ کابل میں راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کا ہندوستان کی عارضی حکومت قائم کرنا اور مولانا سندھی کا نجات دہند فوج (جنود ربانیہ) کا تشکیل دینا اسی منصوبے کی کڑیاں تھیں اور یہ سب اسی اندازِ فکر کی نشاندہی کرتی تھیں۔

غرضے کہ والدہ کی صحبت، مطالعے میں ان کی رہنمائی، داستانوں کا شوق، اخبار بینی سے دلچسپی، اتحاد اسلامی کے جذبات، ترکی خواتین کی حب الوطنی، ترکی کے نوجوانوں کی سرفروشیاں اور طلبہ کی قربانیاں ان کی سیرت کی تعمیر کا بنیادی پتھر ثابت ہوئیں۔

وائسرائے پر حملہ :

اس زمانے میں ایک اور واقعے نے ان کے قلب کو متاثر کیا۔ یہ دہلی میں وائسرائے کی سواری پر ایک انقلابی کے بم مارنے کا واقعہ تھا۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

> "ایک دن میں اسکول جارہا تھا کہ یکایک سنا کہ دہلی میں وائسرائے صاحب بہادر پر کسی نے بم ماردیا اور اسکول بند ہو گیا۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ چلو ایک پنتھ دو کاج! چھٹی بھی ملی اور ایک نیا واقعہ بھی ظہور میں آگیا"۔

مین پوری کیس :

ابھی تک انھیں واضح طور پر قوم پروری اور وطن دوستی کا کوئی سبق نہ ملا تھا۔ یہ

سبق انھیں اس وقت ملا جب وہ شاہ جہاں پور کے مشن اسکول میں ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اسی زمانے میں مین پوری ڈکیتی کا واقعہ رونما ہوا تھا۔ یہ ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے۔ ایک روز ان کے اسکول کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ معلوم ہوا کہ ڈکیتی کے واقعے کے ایک شریک و مجرم کی تلاش ہو گی۔ اشفاق اللہ اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

"اسکول پر عجیب دہشت اور خوف چھایا ہوا تھا اور ہر لڑکا اپنی جان کی خیر منا رہا تھا۔ میں اس روز ذرا دیر سے گیا تھا۔ کوئی لڑکا اندر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ہر درجے میں شناخت ہو رہی تھی۔ میں بھی اپنے درجے میں خاموشی سے جا بیٹھا۔ مگر نفس معاملہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ کیوں کہ میں اسکول کا ایک ہاکی کھیلنے والا اور آزاد طالب علم تھا۔ ماسٹر صاحب سے پوچھنے کو جھکا مگر ماسٹر صاحب بتانے سے ڈرے کہ یکایک ایک لڑکے نے کہا کہ راجہ رام نے کہیں ڈاکہ مارا ہے اور وہ گرفتار کر لیے گئے ہیں اور بھی لڑکے گرفتار ہوئے ہیں۔ اب مجھے راجہ رام کی فکر ہوئی کہ یہ لڑکا کون ہے۔ کیوں کہ راجہ رام ایک سیدھا سادا اور خاموش سا لڑکا تھا۔ اسکول کے اکثر طلبہ اس سے واقف بھی نہ تھے۔ میری اس کی ملاقات جب اس کی رہائی کے بعد ہوئی تو مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا بھولا بھالا لڑکا بھی ریولیوشنری ہو سکتا ہے"۔

حب الوطنی کا پہلا سبق :

اس کے بعد اشفاق اللہ خاں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ راجہ رام نہ ڈاکو ہے نہ قاتل! بلکہ وہ ایک خفیہ سوسائٹی کا ممبر ہے جو انگریزوں کے خلاف اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ہم اس واقفیت اور تعارف کو اشفاق اللہ خاں کی سیاسی زندگی کا پہلا باقاعدہ سبق قرار دے سکتے ہیں۔ اس وقت جب کہ اسکول میں خوف اور دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی، شہر میں چھاپے پڑ رہے تھے، گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور ہر طرف ہراس پھیلا ہوا تھا، اشفاق اللہ خاں کے لیے لطف اور مسرت کے دن تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"عجیب لطف اور خوف کے دن تھے۔ لطف تو ایسی طبیعتوں کے

لیے تھا جو ہمیشہ نئی چیز چاہتی ہیں۔ اور خوف کے دن ان کے لیے جو ذرا سی بات پر اختلاج قلب محسوس کرتے ہیں اور اسی پرانے رویئے کو پسند کرتے ہیں خواہ ترقی میں ہوں خواہ تنزلی میں"۔

مین پوری کیس کے ماخوذین کے قوم پرستانہ کردار اور ان کی حریت پسندانہ سیرت سے اشفاق اللہ خاں بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسے لوگوں کا شمار قومی معماروں میں ہونا چاہیے تھا۔ اور اگرچہ انھوں نے اِن طلبہ کے حکومت سے ٹکرانے کو لڑکوں کا کھیل کہا ہے۔ لیکن ان کی ہمت، اولوالعزمی، ان کی حب الوطنی اور ان کے پاک جذبات کی تحسین کی ہے اور اس شخص کو جس کی مخبری کی وجہ سے وہ گرفتار ہوئے تھے عاقبت نااندیش قرار دیا ہے۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

"اس سے ملک والوں کو معلوم ہوا کہ لڑکے بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گو کہ یہ لڑکوں ہی کا ایک کھیل تھا۔ کیوں کہ بے سلسلہ و بے تعلق اسکول اور کالج کے طلبہ حکومتِ برطانیہ کو ٹوپی دار بندوقوں یا بم کے گولوں سے ہندوستان سے نہ ہٹا سکتے تھے۔ مگر نوجوان خون چوں کہ گرم ہوتا ہے، اس لیے ہر مشکل کام آسان معلوم ہوتا ہے۔ یوں ان لوگوں کا دماغ بھی چکرا گیا تھا۔ میں ان کے جذبات، ان کی حب الوطنی ان کے ایثار کا دل سے قائل ہوں۔ مگر ان پاک جذبات کا خون کسی ناعاقبت اندیش کے ہاتھ سے ہو گیا تھا۔ اگر ایسے نوجوان کسی آزاد ملک میں ہوتے تو میں بغیر کسی رُکاوٹ کے کہوں گا کہ انکا نام "نیشنل بلڈرز" کی فہرست میں شامل ہوتا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ موت کا مقابلہ کرنے اور مذبح میں اپنے آپ کو کاٹے جانے کے لیے کوئی شخص اپنے آپ کو خوشی سے پیش کردے"۔

اشفاق اللہ خاں نے ان ناتجربہ کار نوجوانوں کے کارنامے کو خربوزے سے خربوزے کے رنگ پکڑنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔ گویا کہ طلبہ کے اس عمل سے دوسرے طلبہ نے اثر قبول کیا اور خود اشفاق اللہ خاں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ خود بھی اس سے متاثر ہوئے اور طلبہ کے اس کارنامے سے ان کے شوق خدمت وطن اور جوش و جذبات نے رنگ پکڑا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "مین پوری سازش کیس کے بعد میری حالت بدل گئی"۔

حب الوطنی کا دوسرا سبق :

یہ واقعہ تو اس وقت کا تھا جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں آئے تو اسکاٹ کی انگریزی نظم "وطن کی محبت" اور ایک دوسرے شاعر کی نظم "ہوریشر کا قصہ" نے ان کے قومی اور وطنی جذبات کو نہ صرف انگیخت کیا بلکہ پختہ و مستحکم کر دیا۔ بہ قول اشفاق اللہ خاں کے اس سبق کو پڑھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ لکھتے ہیں :

> "غرضے کہ مین پوری سازش کیس کے بعد میری حالت بدل گئی اور جب میں آٹھویں کلاس میں پاس ہو کر آیا تو انگلش کے کورس کی کتاب میں دو سبق تھے، جن سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ایک تو Love of Country (وطن کی محبت) سر وائر اسکاٹ کی لکھی ہوئی نظم تھی۔ اور دوسرا سبق، جس میں ہوریشر کا قصہ تھا۔ جس میں اس نے اسپیچ دی تھی۔ جب کہ غنیم نے ملک پر چڑھائی کی تھی۔ اس نے کہا تھا اگر پل توڑ دیا جائے تو ٹائیور ندی کو پار کر کے فوج نہیں آسکتی اور نہ کوئی راستہ ہے۔ میں جاتا ہوں اور اس تنگ راستے میں مع اپنے تین ساتھیوں کے "کھڑے ہو کر لڑوں گا" اور ادھر پل توڑ کر ندی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور روم بچ گیا"۔

اشفاق اللہ خاں نے اس نظم کے ساتھ اپنے استاد کے انداز تدریس کی تحسین بھی کی ہے۔ اس کے بعد ان کے مطالعے میں بہت سی کتابیں آئیں۔ لیکن وطن کی محبت کا جو نقش اس نظم اور استاد کے اندازِ تدریس سے لوحِ قلب پر اُجاگر ہوا تھا، اس کی روشنی اور تابانی کبھی ماند نہ پڑی۔ وہ لکھتے ہیں :

> "میرے ماسٹر نے کچھ ایسے طرز سے اس سبق کو پڑھایا کہ تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس سبق کا مندرجہ بالا واقعہ اب تک یاد ہے۔ میری وطنی محبت کی یاد صرف اسی سبق سے پڑی۔ اس کے بعد سیکڑوں کتابیں پڑھ لیں اور ہزاروں لیکچر سن ڈالے، مگر نہ معلوم وہ کون سی ساعت تھی جب اسکول میں یہ سبق ماسٹر صاحب نے پڑھایا تھا۔ میں اپنے آپ کو روک نہ سکا

اور خوب رویا۔ غرضے کہ مجھے حب الوطنی کے پلیٹ پر لانے والی اور وطن کی آگ بھڑکانے والی سب سے اوّل یہی نظم اور یہی سبق تھا"۔

ایک اور تازیانہ :

آٹھویں جماعت میں پہنچ کر وہ ایک قوم پرور اور محبّ وطن کی حیثیت سے طلبہ اور اساتذہ کے حلقوں میں معروف ہو گئے۔ سیاسی جلسوں، جلوسوں میں شرکت کرتے تھے اور غالبًا انھی نئی مصروفیات کی وجہ سے وہ ۱۹۲۱ء تک میٹرک نہ کر سکے تھے۔ اگرچہ اسکول سے ان کا تعلق قائم تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب انھوں نے ترک موالات سے متاثر ہو کر اسکول کو خیر باد کہا تو وہ دسویں جماعت میں تھے۔ اسی دوران ان کے ایک دوسرے استاد نے ان کے رجحان طبع اور سیاسی ذوق کو دیکھ کر انھیں انگریزی کی ایک کتاب "دنیا کے محبانِ وطن" دی کہ تم اس تحفے کے اہل ثابت ہوئے ہو۔ اس کتاب کے مطالعے سے ان کے سیاسی خیالات میں اور زیادہ پختگی پیدا ہوئی۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

> "اس کے بعد میرے ایک اور ماسٹر صاحب نے مجھے ایک کتاب دی اور کہا تم کو یہ بالکل دیتا ہوں، کیوں کہ تم اس کے اہل ثابت ہوئے ہو۔ اس کتاب کا نام تھا "Patriots of the world" (دنیا کے محبانِ وطن)۔ میں نے کتاب کو پڑھا اور یہ تاثر قائم ہوا کہ جو وطن پر مر مٹا اس نے زندگیِ جاوید پائی"۔

یہ بنیادی سبق اور واقعات تھے جنھوں نے اشفاق اللہ خاں کی سیاسی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیا اور وطن دوستی اور قوم پروری کی طرف ان کے فکر کو موڑا اور اندازِ فکر کو پختہ کر دیا۔

بنارسی لال :

اس زمانے میں ان کا تعارف بنارسی لال سے ہوا جو ایک انقلابی اور قوم پرور شخصیت تھے اور ان کے ذریعے مین پوری سازش کیس کی ایک شخصیت راجہ رام اور رام پرشاد بسمل سے واقفیت ہوئی۔ بسمل ایک سیکولر قوم پرور، وطن دوست، انقلابی، کاکوری کیس کے لیڈر اور کھلے دل کے مالک تھے۔ اس زمانے میں اشفاق اللہ خاں نے کھدر پہننا شروع کر دیا تھا اور سیاسی

جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"بنارسی لال مجھ کو اکثر ملا کرتے تھے۔ مجھے اس وقت تو کیا کئی برس تک پتا نہ چلا کہ یہ کون ہیں اور ان کی گزشتہ زندگی کیا ہے؟ ان حضرت نے رام پرشاد بسمل کا ذکر چھیڑا۔ راجہ رام بھارتی انھیں کے گھر پر رہتے تھے۔ مجھے یکایک یہ شک پیدا ہوا کہ یہ بھی مین پوری سازش کیس کے ممبر ہیں۔ لہٰذا اپنے سے زیادہ ملک کا بہی خواہ سمجھ کر میں اس کی عزت کرنے لگا۔ اس زمانے میں زیادہ بیٹھک انھی کے گھر ہوئی۔ میں جلسوں میں برابر شریک ہوتا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے۔ میں نے گاؤن پہننا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے مین پوری سازش کیس کے بارے میں جو کچھ راجہ رام سے سنا تھا، سنانا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو پکا دیش بھگت ثابت کر دیا"۔

ہجرت کی تحریک :

۱۹۲۰ء تک جب کہ ہجرت کی تحریک شروع ہوئی تھی، وہ انقلابی طریقۂ کار سے متاثر ہو چکے تھے، لیکن ابھی ان کے سامنے کوئی راہِ عمل واضح نہیں ہوئی تھی اور شاید اسی لیے انھوں نے افغانستان ہجرت کر جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن جب ایک صاحب نے، جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا، ہجرت سے باز رہنے، کسی انقلابی تحریک سے وابستہ ہونے اور ملک کے اندر رہ کر کام کرنے کا مشورہ دیا تو اشفاق اللہ خاں نے فوراً اُسے قبول کر لیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"ایک دن بنارسی لال نے مجھے ایک کتاب "آنند مت" سنائی۔ یہ کتاب ہندی میں تھی۔ میں اس وقت ہندی بہت کم جانتا تھا۔ پھر بنارسی لال نے مجھ سے کہا کہ خفیہ سوسائٹی ایسی ہی ہوتی ہے۔ بہ نسبت اس ہاہاکار (چیخ وپکار) کے سازش (یعنی انقلابی طریقۂ کار) کا قائل تو میں ان کے ملنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، جب کہ میں ہجرت کرنے والا تھا۔ لیکن ایک صاحب نے مجھے روک دیا اور کہا کہ تم ہندوستان میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم خفیہ سوسائٹی میں شامل ہو جاؤ اور میں بھی راضی ہو گیا۔ اس طرح میرے ریوولیوشنری بننے کی بنیاد پڑ گئی"۔

ان کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کانگریس کی پُر امن اور آئینی تحریک سیاسی سے متفق نہ تھے۔ ان کے نزدیک کانگریس کی تقریروں کے ذریعے انگریزوں سے حکومت چھین لینے کا منصوبہ بے حاصل اور ہاہاکار (محض چیخ و پکار) کے سوا کچھ نہ تھا۔ کانگریس کے طریقۂ کار سے بد ظنی میں شاید بنارسی لال کی صحبت کے اثر اور رائے کا بھی حصہ ہو۔ اس لیے کہ وہ ایک انقلابی تھے اور انقلابیوں کی طرح کانگریس کے وعدوں پر یقین نہ رکھتے تھے، بلکہ وہ کانگریس کے وعدوں کو ان کے بیوقوف بنانے کے عمل سے تعبیر کرتے تھے۔

رام پرشاد بسمل سے تعارف :

اشفاق اللہ خاں کے سامنے اس وقت تک ان کے سیاسی جذبات کے اظہار کے لیے کوئی موقع اور ان کی اولوالعزمیوں کے لیے کوئی سیاسی میدان نہ تھا۔ کسی انقلابی تحریک یا کسی خفیہ سوسائٹی سے واقف نہ تھے اور کانگریس کے طریقۂ کار سے بھی مطمئن نہ تھے۔ اس لیے وہ ہر دم بے چینی محسوس کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "بنارسی لال مجھے اکثر غمگین نظر آتے تھے اور یہ اثر دوستوں کے چھوٹ جانے کا تھا۔ علاوہ اس کے کانگریس والے جو کل مدد کا وعدہ کر چکے تھے، اپنے اپنے رستے لگ گئے تھے۔ بلکہ وہ بیوقوف بناتے تھے۔ ان باتوں کا اثر میرے اوپر یہ پڑا کہ میں ہر دم بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مگر کس سے کہوں؟ نہ کوئی ہم نشیں تھا، نہ کوئی رازدار اور غمگسار تھا کہ جس کے سامنے اپنے غم کی کہانی بیان کروں"۔

اس سے پہلے وہ ایک انقلابی کی حیثیت سے پنڈت رام پرشاد بسمل کا نہ صرف نام سن چکے تھے، بلکہ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں، ۱۹۲۰ء سے قبل ان سے ملاقات کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ان سے ایسی سرد مہری سے پیش آئے تھے کہ پھر ایک مدت تک ان سے ملاقات کا خیال ہی دل میں نہ لائے تھے۔ اب جب کہ چند برس میں ان کے خیالات میں پختگی پیدا ہو گئی تھی، بسمل سے ملنے کا ان کو خیال آیا۔ اس مرتبہ انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ بنارسی لال کے ذریعے ان سے ملا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"میں نے بنارسی لال سے کہا کہ مجھے رام پرشاد کے پاس لے چلو اوران سے انٹروڈیوز کرادو۔ گوکہ رام پرشاد میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو دواسکول میں رہ چکے تھے۔ رام پرشاد شروع سے خاص شخصیت رکھنے والے انسان تھے اور کسرتی اور ہوشیار طالب علم تھے اور عام طور پر مشہور بھی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ رام پرشاد سے ملوں، شاید وہاں دوامل جائے اور تسکینِ قلب کی کوئی صورت نکل آئے۔ غرضے کہ ایک دن کھنوت (دریا) کے کنارے ایک جلسہ ہوا۔ رام پرشاد نے اس میں ایک مختصر سا لیکچر دیا اور شروع میں یہ شعر پڑھا :

ہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہر شمشیر قاتل کی!

... (اس جلسے میں) میں نے بھی کچھ کہا تھا۔ غرضے کہ بنارسی لال نے ہم دونوں کا انٹروڈکشن کرادیا۔ گوکہ اس سے قبل بھی ایک دن میں رام پرشاد سے ملا تھا۔ مگر وہ اتنی سردمہری سے ملے تھے کہ مجھے بہت دکھ ہوا تھا، جس کی وہ معافی مانگ لیا کرتے تھے۔ غرضے کہ اب ہماری ملاقات پنڈت رام پرشاد سے ہوگئی"۔

شری سچیندر ناتھ بخشی کے ایک انٹرویو سے جو انھوں نے سشیل کمار کو دیا تھا، رام پرشاد بسمل سے تعارف و تعلقات کا زمانہ بھی متعین ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۱ء کے بعد کا ہے اور اس وقت اشفاق اللہ خاں ترک موالات سے متاثر ہو کر مشن اسکول کی زندگی کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ بخشی جی فرماتے ہیں :

"پنڈت رام پرشاد بسمل مین پوری سازش کیس کے بعد شاہ جہاں پور میں آباد ہوگئے تھے۔ اس وقت پولیس مین پوری سازش کیس کے سلسلے میں ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ اشفاق اللہ خاں ۱۹۲۱ء میں سول نافرمانی (ترک موالات) میں حصہ لینے کے باعث پڑھنا لکھنا چھوڑ چکے تھے۔ پنڈت رام پرشاد بسمل اس وقت انقلابی کے روپ میں جلوہ گر ہو کر مشہور ہو چکے تھے۔ اشفاق اللہ خاں نے ان سے میل جول بڑھایا اور انقلابی امور میں دلچسپی

لینے لگے"۔

مسلمان اور انقلابی تحریکات :

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کو جس طرح اپنے ظلم و ستم کا خاص نشانہ بنایا تھا اور مسلمانوں کو کچل کر جن معاشی، تعلیمی انحطاطات میں مبتلا کر دیا گیا تھا اور مسلمانوں کے قیام و بیداری کے نام سر سید احمد خاں کی سیاسی تحریک کا جس انداز میں پروپیگنڈا کیا گیا تھا اور سیاست سے علاحدگی اور انگریزی حکومت پر اعتماد اور اس سے وفاداری کا جو سبق دیا گیا تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک کی اکثریت مسلمانوں کے اجتماعی سیاسی جیسے خالص وطنی اور قومی نقطۂ نظر سے مطمئن نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان سنگ گراں ہیں۔ انقلابی تحریکات میں تو ان کی شمولیت کے تمام دروازے بند تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۶ء میں جب مولانا ابوالکلام نے انقلابی سیاست میں برادرانِ وطن کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنا چاہا تب بھی یہ رکاوٹ موجود تھی۔ چنانچہ ان کی اس دلچسپی کو شک و شبہ سے دیکھا گیا اور جب تک انھیں پوری طرح آزما کر اطمینان نہ کر لیا گیا، ان پر اعتماد نہیں کیا گیا اور نہ انھیں خفیہ سوسائٹی کا ممبر بنایا گیا۔ سچیندر ناتھ بخشی بیان کرتے ہیں :

> "۱۹۲۳ء میں جب وہ ہندوستان ری پبلک ایسوسی ایشن میں شریک ہوئے اور کھل کر کام کرنے لگے تو ابتدا میں انھوں نے (رام پرشاد بسمل نے) اشفاق اللہ خاں کو خوب آزمایا کہ یہ نوجوان پٹھان جو انقلابی جماعت میں آنا چاہتا ہے، کیسا رہے گا؟"

ایک قابل غور نکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۶-۱۹۰۵ء میں اپنے ساتھ پیش آنے والی جس صورت حال کا اپنی آپ بیتی (انڈیا وِنس فریڈم) میں ذکر کیا ہے اور ۲۲-۱۹۲۰ء میں اشفاق اللہ خاں کو جو مشکل پیش آئی تھی، بلاشبہ وہ ایک حقیقت تھی، جس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اس پر ہمیں اس انداز میں بھی غور کرنا چاہیے کہ آئینی حدود اور قانون کے دائرے میں کام کرنے والی جماعتیں ممبر شپ کی پیش کش کرتی ہیں، عام دعوت دیتی ہیں اور کوچہ و بازار میں نکل کر رکنیت سازی کی مہم چلاتی ہیں۔ جب کہ خفیہ تحریکوں اور انقلابی جماعتوں میں شمولیت کا راستہ

شک وشبہ سے شروع ہوتا ہے، آزمائشوں سے گزرتا ہے اور ہر طرح کے اطمینان واعتماد کے بعد ان میں داخلے کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہ شکوک وشبہات، رُکاوٹیں، آزمائشیں اور کامل اعتماد کے بعد ہی داخلے کا دروازہ کھلنا، کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے آزاد واشفاق کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ بلکہ ہر ہندو، سکھ وغیرہ کے لیے بھی ان میں شمولیت کا یہی طریقہ کار تھا۔

دورِ انتشار وفساد :

۲۲-۱۹۲۱ء کا دور اب تک گزر چکا تھا۔ اشفاق اللہ خاں اس وقت تک انقلابی تحریک میں اپنی جگہ بنا چکے ... ۔ ان پر مکمل اعتماد کیا جانے لگا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد چوں کہ تحریک خلافت دھیمی پڑ چکی تھی اور ترک موالات کا پروگرام بند ہو چکا تھا، اس لیے عملی مشغولیتوں کے مقابلے میں ذہنی اور دماغی قوا سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے ۲۱-۱۹۲۰ء میں عام تھے، اب عنقا ہو چکے تھے۔ اب اس کا انتشار عبرت کا نظارہ پیش کر رہا تھا، حکومت نے اتحاد کی اس قوت کو توڑنے کے لیے تبلیغ اور شدھی کی تحریکوں کو ہوا دی۔ اس سلسلے میں مشتاق احمد وجدی کے یہ قول — اور یہ کوئی واحد قول نہیں، بلکہ عام خیالات اور تاثرات یہی ہیں کہ خواجہ حسن نظامی اور سوامی شاردھانند نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ ان دونوں نے برٹش استعمار کے لیے خاص خدمات انجام دیں۔ وجدی صاحب نے اپنی آپ بیتی "ہنگاموں میں زندگی" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "کانگریس اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں تو کچھ دنوں ہندو اور مسلمانوں کی جے کے نعرے لگتے رہے۔ لیکن تحریکوں کے ختم ہوتے ہی خواجہ حسن نظامی نے تبلیغ کی تحریک شروع کی، جس کا مقصد ہندوؤں کو مسلمان کرنا تھا۔ سوامی شاردھانند نے شدھی تحریک چلائی، جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا اور ساتھ ہی تحریک سنگٹھن شروع ہوئی کہ ہندوؤں میں لڑنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ سنتے تھے کہ یہ تحریکیں انگریزی سرکار نے شروع کرائی تھیں تاکہ ہندو مسلم اتحاد فروغ نہ پا سکے"۔

خواجہ حسن مرحوم کی سیرت کا نقش پوری طرح اُجاگر نہیں ہو سکتا۔ جب تک وجدی صاحب کی یہ آپ بیتی پیش نظر نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں :

"خواجہ صاحب پاکستان کئی مرتبہ آئے۔ پہلی مرتبہ تشریف لائے تو فرمایا کہ مجھے امریکن سفیر سے ملنا ہے اور مترجم کی ضرورت ہے، تم ساتھ چلو! میں دفتر سے رخصت لے کر حاضر ہوا۔ اس دن گفتگو سے مجھے تعجب بھی ہوا اور بہت سے خیالات بھی بدل گئے۔ مختصراً، انھوں نے کہا کہ میں انگریزی سرکار کے لیے ہندوستان میں ہمیشہ پروپیگنڈا کرتا رہا ہوں اور سرکار برطانیہ کے لیے بہت سے کام کیے ہیں! آپ چاہیں تو میں امریکن گورنمنٹ کے لیے پاکستان یا ہندوستان میں پروپیگنڈے کے لیے موجود ہوں۔ سفیر صاحب سنتے رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس قسم کا کام میرے سپرد نہیں ہے"۔

شاہ جہاں پور کا فساد :

اس قسم کے کردار ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت سے تھے اور اگر انگریز دوستوں اور برٹش استعمار کے بہی خواہوں کی کبھی کوئی تاریخ لکھی جائے تو اس کے لیے بے حساب اور نہایت دلچسپ مواد دستیاب ہوگا۔

بہرحال تحریک خلافت اور ترک موالات کا زور ٹوٹتے ہی، یا صحیح تر یہ ہے کہ انھیں کا زور توڑنے کے لیے تبلیغ اور شدھی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اس کے نتیجے میں ملک کے مختلف مقامات پر ہندو مسلمان بلوے ہوئے اور شاہ جہاں پور بھی فسادات سے محفوظ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے آریہ سماج کے مندر پر حملہ کرنے کا نہ صرف پروگرام بنایا بلکہ ایک بڑا مجمع مندر کو تاراج کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ اس وقت اشفاق اللہ خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس مجمع کے سامنے سینہ سپر ہوگئے۔ مجمع میں کچھ لوگوں نے اشتعال دلا کر حملہ کرنے کا رادہ کیا تو اشفاق اللہ خاں نے پستول نکال لیا اور بلند آواز سے کہا :

"تم ایک مندر پر حملہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین مفادات کو نقصان پہنچا رہے ہو، تم ہندوؤں کے دشمن نہیں ہو، تم خود اپنے اور تمام مسلمانوں کے ساتھ غداری کر رہے ہو۔ تم غریب اور سادہ لوح مسلمانوں کو اشتعال دلا رہے ہو! اگر تم میں ہمت ہے تو

آگے آؤ!"

لیکن جن لوگوں نے مسلمانوں کو بہکایا تھا اور مندر پر حملہ کرانے کے لیے انھیں لائے تھے، ان میں سے ایک شخص بھی آگے نہ بڑھا۔ اب اشفاق اللہ خاں نے عام مسلمانوں کو مخاطب کیا اور ان سے کہا :

"مسلمانو! واپس جاؤ، بیوقوف مت بنو، جو لوگ تمھیں بہکا کر لائے ہیں، وہ تمھارے دوست نہیں ہیں۔ تم سیکڑوں برس سے ہندوستان میں ایک ساتھ رہتے آئے ہو۔ اب بھی تمھارا فائدہ اسی میں ہے کہ آپس میں بھائیوں کی طرح مل جل کر امن اور آشتی کے ساتھ رہو"۔

اشفاق اللہ خاں کی مختصر مگر پُر زور تقریر نے مجمع پر سحر کر دیا اور ذرا دیر میں سارا مجمع چھٹ گیا اور ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔ لیکن اشفاق اللہ خاں اسی پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترک جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا اور ان کی کوششوں اور قابل تحسین مساعی سے یہ جلوس نکالا گیا، جس نے ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کا گشت کیا اور ایک متحدہ جلسے میں شاہ جہاں پور کے ہندو اور مسلمان زعمانے تقریریں کیں اور اس بات کا عہد کیا کہ وہ اپنے اثرات کو کام میں لائیں گے اور ہندو مسلم بلوے کی آگ سے شہر کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

اس سلسلے میں اشفاق اللہ خاں کے بہادرانہ کارنامے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی مساعی کی تحسین بھی کی گئی۔ ان کی کوششوں کا جہاں یہ نتیجہ نکلا کہ شاہ جہاں پور ہندو مسلم جھگڑے سے محفوظ رہا، وہاں اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ رام پرشاد بسمل اور ان کے دوستوں کے دلوں میں ان کا قوی اعتماد پیدا ہو گیا۔

انڈین ری پبلکن ایسوسی ایشن میں شمولیت :

یہی زمانہ تھا جب وہ ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن میں شامل ہوئے۔ جس کا مقصد آزاد ہندوستانی جمہوریہ کا قیام تھا۔ یہ مقصد اتنا بلند تھا کہ ہندوستان کی کوئی سیاسی جماعت اس کا تصور بھی نہ کر سکی تھی۔ کانگریس بھی ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے آئینی مطالبے تک پہنچی تھی۔ اسی زمانے میں سچیندر ناتھ بخشی سے ان کا تعارف ہوا اور

ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ بخشی جی نے اپنے انٹرویو میں جو انھوں نے سشیل کمار کو دیا تھا، اشفاق اللہ خاں سے اپنی ملاقات، ان کے ساتھ کام کرنے اور کاکوری کیس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ بخشی جی فرماتے ہیں :

"اشفاق اللہ خاں سے میرا تعارف ۱۹۲۴ء کی پہلی ششماہی میں ہوا، جب کہ میں یوگیش چڑجی (ممبر پارلیمنٹ) کے ساتھ شاہ جہاں پور گیا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ اکثر ملتے رہے اور انقلابی امور میں حصہ لیتے رہے...."۔

اس وقت مایوسی کا ایسا ماحول تھا کہ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر مکمل آزادی کا نشان تو دور رہا، ڈومینین اسٹیٹس کے مطالبے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے، لیکن ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کے نمائندے ہندوستانی جمہوریہ کا اعلیٰ مقصد لے کر چل رہے تھے۔ نوجوانوں کے بازو پھڑک رہے تھے۔ وہ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ سرکار کا سیدھا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ غرضے کہ سب ہی لوگ کچھ نہ کچھ کرنے اور مرمٹنے کو تیار تھے"۔

سرمایے کی فراہمی کا مسئلہ :

کوئی کام روپے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا اور ایک ایسی جماعت کے ممبران کو جن کا مقصد ہندوستان کی آزاد جمہوریہ کا قیام ہو اور جو آئینی اور قانونی طریقۂ کار کے بجائے انقلابی اقدامات پر یقین رکھتے ہوں کسی سرمایہ دار کی پشت پناہی بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی اور پارٹی کا کام بھی روپے کے بغیر آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ اس لیے روپے کی فراہمی اور ضروریات پوری کرنے کے لیے ڈاکے ڈالنے پڑتے تھے۔ اس سلسلے میں بچپوریا کا ڈاکہ بہت مشہور ہو چکا تھا۔ جب کاکوری کیس چلا تو اس میں بچپوریا میں ڈاکے اور قتل کا الزام بھی ملزمان پر لگا دیا گیا تھا۔ ڈاکے ڈالنے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ صرف ظالم زمینداروں اور سود خوار مہاجنوں کو نشانہ بنایا جائے۔ لیکن اس طریقۂ کار میں کئی خرابیاں تھیں، جن کا احساس ان انقلابیوں کو ہو گیا تھا اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اب ان افراد کو روپیہ کی فراہمی کے لیے نشانہ نہیں بنایا جائے

گا۔ کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹنے کا یہی پس منظر تھا۔ سچیندر ناتھ بخشی نے اپنے انٹرویو میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر ایک حد تک روشنی ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ یہ تاریخی روداد اور واقعہ کاکوری کا پس منظر بخشی جی کے بیان کی روشنی میں دیکھا جائے۔ بخشی جی بیان کرتے ہیں :

> ”جماعت کو اکثر روپے کی ضرورت لاحق رہتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے گاؤں کے ظالم زمینداروں اور مہاجنوں کے ہاں ڈاکے ڈالے جاتے تھے۔ لیکن اس طریقے میں بہت سی برائیاں تھیں۔ اس طرح ڈاکہ ڈالنے میں پولیس سے بچے رہنے کی تو کافی گنجایش رہتی تھی لیکن گاؤں والے ہمیں عام ڈاکو سمجھ کر ہم سے بھڑ جاتے تھے۔ جس کے باعث بہت سے بے قصور دیہاتیوں کی جان خطرے میں پڑنے کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس لیے کسی پر حملہ کر کے روپے حاصل کرنے کے طریقے کو ترک کرنے کا سوال پیدا ہوا۔
>
> اس وقت جرمنی سے ماؤزر پستول آنے والے تھے اور نقد روپیہ دے کر انھیں کلکتہ کی بندرگاہ سے حاصل کرنا تھا۔ یہ ساری اسکیم خفیہ تھی۔ ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لیکن روپے کی بھی بہت کمی تھی اور گاؤں میں ڈکیتی کا خیال ترک کیا جا چکا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہاں سے کافی روپیہ حاصل ہونے کی امید بھی نہ تھی۔ اس لیے اس مرتبہ ایک بڑی اسکیم بنائی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ لکھنؤ کے پاس ۸۔ڈاؤن ٹرین کو روک کر اس سے آنے والا ریلوے کا خزانہ لوٹ لیا جائے۔ اس کے لیے کاکوری اسٹیشن کے قریب ایک ویران جگہ بھی منتخب کر لی گئی۔ تمام تیاریاں خاموشی لیکن سرگرمی کے ساتھ ہوتی رہیں“۔

سرکاری خزانہ لوٹنے کا فیصلہ :

بخشی جی نے اس اقدام کے بارے میں ایک خاص بات یہ بیان کی کہ اشفاق اللہ خاں ابھی اتنے بڑے اقدام کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے پاس اپنی رائے کے حق میں مضبوط دلائل تھے اور آخر تک انھوں نے اپنے ساتھیوں کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی

لیکن ان کی رائے کو رد کر دیا گیا۔ بخشی جی بتاتے ہیں :

"اشفاق اللہ خاں اس رائے سے برابر اختلاف کرتے رہے۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری جماعت ابھی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ ہم برٹش حکومت کو کھلا چیلنج دے سکیں۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہیں کہ سرکار سے سیدھی جنگ چھیڑ کر اپنی جماعت کو قائم رکھ سکیں۔ لیکن تمام ساتھی جوش میں آکر پھڑک رہے تھے۔ اشفاق اللہ خاں کی بات نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

۹ راگست ۱۹۲۵ء ٹرین کی ڈکیتی کے لیے طے کیا گیا تھا۔ ہم دس آدمی جب کاکوری اسٹیشن پر پہنچے، اس وقت بھی اشفاق اللہ خاں کہتے رہے کہ رام پرشاد بات مان جاؤ، اب بھی وقت ہے۔ لوٹ چلو! لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا بن کر رہ گئی۔ پنڈت رام پرشاد بسمل نے مجھ سے کہا :"اشفاق اللہ خاں کو سمجھاؤ اور انھیں بتاؤ کہ لوگ انھیں اس اختلاف کے باعث کیا کیا کہہ رہے ہیں؟

میں نے اشفاق کو بتایا کہ ایسے موقع پر پہنچ کر تم جو اختلاف کر رہے ہو، اس کا ردّ عمل ساتھیوں پر بہت بُرا پڑے گا۔ بلکہ وہ لوگ تمھیں بزدل بھی کہنے لگے ہیں اور فی الحقیقت ہمارے کئی ساتھی کہہ رہے تھے کہ اشفاق خوف زدہ ہو گیا ہے۔ پنڈت رام پرشاد بسمل نے بھی اشفاق اللہ خاں کو بتایا کہ سب لوگ یہی سوچ رہے ہیں کہ تم ڈر گئے ہو۔ لیکن اشفاق کی بھی ایک رٹ تھی کہ لوٹ چلو، یہ کام نہیں ہونا چاہیے"۔

یہاں پہنچ کر اشفاق اللہ خاں کی ایک اور خوبی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ جب ان کی بات ساتھیوں نے نہیں مانی تو پھر انھوں نے جماعتی نظم وضبط کے مطابق پوری ثابت قدمی کے ساتھ اجتماعی فیصلے کا ساتھ دیا۔ چنانچہ بخشی کہتے ہیں کہ اشفاق اللہ خاں اگرچہ اس ڈکیتی سے اختلاف شروع سے کر رہے تھے، لیکن موقع پر انھوں نے اپنی ڈیوٹی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مکمل طور پر انجام دی۔

باب دوم

کاکوری کیس

منصوبہ اور اس پر عمل

۱۹۲۵ء کی ایک شب :

۹/اگست ۱۹۲۵ء کی شب نصف کے قریب گزر چکی ہے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ چونکہ چاند کی ابتدائی تاریخ (۲/صفر ۱۳۴۴ھ) ہے، اس لیے چاند نے سر شام ہی اپنے چہرے کو سیاہ چادر میں چھپالیا تھا۔ اگر چاند چودھویں کا ہوتا، تب بھی اس تاریک رات میں ساکنانِ ارضی اس کے روشن اور تاباں چہرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ کاکوری جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر رات کے وقت یوں بھی اِکادُکا مسافر ہی نظر آتے ہیں، لیکن اس موسم میں تو آج کوئی بھی مسافر پلیٹ فارم پر نظر نہیں آرہا ہے۔ اگر کوئی ہوگا بھی تو اسٹیشن کی عمارت کے کسی کونے میں دبکا بیٹھا ہوگا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اندر سے ہلکی ہلکی روشنی بھی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر آرہی ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا جھک کر اندر جھانکیں تو معلوم ہوگا کہ کھڑکی کے سامنے ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کا چہرہ سینے پر جھکا ہوا ہے۔ تختے پر ایک لالٹین رکھی ہوئی ہے۔ یہ مدھم روشنی اس سے پھوٹ رہی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بھی اسی قسم کی ایک روشن رکھی ہوئی ہے اور کھٹ کھٹ کی آواز آرہی ہے۔ شاید وہ پچھلے اسٹیشن سے تصدیق کر رہا ہے کہ گاڑی وقت پر آرہی ہے یا لیٹ ہے؟ پلیٹ فارم پر بھی لالٹینیں روشن ہیں جو تاریکی کے طلسم کو توڑنے کی ناکام کوشش میں صرف اپنے وجود کا پتا دے رہی ہیں۔ پلیٹ فارم پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور جہاں تہاں سے اینٹیں ٹوٹ گئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے ہیں، جن میں بارش کا پانی جمع ہوگیا ہے۔ اس کا پتا ان پر لالٹینوں کی ہلکی روشنی کے پڑنے سے ہوتا ہے۔

لیکن ذرا ذرا دیر کے بعد بجلی چمکتی ہے تو پلیٹ فارم اور ارد گرد کی پوری فضا ایک لمحے کے لیے روشنی میں نہا جاتی ہے۔

بجلی کی اسی روشنی میں اسٹیشن کی عمارت اور پلیٹ فارم کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے درختوں کے نیچے ہمیں چند انسانی ہیولے نظر آتے ہیں جو چادریں اوڑھے یا برساتیاں پہنے معلوم ہوتے ہیں۔ جو موسم کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ لوگ اپنے عزیزوں، دوستوں وغیرہ کو لینے کے لیے اسٹیشن پر آتے ہی رہتے ہیں اور وہ لوگ جو کسی وجہ سے رات ہی کو لکھنؤ پہنچ جانا چاہتے ہیں، اس ٹرین سے سفر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

اس منظر میں ہم ایک اور شخص کو دیکھتے ہیں جو اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے بیٹھا اونگھ رہا تھا، اسٹیشن کی عمارت کے سائبان کے نیچے کھڑے ہو کر ہاتھ کو جنبش دیتا ہے اور یکا یک فضا گھنٹے کی آواز سے گونج اٹھتی ہے اور اسٹیشن پر زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ لوگ رفتہ رفتہ پلیٹ فارم کے سامنے اسٹیشن کی عمارت کے دوران میں آ آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے اس چھوٹے سے ہنگامے میں ہماری توجہ ان لوگوں کی طرف سے ہٹ جاتی ہے، جن کے ہیولوں نے ہمیں پہلی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

تھوڑی دیر میں سہارن پور سے لکھنؤ جانے والی ۸۔ ڈاؤن پسنجر ٹرین کاکوری اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آکر رکتی ہے اور لوگ جلدی جلدی اس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ چند مسافر اترتے بھی نظر آتے ہیں، جو کسی کا انتظار کیے بغیر تیزی سے چل کر اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چند منٹ کے بعد ٹرین روانہ ہو جاتی ہے اور ایک زندگی وجود میں آکر فنا ہو جاتی ہے اور اسٹیشن پر ہر طرف ایک سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں ایک اور ہنگامہ برپا ہونے والا ہے، جو ہندوستان میں برٹش حکومت کو ہلا کر رکھ دے گا۔ اور برصغیر کی جنگ آزادی کی تاریخ میں احرار وطن کی اولوالعزمی اور جاں بازی کا ایک ایسا نقش ابھرے گا جسے آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ عقیدت واحترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

اشفاق اللہ خاں، سچیندر ناتھ بخشی اور راجندر لاہڑی کا گروپ الگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے لکھنؤ کے لیے سکینڈ کلاس کے تین ٹکٹ خرید لیے تھے۔ یہ تینوں ایک ڈبّے میں سوار ہو گئے۔ پارٹی کے دوسرے ارکان مختلف ڈبوں میں سوار ہو گئے تھے۔

ٹرین روک لی گئی :

ٹرین کاکوری کے حدود سے نکلی ہی تھی کہ ایک ویران سی جگہ پر زنجیر کھینچ کر اسے روک لیا گیا۔ چند آدمی اس میں سے تیزی کے ساتھ اترے اور ٹرین کے دونوں جانب پوزیشن سنبھال لی۔ چند فائروں کی آواز فضا میں گونجی اور ٹرین میں مسافروں اور عورتوں بچوں کی چیخ و پکار کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اچانک فضا میں ایک دبنگ آواز گونجتی ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ کوئی شخص ٹرین سے اترنے اور کوئی حرکت و ہنگامہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کسی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی نے ٹرین سے اُترنے، بھاگنے، مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو اسے معاف نہیں کیا جائے گا"۔ اس آواز میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ پوری ٹرین پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ عورتوں کے ڈبے سے اب بھی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں اور کبھی کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز فضا میں گونجتی اور پھر ایک موت کا سکوت فضا پر چھا جاتا۔

البتہ ایک شخص، اس اعلان کے باوجود گاڑی سے اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اسی وقت فائر کی آواز فضا میں گونجتی ہے۔ لوگ اسے جلدی سے ڈبے میں کھینچ لیتے ہیں۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ اسی لمحے پھر ایک آواز فضا میں بلند ہوتی ہے۔ مسافروں کو خبردار کیا جاتا ہے: "ٹرین محاصرے میں ہے۔ کوئی شخص ٹرین سے اترنے یا کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ گولی ماردی جائے گی"۔ ساتھ ہی انھیں بتادیا گیا کہ وہ ڈاکو نہیں انقلابی ہیں، وہ کسی مسافر کو نہیں لوٹیں گے۔ وہ سرکاری خزانہ لوٹیں گے اور چلے جائیں گے۔ اس آواز سے مسافروں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اکثر ڈبوں میں کھڑکیوں کے شٹر گرادیئے گئے۔

خزانے کا صندوق :

گروپ کے چند نوجوان گارڈ کے ڈبے تک پہنچ گئے اور اسے محاصرے میں لے لیا۔ انگریز گارڈ کو نیچے اتار لیا گیا اور اسے زمین پر اوندھے منہ لٹادیا گیا۔ تین چار آدمیوں نے اس کے ڈبے میں گھس کر خزانے کی تجوری کو نیچے گرادیا۔ گارڈ نے کسی قسم کی مزاحمت یا سرکاری خزانے کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے ڈر کے مارے سر کو جنبش تک نہ دی، نہ آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جس خزانے اور ڈبے کا وہ محافظ ہے، اس پر کیا بیت رہی ہے؟ سچیندر ناتھ بخشی لکھتے ہیں :

"گارڈ کے ڈبے سے خزانے کا صندوق اتار کر توڑا جانے لگا کہ یکایک دوسری جانب سے انجن کی تیز سرچ لائٹ نظر آنے لگی۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں اور شک ہوا کہ کسی طرح ہماری اسکیم کا راز فاش ہو گیا ہے اور پولیس آ رہی ہے! پھر بھی ہم مکمل طور پر مرنے مارنے کو تیار تھے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم جنگ کے لیے مستعد ہو گئے۔ کسی نے اپنی جگہ نہ چھوڑی، جو جس ڈیوٹی پر تھا، وہیں رہا۔ لیکن بات دوسری ہی نکلی۔ وہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی، برابر کی لائن سے سیٹی بجاتی ہوئی تیزی سے گزر گئی"۔

اب لوہے کے مضبوط اور وزنی صندوق پر، جس میں خزانہ تھا، چھینی اور ہتھوڑے چل رہے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ یہ صندوق ان معمولی چھینیوں سے نہ توڑا جا سکے گا، جنھیں مطلب براری کے لیے کافی سمجھا گیا تھا۔ یہ سوچ کر کلہاڑی کو اس پر آزمایا گیا جو اس خیال سے پہلے ہی ساتھ لے لی گئی تھی۔ صندوق بہت مضبوط تھا۔ اس نے انگریز گارڈ سے زیادہ فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ اور سرکاری خزانے کی حفاظت میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اس کا چہرہ زخمی اور جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن کلہاڑی کی پیہم ضربات کے سامنے اس کی مضبوطی اور قوت مدافعت نے بالآخر جواب دے دیا۔ اس کی محکمی نونہالانِ وطن کے عزائم کے سامنے پسپا ہو گئی۔ اور اس نے نہایت مایوسانہ ہتھیار ڈال دیئے۔ خزانے کو سمیٹ کر گٹھریوں میں باندھ لیا گیا۔ اس کے بعد گارڈ کو روک کر ڈرائیور کو گاڑی لے جانے کا حکم دیا گیا۔

سچیندر ناتھ نے بیان کیا ہے کہ:

"اشفاق اللہ خاں کو اگرچہ اس ڈکیتی سے اختلاف تھا لیکن جب اس کا فیصلہ ہو گیا تو موقع پر انھوں نے اپنی ڈیوٹی کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بغیر مکمل طور پر انجام دی"۔

یہ سارا مرحلہ طے کرنے میں تقریباً ۴۵ منٹ صَرف ہوئے۔ یہ عظیم الشان کارنامہ سرانجام دینے اور برٹش استعمار اور اس کے آہنی نظام پر تاریخی ضرب لگانے والے صرف دس نوجوان تھے، جن کی عمریں ۲۰ برس اور ۲۸ برس کے درمیان تھیں، جب کہ ٹرین میں سولہ مسلح سپاہی جن میں ۱۴ ہندوستانی اور ۲ انگریز بہادر ٹرین اور اس کے خزانے کی

حفاظت کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے مدافعت تو درکنار کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی جرأت نہ کی۔ ٹرین کے ڈرائیور اور اس کے انجنیئر کی تو حالت ہی خراب تھی اور جب انگریز گارڈ کو روک کر ڈرائیور کو ٹرین لے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی تو گارڈ کا حال اور بُرا ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب یہ ڈاکو اسے مار ڈالیں گے۔ لیکن یہ نوجوان جو سچے وطن پرست تھے کسی کے ذاتی دشمن نہ تھے اور ناحق کسی کی جان لینا بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ وہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔

اس انقلابی کارنامے کے انجام دینے میں صرف ایک بد قسمت کام آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مسافر تھا اور اس کی بیوی زنانہ ڈبے میں سفر کر رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں گاڑی سے اُتر پڑا تھا اور ایک وطن پرست کی بے خطا گولی کا نشانہ بن گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جاں سپار ہونے والا ایک لاأبالی اور بے فکر اایس وینڈر تھا جو حالات کی سنگینی کا اندازہ کیے بغیر گاڑی سے اُتر پڑا تھا۔ بہر حال ان دونوں میں سے کوئی ہو۔ مجھے امید ہے انقلابیوں کی روحوں نے بہ کنڈیا جنت میں ان سے ضرور معذرت کر لی ہو گی۔ وہ اپنی مظلومانہ موت کے بدلے میں اور جاں نثاران وطن اپنی قوم پرستی اور جہاد آزادی کے صلے میں ایک ہی جگہ ہوں گے اور ان کی اچھی گزرتی ہو گی۔

لکھنؤ اسٹیشن پر کہرام :

ان بہادر نوجوانوں نے خزانے کی گٹھریاں سر پر رکھیں اور پیدل ہی چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہنچ کر اپنے خفیہ ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ ٹرین کاکوری سے چل کر لکھنؤ ٹھہرتی ہے۔ کاکوری سے اس کی روانگی کی اطلاع پہنچ چکی تھی لیکن جتنا وقت گاڑی کے پہنچنے میں لگتا ہے، اس سے کہیں زیادہ وقت گزر چکا تھا اور گاڑی کا پتا نہ تھا۔ کاکوری سے کئی بار روانگی اور اس کے صحیح وقت کی تصدیق کی جا چکی تھی۔ لیکن گاڑی پر جو کچھ بیتی تھی وہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ لکھنؤ اسٹیشن کا عملہ سخت پریشان تھا اور طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں اور نظریں ہر کسی کی کاکوری کی سمت لائن پر لگی ہوئی تھیں۔ جب دور سے ٹرین کی روشنی نظر آئی تو ہر کسی کی جان میں جان آئی۔ لیکن اطمینان و سکون چند لمحوں سے زیادہ طویل نہ ثابت ہوا۔

ٹرین اسٹیشن پر پہنچی تو چیخ و پکار کی آوازوں سے اسٹیشن گونج اُٹھا۔ لوگوں کے ضبط کے بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ ہر شخص چیخ چیخ کر ڈاکے اور قتل کی خبر سنا رہا تھا۔ اسٹیشن کا عملہ سراسیمہ ہو کر گارڈ کے ڈبے کی طرف بھاگا۔ لیکن وہاں نہ گارڈ تھا نہ خزانے کی تجوری! ان کی سراسیمگی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ خزانہ لوٹنے والوں کے بارے میں ہر کوئی اپنے قیاس کے مطابق خبر سنا رہا تھا۔ یہ بات تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ لوٹنے والے گنتی کے صرف دس نوجوان تھے۔ اسی ٹرین میں سفر کرنے والوں کا خیال تھا کہ چالیس پچاس سے کم ہرگز نہ تھے۔ حال آں کہ ٹرین کا محاصرہ کرنے والے صرف دو نوجوان تھے جو ٹرین کے دونوں طرف کھڑے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے میں فائر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے ڈرائیور اور انجینئر کو اپنے نشانے کی زد میں لے رکھا تھا، ایک نوجوان گارڈ پر متعین تھا۔ دیگر چار افراد خزانے کے صندوق کو توڑنے میں مصروف تھے اور باقی دو افراد گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

بعض لوگوں کا اس وقت بھی خیال تھا کہ یہ کام عام ڈاکوؤں کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن حقیقت واقعہ کا نہ ان کو علم تھا، نہ ان کے پاس اپنے خیال کی تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ تھا!

پورے ملک میں سنسنی :

اگر حکومت کے بس میں ہوتا تو اس سنگین واقعے پر دبیز پردے ڈال دیئے جاتے اور عوام کو حکومت کے اس کاری زخم اور اس کی شکست کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی جاتی۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا جاتا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ واقعہ ہزاروں مسافروں سے بھری ٹرین میں پیش آیا تھا۔ تمام لوگوں کی زبانوں پر تالے ڈال دینا حکومت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس حادثے پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اودھ کے جنوب اور مشرقی اضلاع میں مسافروں ہی کے ذریعے یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی اور ۱۱/اگست ۱۹۲۵ء کے انگریزی اخبارات کے ذریعے یہ خبر ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ پورا ملک حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر شخص کی زبان پر کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹنے کے بہادرانہ کارنامے کا تذکرہ تھا اور خواہ زبان سے کوئی نہ کہتا ہو اور کسی کے سامنے خوشی کا اظہار نہ کرتا ہو لیکن دل میں ہر شخص خوش تھا اور اس کی ہمدردیاں قوم کے ان جاں بازوں ہی کے ساتھ تھیں۔

سچیندر ناتھ بخشی جو خود بھی اس جاں باز اور حریت پرست پارٹی میں شامل تھے اور گرفتار ہونے والوں میں آخری شخص تھے، بعد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کرتے ہیں :

"دوسرے دن علی الصبح میں لکھنؤ اسٹیشن پر کاکوری ڈکیتی کے بارے میں پتا لگانے کے لیے جا ہی رہا تھا کہ یکایک ایک عجیب اطلاع ملی۔ اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ ڈکیتی کے سلسلے میں ایک آدمی جان سے بھی مارا گیا ہے۔ ہم نہ تو ایسا چاہتے تھے، نہ بعد کو ہمیں علم ہوا کہ کون اور کس طرح مارا گیا... میں اخبار لے کر جائے اقامت پر پہنچا اور فوراً سب کو مطلع کیا اور فوری طور پر تمام ساتھیوں کو ہوشیاری کے ساتھ منتشر کر دیا گیا"۔

گرفتاریوں کا آغاز :

یوپی گورنمنٹ نے نہایت سرگرمی کے ساتھ معاملے کی تفتیش شروع کی لیکن ایک ماہ سے زیادہ مدت میں شب و روز کی نہایت منظّم تفتیش کے باوجود حقیقت سے پردہ نہ اٹھ سکا۔ اس وقت پولیس کے ہاتھ میں مایوسی، ناکامی، غصے اور جھنجھلاہٹ کے سوا کچھ نہ آیا تھا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۵ء کی صبح کو چار بجے پورے صوبے میں بہ یک وقت چھاپہ مارا گیا اور اندھا دھند گرفتاریاں کی گئیں۔ ان گرفتاریوں میں کئی وہ نوجوان بھی پولیس کے ہاتھ آگئے جو اس عظیم الشان کارروائی میں شریک تھے۔ رفتہ رفتہ گرفتاریوں کا یہ سلسلہ یوپی سے بہار و بنگال اور ادھر دہلی و پنجاب تک دراز کر دیا گیا اور ہر اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا جس کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہوا کہ انقلابی خیالات رکھتا ہے۔ لیکن اس وقت تک سچیندر ناتھ بخشی، چندر شیکھر آزاد، راجندر لاہڑی اور اشفاق اللہ خاں گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ بخشی جی لکھتے ہیں :

"۲۶ر ستمبر ۱۹۲۵ء کو پورے صوبے میں چھاپہ مارا گیا اور گرفتاریاں کی گئیں، جس میں چندر شیکھر آزاد، راجندر لاہڑی، اشفاق اللہ خاں اور میں گرفتار نہیں کیے جا سکے"۔

باب سوم

مقدمہ کی کارروائی

اور

جیل کے شب و روز

۲۶ر ستمبر اور اس کے بعد کے تھوڑے عرصے میں جو نوجوان گرفتار ہوئے تھے، ان کی تعداد چوالیس تھی۔ ان میں سے سولہ افراد کو مقدمہ شروع سے پہلے ہی رہا کر دیا گیا۔ بقیہ اٹھائیس پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ملزمان کی تعداد :

لیکن ۱۰ر دسمبر تک یہ تعداد گھٹ کر چوبیس رہ گئی۔ جن پر مقدمہ چلا۔ ان ملزمان کے نام یہ ہیں :

۱- رام پرشاد (شاہ جہاں پور)
۲- بشن سرن ویلیس (میرٹھ)
۳- رام سرن کھتری (چاندا)
۴- من متھاناتھ گپتا (بنارس)
۵- پریم کشن کھنا (شاہ جہاں پور)
۶- سجن بسواس
۷- راج کمار سنہا (کان پور)
۸- سریش چندر بھٹا چاریہ (بنارس)
۹- سیٹھ دامودر سروپ
۱۰- رام دُلارے (کان پور)
۱۱- بیر بھدر تواری
۱۲- ہر گووند (ڈھاکا)
۱۳- جی۔ سی۔ کار
۱۴- رام ناتھ پانڈے (بنارس)
۱۵- روشن سنگھ (شاہ جہاں پور)
۱۶- اندو بھوشن مترا (شاہ جہاں پور)
۱۷- بنارسی لال (شاہ جہاں پور)
۱۸- جیوتی شنکر ڈکشت
۱۹- سچیندر ناتھ سانیال (بنارس و جھانسی)
۲۰- راجندر لاہڑی (پونا و بنارس)

۲۱- جگیش چٹرجی (ڈھاکا) ۲۲-اشفاق اللہ خاں (شاہ جہاں پور)

۲۳-ایس۔این۔ بخشی (بنارس و جھانسی) ۲۴-چندر شیکھر آزاد (بنارس)

(روزنامہ 'ہمدرد'۔ دہلی، ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

اس فہرست سے اگر نمبر ۶، ۹، ۱۶، ۱۷، ۲۴ کو نکال دیا جائے جو سزا یافتگان کی فہرست میں نہیں۔ تو اگرچہ اٹھارہ سزا یافتگان کی تعداد پوری ہو جاتی ہے لیکن ان۔کے ناموں کا اختلاف نہیں مٹتا۔

میرے خیال میں یہ اختلاف اس وجہ سے نظر آتا ہے کہ ان اٹھارہ میں سے بھی بعض ملزمان — ان میں آٹھ یقیناً کاکوری کیس میں شریک نہیں تھے۔ لیکن انھیں پولیس نے سازش سے پھانس لیا تھا یا وہ صرف سازش (منصوبہ بندی) میں یا بمرولی ڈکیتی، بچپوری ڈکیتی یا دوارکا پور ڈکیتی میں شریک و مطلوب تھے۔

یہ اشکال سزا یافتگان کی ایک اور فہرست سے دور ہو جاتا ہے جو اسی قسم کی سازشوں پر مشتمل ایک سرکاری رپورٹ سے لے کر اس کتاب کے باب چہارم کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کی گئی ہے۔

ان تمام گرفتار شدگان کو لکھنؤ جیل میں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا، سب سے الگ الگ تفتیش کی جارہی تھی اور پوری فریب کاری کو کام میں لایا جارہا تھا۔ ایک سے دوسرے کے اعتراف کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ لیکن پولیس اور سی آئی ڈی کے ان جھانسوں کے باوجود کوئی رُکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ خفیہ پولیس کے کپتان بذاتِ خود جیل پہنچے اور رام پرشاد بسمل سے ملاقات کی، ان سے ہمدردی کا اظہار کیا، روشن مستقبل کی توقع ظاہر کی، حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی، بڑے انعام کا لالچ بھی دیا لیکن انھیں اپنے مقصد میں مایوسی ہوئی اور جیل سے ناکام لوٹے۔ لکھنؤ کے کلکٹر نے بھی جیل میں قیدیوں سے ملاقات کی اور انھیں ہر طرح کے لالچ سے رجھانے سے لے کر دھمکیوں سے مرعوب کر کے اعترافِ جرم کرانے کی کوشش کی اور دوسرے قیدیوں کو بھی انھوں نے پندرہ پندرہ ہزار روپے اور انگلستان کی سیر کرانے کی پیش کش کی لیکن انھیں بھی مایوس لوٹنا پڑا۔ تشدد کا حربہ بھی استعمال کیا گیا لیکن اس میں بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ کسی نے جرم کا اعتراف نہ کیا۔

اس کے باوجود کہ پولیس کے پاس الزام کے سوا قیدیوں کے خلاف کوئی ثبوت نہ

تھا، کسی کو ضمانت پر رِہا نہیں کیا گیا۔ پولیس کو صرف یہ یقین تھا کہ اس ڈاکے سے ان نوجوانوں کا تعلق ضرور ہے اور حقیقت واقعہ کا انکشاف انھیں میں سے کوئی ضرور کرے گا۔ چنانچہ پولیس نے عدالت میں ان کا چالان پیش کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خاص عدالت قائم کی گئی تھی۔ اور عین الدین کو اس کا اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا۔ انھوں نے بھی پولیس کے ساتھ تفتیش کرنے اور ملزموں کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں پورا تعاون کیا۔ پولیس نے ایک بار پھر جرم کا اعتراف کرانے اور راز اُگلوانے کے لیے فریب کا جال بچھایا۔ اس بار پولیس کا یہ داؤں کامیاب رہا۔ بنارسی لال اور اندر بھوشن پولیس کے جھانسے میں آ گئے۔ جب ایک مرتبہ ان کی زبان سے کوئی جملہ نکل گیا تو انھیں معافی دلوانے کے وعدے پر سرکاری گواہ بنا لیا گیا۔ اس کے بعد بنواری لال اور بھوپندر سانیال نے بھی اقبال جرم کر لیا۔ اس کے بعد منصوبے کی جزوی تفصیلات تک اور تمام ارکان کے حالات اور ہر طرح کی معلومات حاصل کر لی گئیں۔ اس طرح اشفاق اللہ خاں کا نام بھی پولیس کے علم میں آ گیا۔ پارٹی کے تقریباً تمام ارکان تو پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے، صرف تین ارکان اشفاق اللہ خاں، سچیندر ناتھ بخشی اور چندر شیکھر آزاد ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے تھے۔

پولیس کی چیرہ دستی :

جو ملزمان گرفتار ہو چکے تھے ان پر جیل میں سختیاں کی جا رہی تھیں اور باہر ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو پریشان کیا جا رہا تھا اور جو ملزمان ابھی پولیس کی گرفت میں نہیں آئے تھے، ان کے گھر والے خاص طور پر پولیس کے ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ بنارسی لال چترویدی صاحب لکھتے ہیں :

> ”جیل میں تو ملزمان پر آئے دن سختیاں ہوتی ہی تھیں لیکن جیل کے باہر ملزمان کے ہمدردان اور مخلصوں کو بھی پولیس شب و روز ستانے کی فکر میں رہتی تھی۔ شری ششیلا سہائے اور بھوپندر سانیال کی گرفتاری کے بعد پولیس ان کے گھر سے سامان اٹھا کر لے گئی۔ شری سچیندر ناتھ بخشی کے فرار ہونے کے بعد ان کی تمام منقولہ جائداد ضبط کر لی گئی۔ ان کے والد محترم شری کالی چرن کے مکان پر رات میں چھاپہ مارا گیا اور تمام کپڑے اور

کھانے پینے کا سامان، گھی، چاول وغیرہ پولیس اٹھا کر لے گئی۔ گھر والے جاڑے میں ٹھٹھرتے رہ گئے، اس قسم کے واقعات دوسری جگہوں پر بھی ہوئے۔

کاشی ودیاپیٹھ میں ایک طالب علم محض اس وجہ سے گرفتار کر لیا گیا کہ سیٹھ دامودر سروپ کی حاضری دیکھتے وقت وہ بھی غیر حاضر تھا۔ سہارن پور اور شاہ جہاں پور میں اشفاق اللہ خاں کے گھر پر بھی پولیس نے اسی قسم کا طوفانِ بے تمیزی برپا کیا تھا"۔

بخشی جی نے لکھا ہے کہ اشفاق اللہ خاں کے گھر پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا تو ان کے بھائی کی بندوق بھی ساتھ لے گئی تھی۔

بالآخر ۴/ جنوری ۱۹۲۶ء کو سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ پہلے مخبروں کے بیانات قلم بند ہوئے۔ پھر سرکاری گواہوں کے بیانات ہوتے رہے۔ جن لوگوں کا چالان پیش کیا گیا تھا ان میں پنڈت رام پرشاد بسمل، راجندر لاہڑی، روشن سنگھ، بنواری لال، بھوپندر سانیال، گوبند چرن کار، مکندی لال، یوگیش چندر چٹرجی، من متھ ناتھ گپتا، پریم کشن کھنا، پورہرن ویش چٹرجی، راج کمار سنہا، رام دلارے، رام کشن کھتری، رام ناتھ، سچیندر ناتھ سانیال، سریش بھٹا چاریہ، وشنو شرن ویلس، ستیلا سہائے، سیٹھ دامودر سروپ، سچیندر ناتھ بخشی، چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں، جیوتی شنکر دیکشت اور ویر بھدر تواری شامل تھے۔ ان میں سے آخر الذکر دو حضرات کو عدالت نے رہا کر دیا۔ باقی افراد کو سیشن کے سپرد کر دیا۔ ان میں سے بھی بخشی، آزاد اور اشفاق فرار تھے۔ گویا انیس افراد پر مقدمہ چلنا شروع ہوا۔

سیشن کورٹ :

یہ مقدمہ سیشن کونٹ کے جج مسٹر ہملٹن کی عدالت میں ۲۱/ مئی ۱۹۲۶ء سے چلنا شروع ہوا تھا۔ سرکار کی جانب سے مقدمے کی پیروی کے لیے پنڈت جگت نرائن مُلا مقرر ہوئے تھے اور ملزمان کی پیروی مسٹر ہرکرن مصرا کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ ملزمان کی جانب سے کلکتہ کے ایڈووکیٹ مسٹر چودھری اور لکھنؤ کے وکلاء میں موہن لال سکسینہ، چندر بھان گپت، کرپا شنکر ہجیلا وغیرہ تھے۔ ان وکلاء نے نہایت قابلیت کے ساتھ مقدمہ

لڑا۔ لیکن گورنمنٹ اس مقدمے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اس سے ان وکلاء کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ حکومت کی طرفداری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مقدمہ عین الدین کی عدالت میں چل رہا تھا تو ملزمان کی شناخت کے لیے انھیں جیل سے تھانے لے جایا گیا تھا اور شناخت کرنے والوں کو ان کے فوٹو پہلے سے دکھا دیئے گئے تھے اور اب جب کہ مقدمہ سیشن کے سپرد کر دیا گیا تھا تو ملزمان نے گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ ان کا مقدمہ سیشن کی عدالت سے کسی دوسرے جج کی عدالت میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ ان کا رویّہ ملزمان کے ساتھ جانب دارانہ ہے، لیکن ان کی اس درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

عدالت کا منظر:

بہر حال مقدمہ شروع ہو گیا۔ پیشیاں ہوتی رہیں۔ حتی کہ ایک سوچے سمجھے فیصلے کی پوری تیاری کر لی گئی۔ مقدمے کے دوران ملزمان کے شب و روز گزرتے رہے۔ مقدمے کے دوران ان کا ردِ عمل کیا تھا اور حالات کا ان کے دلوں پر کیا اثر تھا۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی نے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت جی لکھتے ہیں:

> "مقدمہ چل رہا تھا۔ جبر و ظلم کا دور دورہ تھا۔ لیکن سرفروشی کی تمنا نے ملزمان کی جیل کی زندگی میں بڑی توانائی پیدا کر دی تھی۔ ملزمان کا عدالت میں حاضر ہونے اور عدالت سے واپس ہونے کا منظر بڑا دلکش ہوتا تھا۔ پنڈت رام پرشاد کے پیچھے جملہ افراد جب بندے ماترم کا ترانہ گاتے ہوئے چلتے تھے تو نہایت ہی حسین منظر ہوتا تھا۔ موٹر سے اُترتے ہی بندے ماترم، بھارت ماتا کی جے، بھارت پرجاتنتر کی جے کے نعروں سے عدالت کی فضا گونج اٹھتی تھی۔ انھیں دیکھنے کے لیے نیز ان کے شیریں نغمے سننے کے لیے ہزاروں افراد کا ہجوم امنڈ پڑتا تھا۔ پولیس آفیسروں کے دل ان نعروں کو سن کر دہل جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کانسٹبل نے تاؤ میں آکر ایک ملزم پر تھپڑ اٹھایا ہی تھا کہ تمام ملزمان بھڑ گئے اور ان میں سے ایک نے تو کانسٹبل کی پٹائی بھی کر دی۔ بس پھر کیا تھا، ایک دوسرا مقدمہ چلا دیا گیا۔ لیکن پھر اس

معاملے میں سمجھوتا ہو گیا"۔

عدالت کے منظر کے بارے میں پنڈت جی لکھتے ہیں :

"عدالت کا منظر بھی اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا تھا۔ ایک طرف پنڈت رام پرشاد بسمل، یوگیش بابو، شری وشنو شرن، شری سچیندر ناتھ سانیال اور شری سریش اپنی فطری خودداری اور سنجیدگی سے مقدمے کی کارروائی کو دیکھتے تھے تو دوسری جانب من متھ، راج کمار، رام دلارے، رام کشن وغیرہ کی فقرہ بازیوں سے عدالت کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ کچہری میں کوئی پریس رپورٹر نظر نہیں آتا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی پریس رپورٹر آجاتا تھا تو پولیس اسے چین نہیں لینے دیتی تھی"۔

جیل کی زندگی :

جیل کی زندگی اور معمولات کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اب ذرا ان جاں بازوں کی روزانہ کی جیل کی زندگی بھی ملاحظہ فرمائیے :

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جیل کے تمام قیدی ان جاں نثارانِ وطن کی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے۔ ان کے اخلاق سے وہاں ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ ہر قیدی ان جاں بازوں کے ہر حکم کی تعمیل میں بسر و چشم تیار رہتا تھا۔ سریش اور راج کمار کے نغموں سے قیدی ہی نہیں جیل کا تمام عملہ بھی مسحور ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کھیل کود نیز مسائل پر غور و فکر بھی ہوتا تھا۔ پنڈت رام پرشاد بسمل خدمت وطن ہی کو اپنا دین وایمان سمجھتے تھے۔ اتوار کا دن سب لوگوں کا خوشی کا دن ہوتا تھا۔ اس روز کھانا بھی اچھا بنتا تھا۔ اور ایک اتوار کو تو ان لوگوں نے بائیس سبزیاں کھانے کے لیے بنائیں۔ سب لوگ اپنے بڑے ساتھیوں کے حکم کی تعمیل کرتے تھے"۔

جیل میں ادبی ماحول :

چوں کہ یہ تمام لوگ پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ اس لیے جیل میں ادبی اور شعری

ماحول کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ جیل میں اور عدالت آتے جاتے ہوئے یہ نوجوان اکثر گیت اور غزلیں گایا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض گیت اور غزلیں ان کی اپنی کہی ہوتی تھیں اور اکثر گیت، نغمے اور غزلیں دوسرے شاعروں کی کہی ہوتی تھیں۔ پنڈت چترویدی صاحب نے ایسی چند غزلوں اور گیتوں کی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس راگ ورنگ نے سب میں ایک شعری ذوق پیدا کر دیا تھا۔ ان کی تمام شعری تخلیقات کا ذکر تو یہاں ممکن نہیں۔ کیوں کہ تمام تخلیقات جیل کے باہر نہیں پہنچ سکیں۔ البتہ چند وہ گانے جنھیں ملزمان کچہری جاتے وقت گایا کرتے تھے، کسی طرح محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور غزل یہ ہے :

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

رہ روِ راہِ محبت رہ نہ جائے راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
صرف میخانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

آہ مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار
کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے۔

اے شہید ملک و ملت میں ترے اوپر نثار
اب تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

دامودر سروپ کی بیماری اور رِہائی :

سیٹھ دامودر سروپ جیل میں بیمار ہو گئے اور ایک عرصے تک سخت بیمار رہے۔ گورنمنٹ نے ان کے علاج کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور بیماری کی حالت ہی میں انھیں جیل

میں لایا جاتا رہا۔ ایک مرتبہ جب انھیں اسٹریچر پر ڈال کر عدالت میں لایا گیا تو ان کے ساتھیوں کو اس ظالمانہ رویّے سے دلی تکلیف پہنچی اور انھوں نے عدالت میں سخت احتجاج کیا۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

> "ایک بار جب سیٹھ دامودر سروپ جی عدالت میں اسٹریچر پر لائے گئے تو اس منظر کو دیکھ کر ان کے ساتھیوں کو بڑی روحانی تکلیف پہنچی۔ کٹ گھرے میں ایک پنڈت رام پرشاد بسمل شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے ہملٹن صاحب کا مذاق اُڑا رہے تھے تو دوسری طرف ڈبلس جی انگریزی میں برٹش حکومت کے انصاف کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ اس ۔لیے اُس دن عدالت برخواست کردی گئی"۔

اب حکومت کو ان کی بیماری کا خیال آیا۔ چنانچہ یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ ملزم واقعی بیمار ہے یا نہیں؟ ایک بورڈ متعین کیا گیا۔ لیکن بورڈ کے ممبران کی سرکار پرستی اور برٹش حکومت سے ان کی وفاداری یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کوئی رپورٹ حکومت کی منشا کے خلاف پیش کی جائے۔ چنانچہ بورڈ نے رپورٹ کی کہ ملزم کی حالت ایسی ہے کہ وہ عدالت میں حاضر ہو سکے۔ لیکن یہ فیصلہ کاکوری کیس کے ماخوذین کے لیے قابلِ قبول نہ تھا، اس لیے انھوں نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور آیندہ پھر کبھی انھیں اس حالت میں عدالت میں نہیں لایا گیا۔ اس کے بعد سیٹھ دامودر سروپ کو دہلی بھیج دیا گیا۔ جب وہاں بھی ان کی صحت ٹھیک نہیں ہوئی تو انھیں دہرادون بھیج دیا گیا۔ لیکن ان کی حالت پھر بھی نہ سنبھلی تو ایک ہزار روپے کی ضمانت اور ایک ہزار روپے کی مچلکے پر انھیں رِہا کر دیا گیا۔

جیل میں بھوک ہڑتال :

جیل میں کاکوری کیس کے ملزمان پر سختیاں بھی کی گئیں؛

اوّلاً تو ان پر اقبال جرم کر لینے کے لیے تشدد روا رکھا گیا۔ اس قسم کے تشدد اور سختیوں پر کوئی فردِ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا لیکن دوسری قسم کی سختیاں وہ تھیں جن سے جیل میں قیدیوں کو عام طور پر سابقہ پڑتا ہے، مثلاً؛

خراب غذا، تنگ جگہ اور ان آسانیوں کا فقدان جو جیل میں قیدیوں کو ازروئے قانون مہیا کرنا جیل کے حکام پر لازم تھا۔ اس قسم کے کسی قانونی حق کو کوئی ملزم چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جیل میں قیدیوں کے پاس لے دے کے بھوک ہڑتال کا ایک حربہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کاکوری کیس کے ملزموں کو جیل کے حکام سے، خراب کھانے، گندی جگہ اور غلط برتاؤ کی شکایت پیدا ہوئی تو انھوں نے اسی حربے کو استعمال کیا اور کامیاب رہے۔ چترویدی صاحب لکھتے ہیں :

> ''کھانے پینے کی شکایتیں اور جیل کے عملے کے برتاؤ سے متاثر ہو کر ملزمان نے اتر پردیش کے ہوم منسٹر کو ایک شکایتی عرض داشت پیش کی۔ لیکن اس کا انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ جیل کے انسپکٹر جنرل سے بھی شکایت کی گئی کہ برسات کا پانی جیل کی کوٹھریوں میں بھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو تمام ملزمان نے مجبور ہو کر بھوک ہڑتال کر دی۔
>
> صرف بنواری لال اس بھوک ہڑتال میں شریک نہیں ہوئے۔
>
> بھوک ہڑتال کی خبر چھپانے کے لیے سرکار نے ملزمان سے ان کے رشتہ داروں اور وکیلوں کی ملاقات پر پابندی عاید کر دی اور ملزمان کے ساتھ کھلانے پلانے کے لیے زبردستی بھی کی گئی۔ لیکن ملزمان اپنے فیصلے پر اَٹل رہے۔ آخر کار سرکار ہی کو جھکنا پڑا اور ملزمان کی شکایات دور کر کے ان کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ تب کہیں جا کر بھوک ہڑتال ختم ہوئی''۔

باب چہارم

مقدمہ کا فیصلہ اور سزائیں

۲۱؍ مئی ۱۹۲۶ء کو سیشن کورٹ میں مقدمہ کی پہلی پیشی ہوئی تھی۔ اور مارچ ۱۹۲۷ء کے اواخر تک تقریباً ایک سال یہ مقدمہ چلتا رہا۔ ۶؍ اپریل ۱۹۲۷ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانا تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پولیس کی گاڑی ملزمان کو لے کر عدالت کے احاطے میں پہنچ کر رُکی۔ یکے بعد دیگرے ملزمان گاڑی سے اترے اور

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

کے ولولہ انگیز رجز سے فضا گونج اٹھی۔ تمام ملزمان دو دو کی قطار میں آگے پیچھے سر اُٹھائے، سینہ تانے مسلح پولیس کے پہرے میں مستانہ وار آگے بڑھے۔ ان کی پیشانیوں پر تھکن کے نشان ملک اور قوم کی خوش قسمتی کی علامت بن کر چمک رہے تھے۔ عدالت میں پہنچے تو بندے ماترم کے ترانے سے عدالت کے درودیوار گونج اُٹھے۔

اس روز پولیس کا بطور خاص انتظام کیا گیا تھا اور عام دنوں کے مقابلے میں پولیس کی تعداد کو بہت بڑھا دیا گیا تھا، عدالت کے اندر، باہر برآمدے میں مسلح پولیس کے نوجوان مستعد کھڑے تھے اور عدالت کی عمارت کے چاروں طرف گھوڑ سوار مسلح پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔

سزاؤں کا اعلان :

پنڈت جگت نرائن مُلّا اس روز عدالت میں موجود نہیں تھے۔ ملزمان کو عدالت کے فیصلے کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ ان پر کسی قسم کا خوف یا ہراس بھی طاری نہیں تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے اور ان کے چہروں سے ان کے دلوں کا اطمینان و سکون جھلک رہا تھا۔ چترویدی صاحب لکھتے ہیں :

"فیصلہ بہت طویل تھا۔ جج صاحب چاہتے تھے کہ ملزمان اگر اپنے کیے پر اظہار افسوس کریں تو ان کی سزاؤں میں رعایت کر دی جائے لیکن ملزمان کے لیے ایسا کرنا ان کا اپنے اصول اور مقصد سے ہٹ جانا تھا۔ (انھوں نے اپنے جرم اور کیے پر معذرت اور اظہار افسوس سے انکار کر دیا) لہٰذا سزائیں سنائی جانے لگیں۔ ملزمان پر ۱۲۰اب اور ۳۹۶ وغیرہ دفعات لگائی گئی تھیں۔ جن کے مطابق ملزمان کو حسب ذیل سزائیں ملی تھیں :

۱- پنڈت رام پرشاد بسمل	:	دو دفعات کے تحت عمر قید بہ عبور دریائے شور اور تیسری دفعہ کے تحت سزائے موت
۲- راجندر لاہڑی	:	دو دفعات میں عمر قید بہ عبور دریائے شور اور تیسری دفعہ کے تحت سزائے موت
۳- روشن سنگھ	:	پہلی دو دفعات میں ۵،۵ سال کی قید اور تیسری دفعہ کے تحت سزائے موت
۴- سچیندر ناتھ سانیال	:	عمر قید بہ عبور دریائے شور
۵- من متھ ناتھ گپتا	:	چودہ سال قید
۶- گوبند چرن کار	:	دس سال قید
۷- مکندی لال	:	دس سال قید
۸- جوگیش چندر چٹرجی	:	دس سال قید
۹- راج کمار سنہا	:	دس سال قید
۱۰- رام کشن کھتری	:	دس سال قید
۱۱- سریش بھٹاچاریہ	:	سات سال قید
۱۲- بشنو (بشن) شرن ولیس	:	سات سال قید
۱۳- پریم کشن کھنا	:	پانچ سال قید
۱۴- پورن دیش چٹرجی	:	پانچ سال قید

(۱) اس سلسلے میں سرکاری سورسز سے ماخوذ ایک اور فہرست ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔ اس میں تفصیلیں اور صراحتیں ہیں۔ اس سے بعض ناموں کی الجھن بھی دور ہو جاتی ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

۱۵- رام دلارے	:	پانچ سال قید
۱٦- رام ناتھ	:	پانچ سال قید
۱۷- بنواری لال (وعدہ معاف گواہ)	:	ہر دفعہ کے تحت ۵،۵ سال کی قید
۱۸- بھوپندر سانیال (وعدہ معاف گواہ)	:	ہر دفعہ کے تحت ۵،۵ سال کی قید (۱)

ملزمان کا ردِّعمل :

جس وقت فیصلہ سنایا جارہا تھا، وہ منظر بڑا اندوہناک تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کسی ملزم کی پیشانی پر بل آیا ہو۔ سب کے چہروں سے اطمینان و سکون عیاں تھا اور مسکراتے ہوئے فیصلہ سنتے رہے۔ فیصلہ سنایا جاچکا تو سب سے چھوٹے اور کم سزا پانے والے آگے بڑھے اور سب سے پہلے پنڈت رام پرشاد بسمل کے پیروں تلے کی دھول لے کر اپنی پیشانی پر لگائی۔ پھر انھوں نے دوسرے سزائے موت پانے والے ارکان روشن سنگھ اور راجندر لاہڑی کے پاؤں چھوئے۔ چوں کہ یہ معلوم تھا کہ تمام ملزمان ایک جگہ نہیں رکھے جائیں گے۔ اس لیے سب ایک دوسرے سے گلے ملے اور جب عدالت سے چلنے لگے تو آخری بار سب نے مل کر "بندے ماترم" کا نعرہ لگایا۔ سب سے آگے پنڈت رام پرشاد بسمل تھے۔ ان کے پیچھے موت کی سزا پانے والے دوسرے ملزمان اور ان کے پیچھے دیگر ملزمان تھے۔ بسملؔ کی زبان سے اس وقت یہ شعر فضا میں گونج رہا تھا :

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اسی رات تمام اسیروں کو بریلی، فتح گڑھ، نینی، گونڈا وغیرہ کی بارہ مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا"۔

ان ملزمان کے علاوہ سیٹھ دامودر سروپ کو بیماری کی وجہ سے ضمانت پر اور مچلکے لے کر پہلے ہی رِہا کر دیا گیا تھا۔ چندر شیکھر آزاد اور ستیلا سہائے کا نام بھی سزا پانے والوں میں نہیں ہے۔ آزاد تو معلوم ہے کہ پولیس کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے اور ستیلا سہائے کو عدم

ثبوت کی بنا پر بری کر دیا گیا تھا۔ پھانسی پانے والے ملزمان کی سزا کے لیے ۱۶؍ ستمبر ۱۹۲۷ء تاریخ مقرر کی گئی تھی۔

کیس کے خاص ملزمان :

اس سلسلے میں ایک اہم بحث یہ رہ جاتی ہے کہ کاکوری ڈکیتی کیس کے دس اصل ارکان کون تھے۔ جنھوں نے واقعی یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، وہ خاص دس ارکان یہ تھے :

"رام پرشاد بسمل، راجندر لاہڑی، روشن سنگھ، اشفاق اللہ خاں،
سچیندر ناتھ بخشی، چندر شیکھر آزاد، بنارسی لال، بنواری لال، بھوپیندر سانیال،
اور پریم کشن کھنا"۔

آخر الذکر کے سوا تمام ارکان کی نشاندہی مختلف بیانات و مضامین سے ہو جاتی ہے، جو اس ڈکیتی کے بعض ارکان یا ان سے قریبی تعلق رکھنے والے اشخاص کے نظر سے گزرے ہیں۔ اس سلسلے کا آخر الذکر نام اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر لکھا ہے۔ یہ بات مجھے اپنے چچا مولوی محمد عبدالہادی خاں (آف شاہ جہاں پور) سے معلوم ہوئی تھی۔ پریم کشن کھنا کو میں نے بار بار دیکھا ہے۔ وہ میرے چچا کے دوست تھے۔ میرے چچا کی بہادر گنج شاہ جہاں پور میں کتابوں کی دکان تھی اور کھنا جی اکثر ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میرے چچا نے مجھے بتایا تھا کہ کھنا جی کاکوری کیس کے ارکان میں سے تھے اور وہ اس ڈکیتی میں شریک تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

ملزمان مختلف جیلوں میں :

جب تک تمام ملزمان لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں تھے، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور کھانے پینے میں ان کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ لیکن، جب انھیں مختلف جیلوں میں الگ الگ کر دیا گیا تو پولیس نے اپنی عادت اور روایت کے مطابق ان پر سختیاں شروع کر دیں۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی جان کی بازیاں لگا دی ہوں اور چودہ سال، دس سال اور سات سال کی سزا بھگت رہے ہوں، جنھوں نے کسی قسم کی رعایت کے لیے حاکم عدالت انگریز ہملٹن بہادر سے درخواست کرنا اور سزا میں کمی کی توقع میں معذرت کے لیے زبان ہلانی گوارا نہ کیا ہو، وہ جیلر صاحب کو کب خاطر میں لاتے۔ وہ نہ صرف سیاسی بلکہ انقلابی تھے، اخلاقی مجرم نہ تھے وہ جیلر صاحب یا جیل خانہ جماعت

کے کسی حاکم کے رعب میں کب آنے والے تھے۔ چنانچہ ایک جیل میں بھوک ہڑتال کی گئی اور جب یہ خبر جیل سے باہر پہنچی اور دوسرے جیل والوں کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بھی بھوک ہڑتال کر دی۔ اس طرح جہاں جہاں جیلوں میں کاکوری کیس کے قیدی تھے، ان تمام جیلوں میں بھوک ہڑتال کر دی گئی اور جوں جوں یہ خبریں عوام تک پہنچیں ملک میں کھل بلی مچ گئی۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

"جب مقدمہ ختم ہو گیا تو حکومت اور جیل کے عملے نے ان لوگوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ جب یہ خبر جیل کے باہر پہنچی تو تمام صوبے میں کھل بلی مچ گئی۔ کونسل کے چند ممبران نے جو جیل کے وزیر بھی تھے، ان لوگوں سے ملنا چاہا تو انھیں بھی ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جس کے باعث ایک ممبر نے تو استعفیٰ دے دیا۔ گنیش چندر ودیارتھی جی نے ہوم منسٹر آنریبل محمد احمد سعید خاں نواب چھتاری کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی، جس میں ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ان لوگوں کے ساتھ سیاسی قیدیوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن جب انھوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا تو ودیارتھی جی نے ملزمان سے ملنے کی اجازت مانگی اور کہا کہ میں ملزمان کو اس بات پر راضی کر لوں گا کہ وہ اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ اس پر بھی پہلے تو اجازت دینے میں پس و پیش کیا گیا۔ لیکن پھر انھیں ملزمان سے ملنے کی اجازت مل گئی۔ انھوں نے بریلی، فتح گڑھ، نینی وغیرہ کی جیلوں میں جا کر بہ مشکل تمام ان لوگوں کو بھوک ہڑتال ختم کرنے پر راضی کیا اور انھیں آسانیاں دلانے کی کوشش کرنے لگے۔"

چند دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس میں، جو گوہاٹی میں سری نواس آینگر کی صدارت میں ہوا تھا، کاکوری کیس کے قیدیوں کے ساتھ حکومت اور جیل کے حکام کے غیر قانونی اور غیر انسانی رویے کے خلاف ایک احتجاجی ریزولیوشن پاس کیا گیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ پھر ۲۲ جون ۱۹۲۷ء کو حکومت یوپی کی کونسل میں بھی سوراجیوں کی طرف سے اس معاملے کو اٹھایا گیا، لیکن صوبے

کا گورنرٹس سے مس نہ ہوا"۔

فیصلے کے خلاف اپیل :

سیشن کورٹ کے بعد چیف کورٹ میں اپیل کرنے کا حق ملزمان کو حاصل تھا۔ چنانچہ ملزمان کی طرف سے اپیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن بنواری لال، بھوپیندر ناتھ سانیال اور سچیندر ناتھ سانیال نے جن میں سے اوّل الذکر دو افراد نے اقبالِ جرم کر لیا تھا، اپیل کرنا اپنے حق میں مفید نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ اس فیصلے میں شریک نہیں ہوئے۔ باقی تمام ممبران نے اپیل دائر کر دی۔

۱۸ر جولائی سے اپیل کی سماعت شروع ہوئی۔ حکومت نے اپنی پیروی کے لیے پنڈت جگت نرائن مُلّا ہی کو منتخب کیا۔ جنھوں نے سیشن کورٹ میں نہایت قابلیت کے ساتھ استغاثے کی پیروی کی تھی اور سازش کے ملزمان کو قرار واقعی سزا دلانے میں حکومت کی قابلِ تعریف خدمت انجام دی تھی۔ ملزمان کے کیس کی پیروی کے لیے لچھمی شنکر مصر، ایچ سی دت اور جے کرن ناتھ مصر کو مقرر کیا گیا۔ ملزمان کی خواہش تھی کہ ان کے لیے اچھے وکیلوں کو مقرر کیا جائے، لیکن گورنمنٹ نے انھیں سزا دلانے کے لیے اس مقدمے پر دو لاکھ روپے خرچ کیے تھے۔ گورنمنٹ نے ملزمان کو اپیل کا حق ضرور دیا تھا، لیکن انھیں جو سزا دلائی گئی تھی، اس میں کوئی تبدیلی اس کی پالیسی اور طے شدہ منصوبے کے خلاف تھی۔ گورنمنٹ ان کے لیے قابل وکیلوں کو مقرر کر کے اپنی پالیسی اور اپنے منصوبے کو تہس نہس کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لیے ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا گیا۔

پنڈت رام پرشاد بسمل نے جب یہ رنگ دیکھا تو اپنے مقدمے کو خود لڑنے کا فیصلہ کیا اور درخواست دی کہ انھیں اپنے مقدمے کی خود پیروی کی اجازت دی جائے۔ لیکن چیف کورٹ نے ان کی اس درخواست کو بھی ردّ کر دیا اور جیسا کہ سرکار نے چاہا تھا، مقدمے کی سماعت کی گئی اور پنڈت بنارسی لال چترویدی کے بقول "سوائے دو حضرات کے تمام لوگوں کی سزائیں نہ صرف بحال رہیں بلکہ سزاؤں میں اضافہ کر دیا گیا"۔

ملک میں بے چینی :

اس فیصلے کے خلاف نہ صرف صوبہ یوپی میں بلکہ پورے ملک کے حریت پسند

حلقوں میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ ٹھاکر من جیت سنگھ ممبر لیجس لیٹو کونسل نے اسمبلی میں اس مفہوم کا ایک ریزولیوشن پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ پھانسی کی سزا پانے والوں کی سزائیں کم کر کے انھیں عمر قید بہ عبور دریائے شور کی سزا دی جائے"۔ لیکن پھانسی کی تاریخ ۱۶/ستمبر ۱۹۲۷ء مقرر ہوئی تھی اور اس درمیان میں کونسل کا اجلاس نہیں ہو رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں اجلاس سے قبل ہی ملزمان کو پھانسی پر نہ لٹکا دیا جائے۔ اس لیے ٹھاکر من جیت سنگھ نے اسمبلی کے ارکان کو بھی ایک خط میں توجہ دلائی کہ وہ کاکوری کیس کے ملزمان کی سزامیں تخفیف کے لیے گورنر کو لکھیں اور کونسل کے آئندہ اجلاس تک سزا دینے کے فیصلے پر عمل درآمد کو روک دیا جائے تاکہ وہ اپنا ریزولیوشن کونسل میں پیش کر سکیں۔

ٹھاکر من جیت سنگھ کے خط سے متاثر ہو کر یا اپنے طور پر ہی فیصلہ کر کے چند ممبران نے گورنر یوپی کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی کہ ملزمان کی نوعمری اور نوجوانی پر رحم کھاتے ہوئے ان کی سزاؤں میں تخفیف کر دی جائے۔ چوں کہ گورنر کا دورِ حکومت ختم ہو رہا تھا، اس لیے ممبران کو امید تھی کہ جاتے ہوئے گورنر صاحب یہ کارِ نمایاں، جس میں ان کی نیک نامی تھی، ضرور انجام دے جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے کونسل کے ان معزز ممبروں کی اس عرض داشت کو رد کر کے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

> "اسی قسم کی ایک رحم کی درخواست اسمبلی اور اسٹیٹ کونسل کے ممبروں نے وائسرائے کی خدمت میں بھی پیش کی تھی، لیکن اس نے بھی اس درخواست کو نامنظور کر دیا"۔

ان کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ ۱۶/ستمبر کی تاریخ جو پھانسی کے لیے مقرر کی گئی تھی، گزر گئی اور نئی تاریخ ۱۹/اکتوبر بھی گزر گئی۔ اب چند دن بعد صوبائی کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ۲۹/اکتوبر کو اجلاس شروع ہوا تو ٹھاکر من جیت سنگھ نے مجوزہ ریزولیوشن پیش کیا اور اس کی مدلل طور پر وضاحت اور وکالت کی۔ بحث کے دوران کانگریسی ممبر گوبند ولبھ پنت نے اپنی تقریر میں حکومت کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس پر سخت تنقید کی۔ لیکن سرکار ٹس سے مس نہ ہوئی۔

کھیل ختم ہو گیا:

پنڈت بنارسی داس چترویدی جی لکھتے ہیں :

"اب سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ ۱۷/ دسمبر کو پنڈت گوبند ولبھ پنت نے پھر دوبارہ کونسل میں اس معاملے کو اٹھایا لیکن بے سود رہا۔ اسی روز صبح کو راجیندر لاہڑی گونڈہ جیل میں تختہ دار کی تشنہ لبی کو اپنے خون سے بجھا چکے تھے۔ دو روز بعد ۱۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو صوبے کے تین دوسرے ہونہار نوجوانوں — پنڈت رام پرشاد بسمل، روشن سنگھ اور اشفاق اللہ خاں کو بھی صوبے کی مختلف جیلوں میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔

پھانسی کے دن سارے ملک میں اظہار غم کیا گیا۔ لوگوں نے روزے رکھے، تعزیتی محفلیں منعقد کیں، بعض اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے بھی روزہ رکھا۔ اسلامی اور عربی مدارس کے طلبہ نے بھی روزہ رکھا اور قرآن خوانی کی۔ لوگوں کے دلوں پر غم واندوہ کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ملک میں جہاں جہاں تعزیتی جلسے کیے گئے وہاں گورنمنٹ کی مذمت کے ریزولیوشن بھی پاس کیے گئے۔ لیکن جو بات ہو چکی تھی اور تاریخ میں جو فیصلہ کیا جا چکا تھا اور جو حادثہ پیش آ چکا تھا۔ اب اسے بدلنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ملک کی آزادی کی تاریخ کو جن شیدائے وطن کے خون کی سرخی نے رنگین اور دیدہ زیب و دلفریب بنایا تھا، ہم انھیں اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں"۔

ملزمان کی سرکاری فہرست

KAKORI CASE

Offences

1. Conspiracy 2.Bamrauli docoity
3. Bichpuri docoity 4.Dawarkapur docoity
5. Kakori Train docoity

ACCUSED

Name	District	Province	antences
Ramparshad Bismil	Shahjahanpur	U.P	Hanged
Ashfaqullah Khan	,,	,,	,,
Rajendra Nath Lahiri	Banaras & Pubna	U.P. & Bengal	
Roshan Singh	Shahjahanpur	U.P	,,

Name	*District*	*Province*	*Santences*
Jogesh Chandra	Dacca	Bengal	Transportation of life
Sachindra Nath Bakhshi	Banaras & Jhansi	U.P	,, ,,
Sachindra Nath Sanyal	Banaras & Allahabad	U.P	,, ,,
Mukundi Lal	Etawah	U.P	,, ,,
Govind Charan Karalies D.N. Chaudhary	Dacca	Bengal	,, ,,
Manmotho Nath Gupta	Banaras	U.P	14 years R.I.
Raj Kumar Sinha	Cawnpore	U.P	10 ,, ,,
Ram kishan Khattri	Chanda	C.P	10 ,, ,,
Suresh Chandra Bhattacharia	Cawnpore & Banaras	U.P	10 ,, ,,
Vishnu Sharan Dublish	Meerat	U.P	10 ,, ,,
Banwari Lal	Rac Bureh	U.P	5 ,, ,,
Bhupendra Nath Sanyal	Banaras & Allahabad	U.P	5 ,, ,,
Prem Kishan Khanna	Shahjahanpur	U.P	5 ,, ,,

Ram Dulare Trivedi	Cawnpore	U.P	5	,,	,,
Pranawesh Kumar Chatterji	Jublepore	U.P	4	,,	R.T
Ram Nath Pande	Banaras	U.P	3	,,	,,

Approvers

Banarasi Lal	Shahjahanpur	U.P
Indu Bishan Mitra	,,	U.P

Absconding

Chandra Shekhar Azad	Banaras	U.P

باب پنجم

کاکوری کیس اور اشفاق اللہ خاں

(۱)

روپوشی، گرفتاری اور اقبالِ جرم

اشفاق اللہ خاں کی روپوشی :

شاہ جہاں پور پولیس کی روش پہنچی۔ اشفاق اللہ خاں کو چوں کہ پہلے سے اندازہ تھا کہ دیر سویر پولیس ضرور آئے گی، اس لیے وہ چوکنّے تھے۔ انھیں اپنے ذرائع سے بھی معلوم ہو گیا کہ پولیس انھیں گرفتار کرنے آ رہی ہے۔ وہ فوراً گھر سے نکلے اور شہر کے باہر کھیتوں میں چلے گئے۔ پولیس نے ان کے گھر پر چھاپہ مارا۔ لیکن نہ اشفاق اللہ خاں اس کے ہاتھ آئے، نہ ان کے گھر کی تلاشی میں کوئی ایسی چیز ملی جو جرم میں ان کی شرکت کا ثبوت بنتی۔ سچیندر ناتھ بخشی لکھتے ہیں :

> "اشفاق اللہ خاں اپنے گھر سے صرف آدھے میل کے فاصلے پر گنے کے کھیت میں چھپے رہے۔ رات کو انھیں وہیں کھانا پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس طرح انھوں نے دو تین دن بسر کیے۔ ان کے گھر کی تلاشی کے وقت ان کے بھائی کی بندوق بھی ضبط کر لی گئی تھی۔
>
> جب انھوں نے دیکھا کہ شاہ جہاں پور کے سب ساتھی پکڑے گئے ہیں تو وہ شاہ جہاں پور کو خیر باد کہہ کے دوسرے شہروں میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن وہ جہاں بھی گئے، انھیں کوئی ساتھی نہیں ملا۔ پہلے ہی سب غائب ہو چکے تھے۔ وہ بنارس بھی گئے۔ بنارس یونیورسٹی میں ری پبلکن ایسوسی ایشن کے کئی ممبر تھے، جو اشفاق اللہ خاں سے واقف تھے۔ ان کے ذریعے سے وہ بہار چلے گئے۔ وہاں ایک ساتھی

کے توسط سے ڈالٹین گنج (ضلع پلامو) میں ایک ایگز یکیٹو انجینئر کے آفس میں ملازمت کرنے لگے۔

جہاں انھوں نے اپنا نام مسلمان بدل کر ایک ہندوانہ قسم کا نام اختیار کر لیا تھا اور اپنے آپ کو متھرا کے ایک کایستھ خاندان کا فرد ظاہر کیا تھا اور بہ ظاہر ایک ہندو کے روپ میں انھوں نے آٹھ دس مہینے تک ملازمت کی۔

اتفاق سے انجینئر شاعری کا شوقین تھا اور تھوڑی بہت وہ شاعری کرتا بھی تھا۔ ایک مشاعرے میں اشفاق اللہ خاں کا کلام سن کر وہ ان کی بہت عزت کرنے لگا۔ اور خوش ہو کر اس نے اشفاق اللہ خاں کی تنخواہ میں بیس روپے کا اضافہ کر دیا۔

ڈالٹین گنج کی ملازمت اور قیام کے زمانے میں انھوں نے بنگلہ زبان بھی سیکھ لی تھی اور کچھ بولنے بھی لگے تھے۔ انھیں بنگلہ زبان کے کچھ گانوں کی مشق بھی ہو گئی تھی اور اس طرح بنگلہ زبان سے متعارف ہونے کے باعث وہ ایک مسلمان اور پٹھان ہوتے ہوئے بھی ہندو ثقافت کی تہہ تک پہنچ گئے تھے"۔

بھاگلپور اور ہزاری باغ میں روپوشی :

ڈالٹین گنج میں ان کے قیام کے دن مطالعے، سیر و شکار اور شعر و شاعری کے مشغلے میں بسر ہوئے۔ ان کے دوست سچیندر ناتھ بخشی بھی ان دنوں پلامو سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر بھاگلپور اور ہزاری باغ میں تھے۔ لیکن انھیں ایک دوسرے کی کوئی خبر نہ تھی۔ ان دونوں کی ملاقات ۱۱/اگست ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ سے جدا ہونے کے بعد فروری ۱۹۲۷ء میں اس وقت ہوئی جب دونوں گرفتاری کے بعد لکھنؤ جیل میں اکٹھا ہوئے۔ بخشی جی بیان کرتے ہیں :

"میں ان دنوں پلامو سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر بھاگلپور اور ہزاری باغ میں رہا، لیکن میرے تعلقات اشفاق اللہ خاں سے قائم نہ ہو سکے۔ کیوں کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا پتا نہ تھا۔ نہ مجھے معلوم تھا کہ اشفاق اللہ خاں میرے اتنے نزدیک ہیں، نہ اشفاق اللہ خاں جانتے تھے کہ میں یہاں

بھاگلپور میں ہوں۔ یہ باتیں تو ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں۔ جب ہم دونوں گرفتاری کے بعد لکھنؤ جیل میں ملے"۔

بعد کے حالات کے بارے میں بخشی جی بیان کرتے ہیں :

"اشفاق اللہ خاں ڈالٹین گنج کی زندگی سے بہت جلد پریشان ہو گئے اور انھوں نے کسی غیر ولایت۔ میں جانے کا قصد کر لیا۔ ڈالٹین گنج سے وہ دہلی پہنچے اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بہانے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے"۔

ایام فراری میں وہ کچھ دن کے لیے لاہور بھی گئے تھے، جہاں ان کی ملاقات مشہور انقلابی کیدار ناتھ سہگل سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ملک سے فرار ہونے میں ان کی مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

"پنجاب کے مشہور انقلابی کیدار ناتھ سہگل نے اشفاق اللہ خاں سے جب کہ وہ ایام فراری میں لاہور میں مقیم تھے، کہا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو سرحد پار کرانے کا انتظام کرا سکتے ہیں۔ سرحد کے ایک مشہور لیڈر نے ہم سے اس کا وعدہ کیا ہے"۔

اس پر اشفاق اللہ خاں نے برجستہ جواب دیا تھا :

میں ہندوستان سے بھاگ کر باہر جانا نہیں چاہتا، بھئی! کسی مسلمان کو بھی پھانسی پر چڑھنے دو"۔

اور وہ بہت شان کے ساتھ پھانسی پر چڑھ گئے۔

ملک سے باہر فرار سے انکار :

میرے چچا مرحوم مولانا عبدالہادی خاں فرمایا کرتے تھے کہ باغستان میں اسمس کے مقام پر مقیم مجاہدین کے رابطے بنگال و بہار سے لے کر یوپی، پنجاب و سرحد اور کابل تک موجود تھے اور ان کا ایک بین الممالک نظام قائم تھا اور لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس وقت دلی میں ایک صاحب موجود بھی تھے، جنھوں نے کہا تھا، تم میرے ساتھ چلو۔ لیکن اشفاق اللہ خاں اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ میرے چچا مرحوم کا خیال تھا کہ اس کی دو وجہیں تھیں۔

☆ پہلی وجہ تو انھوں نے یہ بتائی تھی کہ ان کا خون اپنے وطن کی سرزمین ہی پر کام آنے کے لیے جوش مار رہا تھا۔

☆ دوسری وجہ کے بارے میں انھوں نے فرمایا :

"دوسری وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ وہ بے مقصد اور محض جان بچانے کے لیے ملک سے باہر جانے پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے ایک مقصد آگیا تو وہ فوراً اس کے لیے آمادہ ہو گئے۔

یہ مقصد تھا افغانستان کے راستے ہندوستان کے انقلابیوں کے لیے اسلحہ کی فراہمی کا"۔

پنڈت چترویدی نے بھی اپنے مضمون میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا دلّی جانا اسی مقصد کے سلسلے میں تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

"وہ مختلف مقامات پر ہوتے ہوئے دلّی پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے کابل جانے اور وہاں سے اسلحہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا ایک بہانہ تھا۔ پاسپورٹ کا انتظام کرا رہے تھے کہ ایک شخص نے پولیس کو خبر کر دی اور وہ یکایک گرفتار کر لیے گئے"۔

گرفتاری :

دہلی میں ان کی گرفتاری کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز وہاں ان کے ایک ہم جماعت مل گئے، جو شاہ جہاں پور کے ایک پٹھان خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے اور ان دنوں وہ دلی میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ اشفاق اللہ خاں سے بہت تپاک سے ملے اور اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ اس روز انھوں نے وہیں ان کے ساتھ کھانا کھایا اور تقریباً گیارہ بجے رات کو اپنی قیام گاہ پر واپس آئے۔ دوسرے دن چار بجے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ کاکوری کے واقعے کے پورے ایک سال بعد ستمبر ۱۹۲۶ء میں پیش آیا تھا۔

اشفاق اللہ خاں کے اخلاق اور وضع داری نے ان ہم جماعت کا نام افشا کرنے کی اجازت نہ دی۔ بخشی جی نے بھی ان دوست اور ہم جماعت کا نام نہیں لکھا۔ بلا شبہ ہم اس اخلاق اور وضعداری کے قائل نہیں کہ کسی غدار قوم کے نام کا افشا نہ کیا جائے۔ لیکن آج پون

صدی کے بعد ان غدارِ وطن کا نام معلوم کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا لیکن ''قوت فروختند وچہ ارزاں فروختند'' کے مصداق یہ خدمت صرف دو ہزار روپے کی لالچ میں انجام دی گئی تھی، افسوس! سچیند رناتھ بخشی بیان کرتے ہیں :

''حکومت برطانیہ کی جانب سے اشفاق اللہ خاں کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپے کا انعام رکھا گیا تھا۔ اس انعام کے لالچ میں ان کے ایک ہم جماعت، ہم قوم اور ہم وطن نے انھیں گرفتار کرادیا۔ اشفاق اللہ خاں کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ ان کے ہم جماعت ہی کی غداری سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی''۔

اقبالِ جرم کرانے کی کوشش :

ستمبر ۱۹۲۶ء میں اشفاق اللہ خاں کو دلی میں گرفتار کرلیا گیا۔ لکھنؤ میں کاکوری سازش کا مقدمہ چل رہا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ فوراً اطلاع بھیجی گئی۔ حکومت خوش ہوگئی کہ سازش کیس کا ایک اہم ممبر گرفتار ہوا ہے۔ حکومت کی نظر میں ان کی گرفتاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دلّی سے انھیں لکھنؤ لانے کے لیے صرف پولیس پر اعتماد نہیں کیا گیا بلکہ کاکوری کیس کے اسپیشل مجسٹریٹ سید عین الدین کو بھیجا گیا، وہ انھیں پولس گارڈ کی نگرانی میں سکنڈ کلاس کے ایک ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں دلی سے لکھنؤ لے کر آئے۔ راستے میں انھیں بہلانے پھسلانے کی پوری کوشش کی گئی۔ انھیں ورغلانے کے لیے ہندو مسلم مسئلہ اٹھایا۔ ہندوؤں کے خلاف ان کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔ عین الدین نے ان کے ناصح مشفق بن کر انھیں ہندوؤں کے خلاف ورغلانے، سرکاری گواہ بن کر معافی حاصل کرنے اور اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے بڑے سبز باغ دکھائے، لیکن اشفاق اللہ خاں پر اس ننگِ قوم وملت کی باتوں کا ذرا اثر نہ ہوا۔ جگدیش چندر چٹرجی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

''اشفاق دلّی میں پکڑے گئے۔ کاکوری کیس کے اسپیشل مجسٹریٹ سید عین الدین صاحب انھیں ریزرو سیکنڈ کلاس میں بٹھا کر دلّی سے لکھنؤ لے جارہے تھے۔ اثنائے راہ میں اس ہوشیار اور قابل مجسٹریٹ نے بہت سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ ''صرف تم تنہا مسلمان ہو، جوان

ہندوؤں کے ساتھ پھانسی پر لٹکو گے۔ تم ان کا ساتھ چھوڑ دو، میں تمھیں بچالوں گا۔ اس کے علاوہ انھوں نے طرح طرح کے لالچ بھی دیئے۔ لیکن سید عین الدین کی یہ ساری کوشش رائیگاں گئی۔ اشفاق سب کچھ سننے کے بعد ایک ہی جواب دیتے تھے کہ چوں کہ میں تنہا مسلمان ہوں۔ اس لیے میری ذمہ داری اور بھی زیادہ ہے''۔

اشفاق اللہ خاں کی استقامت :

برٹش حکومت ان سے اقبال جرم کرا کے اور انھیں سرکاری گواہ بنا کے جو راز اُگلوانا اور ان سے جو کام لینا چاہتی تھی، وہ اس سے زیادہ اہم تھا کہ ایک مجرم کو معاف کر دیا جائے۔ سب سے بڑا مقصد اس کوشش کے پیچھے یہ تھا کہ مسلمانوں کو انقلابی تحریکات سے الگ رکھا جائے۔ اس لیے کہ وہ تحریک جہاد کے سلسلے میں انبالہ، لودھیانہ، صادق پور (پٹنہ) وغیرہ کے مقدمات میں دیکھ چکی تھی کہ انقلابی تحریکات میں مسلمان کیسے بے پناہ جری ثابت ہوئے تھے۔ نیز ریشمی رومال تحریک، تحریک ہجرت، تحریک خلافت، ترک موالات میں بھی دیکھ چکے تھے کہ ایثار و قربانی میں مسلمانوں کے ظرف کا پیمانہ کتنا بلند رہا۔ لیکن سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اشفاق اللہ خاں جس نے انقلاب واحتجاج کی روایت کو اتنا اونچا کر دیا تھا اور انقلابی تحریک میں مسلمانوں کے اعتماد کی ایک علامت بن کر نمود کیا تھا، اسے آزادیِ وطن کی تحریک سے غداری پر آمادہ کر کے غیر مسلم انقلابیوں میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مسلمان قوم نا قابل اعتماد ہے۔ وہ ملک و قوم کی آزادی کے معاملے میں مخلص نہیں، اسے ملک کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ہندوستان میں غیر ملکی قوت کی آلۂ کار ہے۔ اشفاق اللہ خاں اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ انھیں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا، وہ خوب جانتے تھے کہ اگر ان کے قدم ڈگمگا گئے تو مسلمانوں کی استقامت اور تحریکِ آزادی میں ان کے اخلاص سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اسی احساس ذمہ داری نے اور سیاسی شعور نے انھیں اس راہ اور ارادے میں ثابت قدم رکھا۔ حکومت پارٹی میں ان کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ ننگِ قوم و وطن عین الدین کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آئے۔ نہ پولیس اور سی آئی ڈی کے آفیسروں کی باتوں سے متاثر ہوئے، نہ ان کے وعدوں پر اعتماد کیا اور نہ حکومت کے لوگوں کی طرف سے دکھائے جانے

والے سبز باغوں کے فریب میں مبتلا ہوئے اور نہ مستقبل کے سراب کے فریب میں مبتلا ہوئے۔

استعمار دشمنی کی اعلیٰ مثال :

برٹش استعمار اور انگریزی حکومت کے خلاف ان کے خیالات کی پختگی اور شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دیسی ہندو راج کو گوارا کر لینے کے لیے تیار تھے لیکن بدیسی حکومت کو وہ کسی قیمت پر برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

"گرفتاری کے بعد جب سی آئی ڈی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر تصدق حسین آپ کو سمجھانے آئے اور انھوں نے کہا کہ رام پرشاد تو ہندو ہے، تم مسلمان ہو کر اس کافر کے "ہندو راج" بنانے میں کیوں مدد کر رہے ہو؟ تو آپ نے خفا ہو کر کہا تھا : آپ مہربانی کر کے میرے پاس سے چلے جائیں۔ میں رام پرشاد جی کی برائی نہیں سننا چاہتا۔ اور اس انگریزی حکومت سے تو اگر ہندو حکومت بھی قائم ہو جائے تو بہتر ہے۔ آخر وہ ہو گی تو ہندوستانیوں کی"۔

جب سی آئی ڈی اپنے ان حربوں اور ہتھکنڈوں میں ناکام ہو گئی تو ان کے رشتہ داروں سے ان پر دباؤ ڈالوایا گیا۔ انھیں ان کی بوڑھی ماں کی زندگی کا واسطہ دیا گیا۔ انھیں ان کے خاندان کے حالات میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا، لیکن اس پختہ فکر و پختہ کار محب وطن نوجوان پر ان حربوں کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے گرد جو جال بُنا جا رہا تھا وہ اسے اپنی استقامت اور پختہ فکری کی بدولت توڑ دیتا تھا۔ اس شاہین بلند پرواز کو زیر دام لانے کے لیے ہزاروں جتن کیے گئے لیکن کسی دام کا کوئی حلقہ اس کے پر و بال کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ وہ ہر دام سے نکلتا رہا۔ اس ذوق حریت اور استقامت عمل کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی رہی۔ وہ اپنی فکر کی پختگی اور سیرت کی محکمی غلامی کی زندگی اور استعمار کی قوت پر نظر حقارت ڈالتا اور زبان حال سے کہتا رہا :

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

وہ اپنی فکر و سیرت، استقامتِ عمل اور عزیمت دعوت میں اتنا بلند ہو گیا جتنا کسی زعیمِ قوم اور نیتا کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس پر نہ صرف مسلمان، ہندو بلکہ ہندوستان میں رہنے والی ہر قوم اور پورا ملک فخر کر سکتا ہے۔

استقامت کی ایک اعلیٰ مثال :

بعض اوقات بہادر سے بہادر انسان بھی جس کا عزم پہاڑوں سے زیادہ پختہ و بلند، جس کا حوصلہ پہاڑی دریاؤں سے زیادہ تیز و تند اور جس کی ہمت سمندر سے زیادہ زور آور ہو، خاندان کے رسم و رواج کی معمولی ڈوریوں اور بندشوں کو نہیں توڑ سکتا۔ خاندان کے علایق اسے اتنا کمزور اور ایسا بے دست و پا بنا دیتے ہیں کہ وہ جنبش نہیں کر سکتا۔ اشفاق اللہ خاں کے عزائم اور استقامت کے مقابلے میں بھی یہ ہتھیار استعمال کیا گیا۔ لیکن اس جواں مرد اور محبّ وطن کے عزم و سیرت کی نمود نے ثابت کر دیا کہ اس کا مقام اس سے بہت بلند ہے۔ اس کے بارے میں جو بلند سے بلند اندازے اور جو اونچے سے اونچے تخمینے لگائے گئے تھے، وہ اس کی عزیمت اور استقامت کے مقابلے میں نہ صرف بہت پست بلکہ شرمناک تھے۔ کیا اس صاحبِ عزیمت کے ان الفاظ کی بلندیوں کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے، جو انھوں نے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کی نصیحتوں کے جواب میں کہے تھے؟ جگدیش چندر چٹرجی لکھتے ہیں :

> "ان کے خاندان کے بڑے آدمی بھی ان کے پیچھے لگائے گئے تھے۔ وہ ان سے بھی یہی کہتے رہے کہ میں تنہا مسلمان ہوں اور پٹھان ہوں۔ اگر میں نے کوئی گڑبڑ کی تو ساری مسلم قوم پر حرف آئے گا۔ اس لیے مجھے باعزت مر مٹنے دیجیے"۔

بلا شبہ وہ باعزت جیا اور باعزت مرا۔ اس کی زندگی پاک و صاف تھی، اس کی موت بھی مبارک تھی۔ اس کی شخصیت پر جو کسی نے بزدلانہ اور جفاکارانہ بیان دلوا کر کیچڑ اُچھالنی چاہی تھی، وہ اس سے محفوظ رہا۔ اس نے اپنی موت سے نہ صرف وفاداری بہ شرط استواری کی رسم کو زندہ کر دیا اور اس کی موت نے آزادیٔ وطن کی تاریخ میں مسلمانوں کا سر بھی فخر سے بلند کر دیا۔

باب ششم

مقدمہ کی کارروائی

سیرت کی جھلکیاں، جیل کی زندگی اور سزائے موت

ستمبر ۱۹۲۶ء میں اشفاق اللہ خاں کی دہلی میں گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ اس کے تین چار ماہ کے بعد نومبر یا دسمبر کے شروع میں بھاگلپور سے سچیندر ناتھ بخشی کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں بھی سنٹرل جیل لکھنؤ لایا گیا، جہاں اشفاق اللہ خاں قید تھے۔ شروع میں انھیں علیحدہ بارک کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ اشفاق اللہ خاں کو یورپین وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ اس دوری اور علیحدگی کی وجہ سے دونوں میں رابطہ قائم ہونے میں تین چار روز لگ گئے۔

اس وقت تک اشفاق اللہ خاں کا کیس سیشن سپرد ہو چکا تھا۔ لیکن جب بخشی جی بھی گرفتار ہو گئے تو اشفاق اللہ خاں کا مقدمہ روک دیا گیا اور بخشی جی کے مقدمے کو جلد از جلد سیشن سپرد کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تاکہ دونوں مقدموں کی کارروائی ایک ساتھ چل سکے۔ اس وقت کاکوری کیس کے دوسرے قیدی لکھنؤ کی ڈسٹرکٹ جیل میں تھے اور ان کا مقدمہ الگ چل رہا تھا اور مقدمے کی کارروائی بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اشفاق اللہ خاں اور سچیندر ناتھ بخشی چوں کہ بعد میں گرفتار ہوئے تھے، اس لیے ان کے مقدمات الگ چل رہے تھے۔ اب بخشی جی کے مقدمے کی کارروائی روزانہ صبح دس بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک ہونے لگی اور جلد از جلد کارروائی کو نمٹا کر ڈیڑھ دو مہینے کے اندر ۲۴/ مارچ ۱۹۲۷ء سے دونوں مقدمے سیشن میں ایک ساتھ چلنے لگے اور دونوں کو ایک ساتھ جیل لے جایا جانے لگا۔ اس کے بعد بخشی جی کو بھی بارک کی کوٹھری سے یورپین وارڈ میں اشفاق اللہ خاں کے ساتھ رکھا گیا۔

جیل میں اشفاق - بخشی ملاقات :

جیل میں آنے کے بعد اگرچہ دونوں میں رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جیل میں اشفاق اللہ خاں سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں بخشی جی کہتے ہیں :

"جیل سے عدالت تک جانے سے قبل ہمارے پانوؤں میں بیڑیاں ڈالی دی جاتی تھیں۔ جب میں آفس میں پہنچا اور میرے پاؤں میں بیڑی ڈالی جانے لگی تو میں نے دیکھا کہ اشفاق بیڑی پہنے ہوئے جیلر کے پاس کھڑے اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے انجان بنے رہے۔ اس وقت جیل کا کل اسٹاف سب جیلر، آفس جیلر، ڈپٹی جیلر اور کلرک صاحبان آفس میں جمع تھے۔ وہ ہماری پہلی ملاقات کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ جب میرے پاؤں میں بیڑی ڈالی جا چکی تو آفس جیلر نے کہا، بخشی جی ذرا ادھر آیئے! جب میں قریب پہنچا تو اشفاق اللہ خاں نے تپاک سے کہا : اچھا آپ ہیں بخشی جی؟ میں نے اشفاق اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آفس جیلر سے پوچھا : آپ کون ہیں؟ آفس جیلر نے کہا : یہی تو اشفاق اللہ خاں ہیں۔ یہ سن کر ہم دونوں نے بڑے جوش سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اسی وقت چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں اور سب کہنے لگے : ہم سب یہی 'بھرت ملاپ' دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

دراصل ہم دونوں میں پہلے ہی یہ بات طے ہو چکی تھی کہ یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ ہم ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے ہمارے خلاف اثر پڑ سکتا تھا اور حکومت کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا کہ ہم دونوں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔

اس کے بعد مجھے بھی یورپین وارڈ میں منتقل کر دیا گیا اور مقدمے کا فیصلہ ہونے کی تاریخ تک دونوں ایک ساتھ ہی رہے"۔

ڈیفنس کمیٹی کا قیام :

کاکوری کیس چوں کہ ایک غیر معمولی نوعیت کا مقدمہ تھا، اس لیے اس کی پیروی کے لیے وکلا نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کر دی تھی۔ جس کے سربراہ کرپا شنکر ہجیلا کی یادداشت کے مطابق گنیش شنکر ودیارتی تھے۔ ان کی نگرانی میں انھی کی ہدایات کے مطابق ملزمان کی پیروی کی جا رہی تھی۔ پیروی کرنے والے وکلا میں لکھنؤ کے فاضل اور بے باک ایڈووکیٹ چندر بھان گپتا بھی تھے۔ بعد میں ان کے کہنے پر کرپا شنکر ہجیلا ایڈووکیٹ بھی ڈیفنس کمیٹی میں شامل ہو گئے اور اشفاق اللہ خاں کے وکیل مقرر ہوئے۔ اشفاق اللہ خاں کے عزیزوں کی رائے تھی کہ اس مقدمے کی پیروی کے لیے کسی مسلمان وکیل کو مقرر کیا جانا چاہیے۔ لیکن اشفاق اللہ خاں نے اصرار کر کے ہجیلا صاحب کو اپنا وکیل مقرر کرایا تھا۔ اس سلسلے میں اشفاق اللہ خاں کے خیالات پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ سچیندر ناتھ بخشی کی طرف سے چندر بھان گپتا پیروی کر رہے تھے۔

اقبال جرم کرانے کی آخری کوشش :

ہجیلا صاحب نے ایک مضمون میں مقدمے کی کارروائی کے دوران اشفاق اللہ خاں کی سیرت اور ان کے رویے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشفاق اللہ خاں اپنے افکار کی بلندی، حب الوطنی اور پارٹی ڈسپلن میں کتنے اعلیٰ اور مثالی کیریکٹر کے مالک تھے۔ ہجیلا صاحب لکھتے ہیں :

> "جس زمانے میں یہ مقدمہ سیشن عدالت میں چل رہا تھا۔ اسی زمانے میں خاص کاکوری کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا جس میں رام پرشاد بسمل، راجندر لاہڑی اور روشن سنگھ کو سزائے موت دی گئی تھی اور بقیہ تمام ملزمان کو بھی سخت قید کی سزائیں دی گئی تھیں۔ اسی وقت یہ بھی صاف طور پر نمایاں ہو گیا تھا کہ جناب اشفاق اللہ خاں کو سوائے سزائے موت کے دوسری سزا نہ دی جائے گی۔
>
> اشفاق اللہ خاں کے بہنوئی عبدالقادر ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان

کے خاندان کے بہت سے افراد، جنھوں نے گورنمنٹ انگلشیہ کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ اسی باعث خان بہادر تصدق حسین نے جو کاکوری سازش کیس کے اسپیشل آفیسر متعین ہوئے تھے، ایک دن دوران مقدمہ مجھ سے کہا کہ اس نوجوان کو جو اپنے خاندانی راستے سے بھٹک گیا ہے، آپ کو بچانا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ ایسی حالت میں بہ حیثیت وکیل سوائے مقدمہ کی پیروی کے میں اور کیا کر سکتا ہوں؟ انھوں نے کہا:

مین کیس کا جو حشر ہوا ہے اور رام پرشاد بسمل وغیرہ کو جو موت کی سزائیں دی گئی ہیں، آپ کے علم میں ہے۔ اس لیے اشفاق اللہ اگر اب بھی اقبال کر لے اور معافی مانگ لے تو ممکن ہے سزائے قید میں بھی کمی کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے۔

میں نے کہا: اس نوجوان سے معافی مانگنے کی امید تو کی نہیں جا سکتی اور اقبال کر لینا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

پھر بھی یہ سوچ کر کہ مخصوص مقدمے میں سیشن کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اشفاق اللہ خاں کے کسی بیان کا قانونی اثر اس مقدمے پر نہیں پڑ سکتا۔ اس لیے اگر اس نوجوان کو موت کی سزا سے کسی طرح نجات مل جائے تو اس کی زندگی اس کے لیے نیز وطن کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ سب سے بڑی بات یہ ہو گی کہ اس کی مادرِ ضعیف کی بقیہ زندگی عذاب بننے سے بچ جائے گی۔ یہ سوچ کر ایک دن میں نے اشفاق اللہ خاں سے کہا کہ تمام سرکاری گواہ ختم ہو چکے ہیں۔ مخصوص مقدمے کے فیصلے سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس مقدمے میں بھی پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ اس لیے یہ بیان کر کے کہ تمھارے کسی بیان کا اثر دوسرے مقدمے پر تو پڑنے سے رہا۔ اگر تم اپنے بیان میں کچھ تاسف کا اظہار کر دو تو ممکن ہے تم پھانسی کی سزا سے بچ جاؤ۔ اس سلسلے میں خان بہادر تصدق حسین سے میری گفتگو ہوئی ہے...۔"

معذرت سے انکار :

بجیلا صاحب لکھتے ہیں کہ :

”... میں ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ یکایک اشفاق اللہ خاں کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور انھوں نے مجھ سے کہا :

بجیلا صاحب! آپ کو تو معلوم ہے کہ میں نے کتنی ضد کر کے آپ کو اپنا وکیل بنایا تھا۔ جب میرا مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت میں تھا، اسی وقت سے بہت لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اس مقدمہ میں میں ہی ایک تنہا مسلمان ہوں۔ مجھے سرکار کی طرف سے کسی اچھے مسلمان وکیل کو اپنے مقدمے میں متعین کرانا چاہیے۔ لیکن مجھے شروع ہی سے آپ پر مکمل اعتماد رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں سمجھتا تھا کہ آپ جیسی شخصیت بھی مجھے صرف پھانسی کی سزا کے خوف سے اظہار افسوس کا مشورہ دے گی۔ میرے لیے یہ قطعی ناممکن ہے اور مجھے فی الحقیقت کسی طرح کا افسوس ہے بھی نہیں۔ اس لیے کہ جو کچھ میں نے کیا، وہ غلط ہو یا صحیح، وطن کی آزادی کی خواہش سے کیا۔ اگرچہ میرا اختلاف رام پرشاد بسمل سے اس سلسلے میں رہا کہ بچپوری ڈکیتی وغیرہ جو اپنے ہی اہل وطن کے گھروں میں پڑی، مناسب نہیں تھی۔ لیکن کاکوری کے ٹرین حادثے کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا! اسے ہم اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح کانگریس ایک راستہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح ہم لوگ اس راستے کو وطن کی آزادی کے مقصد سے اپنائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس راہ میں بہت سے خطرات ہیں، لیکن وطن کی آزادی کے لیے اب قربانی کی ضرورت ہے۔

ہاں! ایک مسافر کے بلا سبب مارے جانے کا افسوس ہے، لیکن وہ اپنے ڈبے سے اتر کر دوسرے ڈبے کی جانب جہاں اس کی بیوی بیٹھی تھی، جا رہا تھا اور ایک انگریز مسافر جو فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا، کی گولی کا

شکار ہوا“

پولیس کی چال :

”رہی اقبال کرنے کی بات! تو اپنے بارے میں کہنے کو ہر وقت تیار ہوں اور تمام ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں لیکن جمیلا صاحب؛ آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ محض ان باتوں سے پولیس والوں کو یا انگریز سرکار کو اطمینان ہو جائے گا۔ وہ تو اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے اور دوسرے ایسے مقدمے تیار کرنے کے لیے یہ چاہیں گے کہ میں بہت سے ایسے آدمیوں کا نام لوں، جن کا اس واقعے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ان پر پولیس کی نگاہیں ہیں“۔

جمیلا صاحب لکھتے ہیں کہ میں ان کے یہ خیالات سن کر متحیر ہی نہیں، نادم بھی ہوا کہ ایسے نڈر بے باک نوجوان کے سامنے جو اپنے وطن کو آزادی دلانے کے لیے خود کو پھانسی کے لیے پیش کرنے کو تیار ہے، میں نے ایسی تجویز پیش کرنے کی گستاخی کیوں کی!

پختہ فکری اور دور اندیشی :

اشفاق اللہ خاں کے ان خیالات سے ان کے پختہ فکر، موت سے بے خوفی، ملک کی آزادی کے لیے انقلابی طریقۂ کار پر ان کا غیر متزلزل یقین اور کمالِ حب الوطنی کا تو پتا چلتا ہی ہے، لیکن اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کتنے دور اندیش اور پولیس کے مزاج شناس تھے۔ انھیں خوب اندازہ تھا کہ پولیس کے سامنے اقبالِ جرم کا مطلب کیا ہوگا اور اس کے بعد وہ ان سے کیا توقع کرے گی؟ اس لیے اقبال جرم نہ کرنے اور اظہار افسوس سے انکار سے ان کی موت سے بے خوفی ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی پختہ فکری اور کمالِ دور اندیشی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

مذہب اور سیاست :

سچیندر ناتھ بخشی کے بیان سے بھی اشفاق اللہ خاں کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی جیل کی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ بخشی جی نے سشیل کمار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا :

”ہمیں معلوم ہوا کہ پنڈت رام پرشاد بسمل حوالات میں کٹر مذہبیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور مذہبی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ میں نے جب اس کی مخالفت کی تو اشفاق اللہ نے کہا کہ شاید پنڈت رام پرشاد نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ کھیل کھیلا ہو۔ وہ خود بھی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگے اور روزے رکھنا بھی شروع کر دیا۔ لیکن اس مذہبی فرض کی ادائیگی کے بعد بھی وہ متعصب قطعی نہیں تھے۔ وہ مذہب کو راستے کا روڑا کبھی نہیں بننے دیتے تھے اور ملک کی آزادی کے سوال کو مذہبی اختلاف سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور وطن کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سے اشفاق اللہ خاں کی مذہبی فیاضی نیز ان کے دل میں موجیں مارتی ہوئی حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے“۔

خدا پر اعتماد :

اشفاق اللہ خاں کے مذہبی عقیدے کے بارے میں بخشی جی کہتے ہیں :

”میں کٹر قسم کا نیچری اور خداناشناس تھا۔ خدا اور بھگوان دونوں کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا۔ لیکن بہت دنوں تک ساتھ ساتھ رہنے پر بھی ہم دونوں میں کبھی اس سلسلے میں یا مذہبی معاملات کے بارے میں بحث نہیں ہوئی۔ جیسا کہ سچیندر ناتھ سانیال اور گوبند چرن کار کی بحث اور مذہب اور خدا کی طرفداری میں دوسرے کم عمر ملزمان میں ہوا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں اشفاق اللہ خاں کا کہنا تھا کہ میں کسی طاقت کو سب سے بلند مانتا ہوں یا یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے اور دنیا کے اوپر کوئی اور بڑی طاقت ہے۔ تم اسے نہیں مانتے، جس دن میرا بھی یقین اٹھ جائے گا، اس دن میں بھی خدا کو ماننا چھوڑ دوں گا۔ یہ تو ہماری انفرادی اور ذاتی عقیدت کی بات ہے“۔

جیل میں شعر و شاعری :

بخشی جی نے جیل میں اشفاق اللہ خاں کے شعر و شاعری کے مشغلے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اس بیان سے اشفاق کی بعض غزلوں کی تاریخ یا کم از کم زمانہ تحقیق پر روشنی پڑتی

ہے۔ واضح رہے کہ اشفاق اللہ خاں کو شعر و شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی سے تھا۔ اور حسرت وارثی ان کا تخلص تھا۔ بخشی جی بیان کرتے ہیں :

"ان دنوں لکھنؤ سے ایک روزنامہ 'ہمدرد' کے نام سے نکلتا تھا(۱)۔ حسرت وارثی یعنی اشفاق اللہ خاں کی غزلیات اکثر اس میں شائع ہوتی تھیں۔ جو وہ جیل میں کہا کرتے تھے اور ہمارے وکلاء انھیں شائع کرادیا کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل مجھے ابھی تک یاد ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں :

سنائیں غم کی کسے کہانی ہمیں تو اپنے ستارہے ہیں
ہمیشہ وہ صبح و شام دل پر ستم کے خنجر چلا رہے ہیں
نہ کوئی انگلش، نہ کوئی جرمن، نہ کوئی رشین نہ کوئی ترکی
مٹانے والے ہیں اپنے ہندی جو آج ہم کو مٹارہے ہیں

اسی سلسلے میں پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

"شری اشفاق اللہ بڑی مستانہ روش رکھتے تھے۔ ہر ساتھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی یہ اپنے اشعار میں جناب عین الدین صاحب اسپیشل مجسٹریٹ پر بھی بڑی چوٹیں کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جناب عین الدین کا تعلق اشفاق اللہ خاں کے خاندان سے تھا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں بہت بناتے تھے"۔

سچیندر ناتھ بخشی کا بیان ہے کہ ایک روز ان کے مخصوص مقدمے کے سرکاری وکیل پنڈت جگت نرائن مُلاّ ان کے کورٹ میں چند منٹ کے لیے آئے تھے۔ اس وقت تک ان کے مقدمے کا فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا۔ اشفاق اللہ خاں پنڈت جی کے بارے میں برجستہ شعر کہتے تھے۔ جو چند شعر اوپر نقل ہوئے ہیں، وہ اسی موقع کے ہیں۔ ان میں کا ایک شعر یہ ہے :

---

(۱) 'ہمدرد' نام صحیح نہیں ہے۔ دراصل یہ لکھنؤ کا مشہور اخبار 'ہمدم' ہے۔ یہ تسامح شاید بخشی جی سے ہوا یا ممکن ہے سشیل کمار کے حافظے کی کوتاہی ہو، یہ بھی امکان ہے کہ یہ غلطی کتابت کے عمل میں ہوئی ہو۔ (ا۔ س۔ ش)

چلو چلو، یارو رنگ تھیٹر! دکھائیں تم کو وہاں یہ سریل
جو چند ٹکڑوں پہ سیم و زر کے نیا تماشا دکھا رہے ہیں

اس شعر میں اشارہ پنڈت جی کی طرف ہے جو گورنمنٹ سے پانچ سو روپے روزانہ لیتے تھے اور محبِّ وطن انقلابیوں کے خلاف سرکار کی طرف سے پیروی کرتے تھے۔ اس مقدمے کے لیے کورٹ کی بلڈنگ کے بجائے رنگ تھیٹر میں انتظام کیا گیا تھا۔

اس کے بعد بخشی جی نے مقدمے کی آخری پیشی اور اس کے لیے ایک تازہ غزل یا گیت لکھنے کے ارادے پر روشنی ڈالی ہے۔ بخشی جی فرماتے ہیں :

"مقدمے کی سماعت ملتوی ہو چکی تھی۔ فیصلے کے دن سے پہلی رات کو کھانے پینے کے بعد، اشفاق اللہ نے طے کیا کہ کل کچہری میں گانے کے لیے کوئی نئی غزل یا گیت کہا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایک گیت لکھا، جس کا کچھ حصہ مجھے ہنوز یاد ہے :

اے ماتر بھومی تیری سیوا کیا کروں گا
مشکل ہزار آئیں ہرگز نہ میں ڈروں گا
پھانسی ملے مجھے یا ہو جنم قید میری
بیڑی بجا بجا کر تیرا بھجن کروں گا

چوں کہ ان کے مقدمے کا فیصلہ ۱۳/ جولائی ۱۹۲۷ء کو سنایا گیا تھا۔ اس لیے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ گیت انھوں نے ۱۲/ جولائی کی شام کو یا رات میں کسی وقت کہا ہو گا!

باب ہفتم

مقدمے کا فیصلہ

اشفاق اللہ خاں نے موت کی سزا کے فیصلے کو جس بہادری کے ساتھ سنا، وہ کسی شخص کی موت سے بے خوفی کے اظہار کے لیے بہت بڑا ثبوت ہے۔ بخشی جی نے فیصلے کی تاریخ کی روداد ان الفاظ میں بیان کی ہے :

"اشفاق اللہ خاں عمر میں اگرچہ ایک ڈیڑھ سال مجھ سے بڑے تھے، لیکن پارٹی کے سنگٹھن کا زیادہ تجربہ کار ہونے کے باعث وہ مجھے ہی بڑا مانتے تھے۔ روز بہ روز رونما ہونے والے انقلابی معاملات میں وہ مجھے زیادہ ماہر بھی سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ مجھ سے ہمیشہ صلاح و مشورہ کرتے تھے اور اسے تسلیم بھی کر لیتے تھے۔ لیکن جس وقت مجھے اور اشفاق کو سزا سنائی گئی تھی۔ مجھے عمر قید بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی اور اشفاق کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ مجھے یکایک ایسا معلوم ہوا کہ اشفاق مجھ سے بہت اونچے اٹھ گئے ہیں۔ ویسے میں بتا چکا ہوں کہ وہ راجکماروں کی طرح اور گٹھے ہوئے جسم والے پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن اس وقت تو ان کی شخصیت یکایک اتنی بلند معلوم ہونے لگی کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں بہت بڑی کوشش کے بعد بنگلہ زبان میں کہ "ایک سفر کے مختلف نتائج نہیں ہونے چاہیے تھے، مجھے بھی یہی سزا ملنی چاہیے تھی....

میرا گلا رِندھ گیا۔ اس سے آگے مجھ سے ایک لفظ نہ بولا گیا۔ بلکہ اشفاق اللہ خاں خود مجھے سمجھانے لگے۔ ان میں ضبط کی غیر معمولی طاقت تھی۔ فیصلہ سنانے کے بعد ہم لوگوں کو عدالت سے جیل لایا گیا۔ شام کو

لکھنؤ اسٹیشن تک ہمارا ساتھ رہا۔ اس کے بعد انھیں فیض آباد جیل میں پھانسی گھر کے لیے روانہ کر دیا گیا اور مجھے آگرہ سنٹرل جیل کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس دن سے وہ اور میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے"۔

سزائے موت کا اعلان :

کرپا شنکر ہجیلا نے آخری پیشی کی روداد قلم بند کی ہے۔ اس سے بھی اشفاق اللہ خاں کی شخصیت کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"جس روز سیشن کی عدالت میں مقدمے کا فیصلہ جی آر ڈبلیو سینٹ آئی سی ایس سیشن جج لکھنؤ سنانے کو آئے تھے۔ اشفاق اللہ بسنتی پیرہن زیب تن کیے ہوئے بڑے جوش و خروش کے ساتھ عدالت میں داخل ہوئے۔ اُس وقت اِس قد آور اور طاقت ور نوجوان کا حسن و شباب دیکھ کر سب حیرت میں پڑ گئے کہ شاید اس کا وہم ہے کہ اسے پھانسی کی سزا تو کیا اسے قید بامشقت بھی نہیں دی جائے گی، لیکن حقیقت اس کے خلاف تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ جیسا کہ ان کے مکتوب مؤرخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء سے ظاہر ہوتا ہے۔

سیشن جج کے اجلاس میں آمد کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا اور شری اشفاق اللہ کو دوسری سزاؤں کے علاوہ پھانسی کی سزا، دو الزامات یعنی کاکوری کیس نیز بچھوری ڈکیتی کے جرم میں علاحدہ علاحدہ دی گئی اور شری سچیندر ناتھ بخشی کو جہاں تک مجھے یاد ہے دس سال قید کی سزا دی گئی تھی (۱)۔

شری اشفاق خاں نے جج کے فیصلے کو بڑے اطمینان اور تحمل سے سنا۔ اس پر جب میں نے اور میرے معاون چندر بھان گپت (ایڈوکیٹ) نے ان سے اظہار افسوس کیا تو اشفاق اللہ خاں نے بڑی فیصلہ کن بات کہی۔ انھوں نے فرمایا :

---

(۱) سچیندر ناتھ بخشی کے ایک بیان میں گزر چکا ہے کہ انھیں عمر قید بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔ یہی درست ہے۔ دیکھیے باب چہارم : ضمیمہ

افسوس کی کیا بات ہے۔ اس دن کے لیے تو ہم ہمیشہ ہی سے تیار تھے۔ لیکن مجھے آج محض ایک بات کا افسوس ہے"!

ایک عجیب خواہش :

اشفاق اللہ خاں نے جیلا صاحب کے پوچھنے پر جو بات کہی اسے سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے؛ بلکہ آج بھی جب ان کی اس عجیب خواہش کو پڑھتے ہیں تو حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی اس خواہش سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف دکھاوے کے لیے اطمینان و سکون کا اظہار نہیں کر رہے تھے بلکہ فی الواقع انھیں اس بات کا کوئی غم نہ تھا کہ وہ قید میں ہیں اور اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ ان پر جن سنگین الزامات میں مقدمہ چل رہا ہے، ان کی کم سے کم سزا عمر قید بہ عبور دریائے شور اور پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ جیلا صاحب لکھتے ہیں :

"ہم نے پوچھا : وہ بات کیا ہے؛ انھوں نے فرمایا :
مجھے صرف دو مہینے قبل ہی بی کلاس ملا تھا اور جیل میں کھانے کا کچھ بہتر انتظام کر دیا گیا تھا۔ گزشتہ ہفتے جب جیل میں میرا وزن کرایا گیا تو جیلر فرمانے لگا کہ اس جیل میں داخلہ کے بعد کسی ملزم کا وزن آج تک اتنا نہیں بڑھا تھا، جتنا میرا وزن نکلا۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک ملزم کا وزن مجھ سے بھی چھ یا دس پونڈ (جیلا صاحب کو یہ بات ٹھیک یاد نہیں رہی) زیادہ تھا، میں نے جواب دیا یہ بھی پورا کر کے دکھادوں گا۔ اب مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ میں وزن پورا نہ کر سکا۔ کیوں کہ آج سے کال کوٹھری میں رکھا جاؤں گا۔ اگر ایک ہفتہ بعد یہ فیصلہ سنایا جاتا تو اس کا ریکارڈ بھی مات کر دیتا"۔

اخلاق کی ایک مثال :

اشفاق اللہ خاں کی خوش مزاجی اور زندہ دلی کا ذکر بخشی جی نے اپنے بیان میں کیا ہے۔ انھوں نے ایک غزل میں استغاثے کے وکیل پنڈت جگت نرائن ملا پر طنز بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری گواہوں اور وکیل پر بھی وہ کوئی طنزیہ جملہ کہہ دیتے تھے۔ چوں کہ ان کے طنز کا نشانہ خیرات نبی انسپکٹر سی آئی ڈی بھی بن چکا تھا اور وہ اس آخری پیشی کے موقع پر موجود تھا۔ اور

اب جب کہ مقدمے کا فیصلہ سنادیا گیا تھا، اشفاق اللہ خاں کی سیرت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ ان کی شخصیت میں عفوودرگزر کا پہلو ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں کوئی شخص خوشی سے نہ ان کے خلاف گواہی دینے آیا، نہ اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق کسی نے ان کے خلاف مقدمہ لڑا، یہ سب ملازمت کی مجبوریاں تھیں۔ جج، سرکاری وکیل، گواہ وغیرہ سب ایک ڈرامے کے کردار تھے، جنھیں اسٹیج پر آنا اور اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اشفاق اللہ خاں کی کسی سے ذاتی دشمنی نہ تھی۔ اس لیے اگر مقدمے کے دوران شخصاً کسی کے خلاف کوئی بات ادب اور تہذیب کے خلاف ان کی زبان سے نکل گئی ہے تو اس سے معذرت اور عفوخواہی کر لینی چاہیے۔ یہی جذبہ تھا جس نے خیرات نبی جیسے ننگِ قوم وملت سے بھی معذرت چاہی۔ جبیلا صاحب لکھتے ہیں :

"اس کے بعد شری اشفاق نے خیرات نبی انسپکٹر سی آئی ڈی سے جو اس مقدمے میں سرکاری وکیل تھے، بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور انھیں اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ خیرات نبی پہلے تو کچھ جھجکے، لیکن پھر ہنس کر اور دوبارہ بلانے پر ہمارے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ شری اشفاق اللہ خاں نے ان سے بڑے اخلاق سے کہا : اگر مقدمے کے دوران کوئی بات آپ کی شان کے خلاف میرے منھ سے نکل گئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ ملازم ہیں اور آپ نے جو کچھ کیا، وہ آپ کی ملازمت کا فرض تھا"۔

یہ فرماتے ہوئے وہ جیل کے لیے خوشی خوشی نعرے لگاتے ہوئے روانہ ہوگئے"

باب ہشتم

آخری سفر اور اس کی تیاری

ضبط اور ایثار و وفا کی چند جھلکیاں

اپیلیں اور ان کا انجام :

سیشن عدالت سے مقدمے کے فیصلے کے بعد چیف کورٹ میں اپیل دایر کی گئی۔ لیکن یہ اپیل خارج کر دی گئی اور سیشن عدالت کا نہ صرف فیصلہ بحال رکھا گیا، بلکہ چیف جج سر لوئس شرف نے اپیل کے فیصلے میں لکھا :

"This decaity was of a charater unusual in India".

''ہندوستان میں ڈکیتی کا یہ ایک غیر معمولی نوعیت کا واقعہ ہے۔ اور جو سزا اس مقدمے میں ملزمان کو دی گئی ہے، وہ جرم کی نوعیت کے لحاظ سے بالکل درست ہے''۔

چیف کورٹ سے اپیل کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی انھیں فیض آباد جیل بھیج دیا گیا۔ اس لیے کہ ڈپٹی عین الدین کی جانب سے اشفاق اللہ خاں کی جائیداد کی ضبطی کے سلسلے میں اظہار وجوہ کا جو نوٹس انھیں جاری کیا گیا تھا، وہ فیض آباد جیل میں انھوں نے وصول کیا تھا۔ جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی صفی اللہ خاں کے نام ۲۴ر جولائی ۱۹۲۷ء کے خط میں کیا ہے۔

چیف کورٹ سے ان کی اپیل نامنظور ہونے کے بعد، اب صرف پریوی کونسل میں اپیل کی جاسکتی تھی۔ اگرچہ وہاں سے بھی اپیل کے منظور ہونے کی امید نہ تھی، دوسری بات یہ کہ اشفاق اللہ خاں کو بھی اپنی زندگی کی پروانہ تھی، لیکن ان کے عزیز خصوصاً والدہ اور بھائی یہ

کب گوارا کر سکتے تھے کہ امید کی اس ہلکی سی کرن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی تیاریاں شروع کی گئیں۔

ایثار و وفا کی حیرت انگیز مثال :

جبیلا صاحب نے اپیل تیار کی اور اسے بھیجا بھی گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی خلاف توقع نہ نکلا اور جیسا کہ جبیلا صاحب کے نام اشفاق اللہ خاں کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ر دسمبر کو انھیں تار کے ذریعے سے اپیل کے نامنظور ہونے کی اطلاع مل گئی۔ پریوی کونسل سے اپیل کے نامنظور ہونے کی خبر سے ان کی والدہ، بھائیوں اور عزیزوں کے دلوں پر جو گزری ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اشفاق اللہ خاں کے لیے نہ یہ کوئی حادثہ تھا، نہ اس کا انھیں کوئی غم تھا۔ لیکن میں ان کی سیرت کے جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ انھیں پارٹی کے ڈسپلن کا کتنا خیال اور پارٹی لیڈر کی فرماں برداری کا انھیں کتنا شدید احساس تھا! یہ بڑے کیریکٹر کی مثال تھی کہ اس وقت جیسا کہ انھیں سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا، چیف کورٹ سے ان کی اپیل خارج کر دی گئی تھی اور امید کی صرف ایک اور آخری کرن پریوی کونسل رہ گئی تھی اور پریوی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اپیل تیار کی جا رہی ہے کہ انھیں ان کی پارٹی لیڈر، جسے عدالت کی طرف سے پھانسی کی سزا ہوئی ہے، کا حکم ملتا ہے کہ اسے بچانے کے لیے جرم کا الزام اپنے اوپر لے لیا جائے اور وہ اپنی سلامتی سے بے نیاز ہو کر فوراً پارٹی لیڈر کے اس حکم پر سر جھکا دیتے ہیں۔ نظم و وفا اور ایثار کی یہ دل آویز حکایت شری کرپا شنکر جبیلا ایڈوکیٹ کی زبانی سنیے اور سر دھنیے کہ اس درد ایثار و وفا کی ایسی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو شاہ جہاں پور کے اس نوجوان پٹھان نے دنیا کے سامنے پیش کی؟ جبیلا صاحب لکھتے ہیں :

> "چیف کورٹ سے ان کی اپیل خارج ہونے کے بعد، جب میں لکھنؤ جیل کی کال کوٹھری میں ان کی پریوی کونسل میں اپیل کرنے کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے گیا، تو انھوں نے مجھے انگریزی میں ایک اپیل جو سرکار کو بھیجنے کے لیے لکھی تھی، دکھائی۔ اس میں انھوں نے سارا قصور اپنے سر لے لیا تھا اور شری رام پرشاد بسمل، کو بے قصور ثابت کرنے کی انتہائی

کوشش کی تھی۔ میں نے کہا :

”جو حالات آپ نے مجھے بتائے تھے، یہ تو ان کے سراسر خلاف ہے۔ اس طرح آپ حقیقت کے خلاف لکھ کر اپنے آپ کو اور زیادہ پھنسانے کی کیوں کوشش کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارا پریوی کونسل میں اپیل کرنا قطعی بے سود ہے“۔

انھوں نے جواب دیا :

”بجیلا صاحب! میں نے ہمیشہ آپ سے یہی عرض کیا ہے کہ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور رام پرشاد بسمل ہمارے لیڈر ہیں۔ وہ ایک پختہ کار خادم وطن اور ایک اعلیٰ دماغ شخصیت ہیں۔ اگر وہ کسی طرح میری جان کی بازی لگانے پر بھی زندہ رہ جائیں تو ہماری پارٹی کے مقصد کی تکمیل کے لیے اچھا ہوگا۔ میں تو محض ایک سپاہی ہوں۔ ان کے دماغ اور ان کی سوجھ بوجھ کو میں نہیں پہنچتا ہوں“۔

میں نے ان سے کہا :

”ان باتوں سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ آپ جن معاملات میں قطعی بے قصور ہیں، ان کی ذمہ داری بھی قبول کرلیں؟“

میرے مُصر ہونے پر انھوں نے سوچ کر جواب دیا کہ :

”سچ تو یہ ہے کہ شری رام پرشاد نے جو سامنے والی کال کوٹھری میں ہیں، مجھ سے دو تین روز قبل رات کو باتیں کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں اس قسم کی اپیل بھیجوں اور دوسری اپیل وہ خود بھیج رہے ہیں، تو ان کو پھانسی کی سزا سے رِہائی ملنے کی امید ہے۔ میں نے یقین دلایا کہ میں ان کی خواہش پر عمل کروں گا۔ اس لیے میں نے صرف ان کی بھلائی کے لیے یہ سب کچھ لکھا ہے“۔

یہ تمام واقعات سن کر بجیلا صاحب نے انھیں منع کیا کہ وہ اس قسم کی کوئی اپیل نہ بھیجیں، بجیلا صاحب کی یہ رائے صائب اور مشورہ صحیح تھا۔ لیکن کیا اشفاق اللہ خاں نے اپنے مخلص اور قابل اعتماد وکیل کے اس مشورے کو قابل اعتناء سمجھا؟ بجیلا صاحب لکھتے ہیں :

"بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ باوجود میرے منع کرنے کے انھوں نے اپیل بھیج دی۔ یہ کام ان کی سچی دوستی اور موت کے منہ کا نوالہ بنتے ہوئے بھی اپنے لیڈر کے ساتھ وفاداری کا اعلیٰ نمونہ ہے"۔

بجیلا صاحب کی آخری ملاقات :

۱۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء ان کی پھانسی کے لیے دن مقرر کیا گیا تھا۔ چیف کورٹ اور پریوی کونسل سے ان کی اپیلیں خارج ہو چکی تھیں اور اب عدالت کے فیصلے پر عمل در آمد ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ۱۳/ دسمبر کو انھوں نے اپنے وکیل جناب بجیلا صاحب کے نام خط لکھا کہ وہ ان سے ملاقات کریں۔ ۱۵/ دسمبر کو انھوں نے اپنی والدہ کے نام آخری خط لکھا۔ ۱۶/ دسمبر کو انھوں نے شری سچیندر ناتھ بخشی کی بہن کو جنھیں وہ اپنی سگی بہن کی طرح چاہتے تھے اور انھیں دیدی کہتے تھے، آخری خط لکھا۔ اسی تاریخ کو انھوں نے برادرانِ وطن کے نام پیغام لکھا۔ یہ تمام تحریرات عدالت اور عزیمت دعوت کی تاریخ میں ہمیشہ روشن، تابندہ اور زندہ رہنے والی تحریرات ہیں۔

اگر ان تحریرات کا تاریخ آزادیِ وطن میں درجہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کی ادبی اور انشاپردازانہ حیثیت سے قطعِ نظر مولانا ابوالکلام آزاد کے علی پور (کلکتہ) جیل کے بیان "قول فیصل" اور کراچی جیل میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی کے بیانات کے بعد برصغیر کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ لیکن ان پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ہم یہاں ان کے مقدمے کے سلسلے میں ان کی زندگی اور شخصیت کے بعض گوشوں کی طرف قارئین کو توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ان کے خط کے جواب میں بجیلا صاحب ایڈوکیٹ ۱۷/ دسمبر کو ان سے ملاقات کے لیے فیض آباد پہنچے۔ ان کے ساتھ اشفاق اللہ خاں کے دو بڑے بھائی اور دو بھتیجے بھی تھے۔ شری بجیلا صاحب لکھتے ہیں :

"میں اور شری اشفاق اللہ خاں کے دو بڑے بھائی ریاست اللہ خاں اور شہنشاہ خاں اور ان کے دو چھوٹے بھتیجے ان سے جیل میں ملنے کے لیے ۱۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو فیض آباد گئے۔ وہ اپنی کوٹھری کے باہر تھے اور

غسل کر کے آرہے تھے۔ وہ مجھے بہت مطمئن نظر آئے۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خدا کی عبادت میں مستغرق ہیں۔ جب وہ اپنی کوٹھری میں پہنچے تو انھیں دیکھ کر ان کے بھائیوں کے آنسو نکل پڑے اور دونوں بھتیجے رونے لگے۔ یہ دیکھ کر شری اشفاق اللہ نے کہا:

جیلا صاحب! آپ ان کو اپنے ہمراہ کیوں لائے؟ یہ رونے کا موقع ہے یا خوش ہونے کا؟

سامنے کال کوٹھری کی طرف دیکھیے! جو لوگ۔ ان تینوں سیلوں میں ہیں، وہ تینوں حقیقی بھائی ہیں۔ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ان تینوں پر ایک ڈیڑھ سیر راب کے بارے میں جھگڑا ہونے کے باعث دو آدمیوں کے قتل کا مقدمہ چلا اور تینوں بھائیوں کو سزائے موت ملی ہے۔ یہ تینوں بھائی کل پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔ اگر یہ تینوں بھائی جو اپنے ماں باپ کے اتنے لاڈلے ہیں اور ڈیڑھ سیر راب کی خاطر پھانسی پر چڑھ سکتے ہیں تو مجھ پر تو ہندوستان کی حکومت کو الٹ دینے اور انگریزوں سے اپنے دیش کے لیے آزادی حاصل کرنے کی سازش کا مقدمہ چلا ہے، ان کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارا بھائی اور چچا وطن کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر پھانسی پر چڑھ رہا ہے!

جیلا صاحب! انھیں بتائیے کہ ہندوؤں میں تو خودی رام بوس اور کنہی لال دت جیسی ہستیاں گزر چکی ہیں، جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ مگر مسلمانوں میں تو شاید میں پہلا خوش نصیب ہوں جو انقلابی سازش کیس کے سلسلے میں پھانسی پر چڑھے گا"۔

جیلا صاحب نے ان خیالات پر تبصرہ کیا ہے، ان سے اشفاق اللہ خاں کی سادگی، خوش مزاجی، بلندی اخلاق، حب الوطنی اور پختہ سیرت کا اعلیٰ نمونہ اور بیان کا مستغنی عن التبصرہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خود محترم جیلا صاحب کی فراخ دلی بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جیلا صاحب لکھتے ہیں:

"تھوڑی دیر بعد وداع ہونے کا وقت آیا تو میں نے کہا کہ

اشفاق اللہ خاں کوئی اور بات آخری خواہش کی بیان کرنا چاہتے ہو؟ انھوں نے ہنس کر کہاہاں! ایک خواہش ہے اگر آپ پوری کر سکیں! وہ یہ کہ پرسوں صبح ۱۹/ دسمبر کو میں پھانسی کے تختے پر چڑھوں گا۔ آپ دیکھتے جایئے کہ میں کس شوق اور شان سے پھانسی پر چڑھتا ہوں"!

بجیلا صاحب لکھتے ہیں :

"یہ سن کر یکایک میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور رندھے ہوئے حلق سے میں نے کہا : یہ نظارہ دیکھنے کی جرأت تو مجھ میں نہیں ہے۔ مگر میں تمھارے مزار پر ضرور آؤں گا۔ یہ کہہ کر ہم لوگ رنجیدہ خاطر وداع ہوئے"۔

بھائی کی آخری ملاقات :

اشفاق اللہ خاں سے اس آخری ملاقات جس کا تذکرہ بجیلا صاحب ایڈوکیٹ نے کیا ہے، ان کے بڑے بھائی ریاست اللہ خاں نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ریاست اللہ خاں کی اس تحریر سے ان کی سیرت کے بعض پہلوؤں، اسلام اور قضاو قدر پر ان کے پختہ یقین، ملک کی آزادی کے مقصد کے لیے جان دینے پر کامل اطمینان، موت سے بے پروائی اور بے خوفی، موت کے بے باکانہ استقبال، تختہ دار تک ان کے کامل پر سکون سفر اور بعد کے مراحل کی روداد مرتب کر دی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس باب کا خاتمہ اس تحریر پر کیا جائے۔ ریاست اللہ خاں لکھتے ہیں :

"میں ۱۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو اپنے چند عزیزوں اور اشفاق اللہ خاں کے بعض دوستوں کو لے کر شاہ جہاں پور سے روانہ ہوا اور صبح کے وقت فیض آباد پہنچا اور اسٹیشن سے سیدھا کلکٹر صاحب کی کوٹھی پر گیا اور صاحب موصوف سے ملاقات کی۔ کلکٹر صاحب میرے بہنوئی محمد عبدالقادر خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کے کلکٹر رہے تھے۔ وہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میری والدہ کی خواہش ہے کہ ایک فوٹو اشفاق اللہ خاں کا لینے دیا جائے، جس کے دیکھنے سے میرے دل کو تسلی رہے گی۔ موصوف نے فوراً

ایک خط سول سرجن مسٹر کوک کے نام لکھ کر دے دیا۔ میں اسے لے کر سول سرجن کی کوٹھی پر گیا۔ انھوں نے ایک چٹھی جیلر کے نام لکھ دی کہ فوٹو لینے دیا جائے۔ میں ایک فوٹوگرافر کو لے کر جیل پہنچا اور سول سرجن کی چٹھی جیلر کو دی۔ انھوں نے چٹھی پڑھ کر مجھ سے کہا کہ یہ جیل کے قانون کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے فوٹو نہیں لیا جاسکتا۔ میں نے فوٹوگرافر کو رخصت کر دیا اور اپنے بارہ ساتھیوں کے ساتھ اشفاق اللہ خاں سے ملنے کنڈمنڈ سیل میں گیا۔ جیسے ہی میں پہنچا۔ اشفاق اللہ خاں نے مجھے دیکھ کر کہا :

فنا ہے سب کے لیے مجھ پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے!

ملاقاتیوں کو نصیحت :

اشفاق اللہ خاں کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک رکوع پڑھا(۱) :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ. وَلَا تَقُوْلُوا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَات. بَلْ اَحْيَاءٌ وَّ لٰكِن لَّا تَشْعُرُوْن. وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِيْن. الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُم مُّصِيْبَةٌ قَالُوا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ	مسلمانو! صبر اور نماز (کی معنوی قوتوں) سے سہارا پکڑو یقین کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں، تو یہ مت کہو کہ وہ مردے ہیں، نہیں، وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ اور یاد رکھو! یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمھارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف،

(۱) اصل مضمون میں آیات کے صرف مفہوم کی طرف اشارہ تھا۔ اس مفہوم کی آیات اور ان کا مکمل و صحیح ترجمہ "ترجمان القرآن" (مولانا ابوالکلام آزاد) سے اضافہ کر دیا گیا ہے۔

رَاجِعُوْن. اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَة. وَ اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْن.

(۲: ۵۷-۱۵۳)

بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں، جو تمھیں پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انھیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے تو (بیقرار ہونے کی جگہ ذکر الٰہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں، اور) ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن! (یعنی ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں جو کچھ بھی ہے، سب اللہ کے لیے ہے اور ہم سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں۔ جن پر ان کی رحمت اترتی ہے اور یہی ہیں جو (اپنے مقصد میں) کامیاب ہیں"۔

ان آیات کی تلاوت کرنے اور ان کا ترجمہ پڑھنے کے بعد انھوں نے ملاقات کے لیے آنے والوں کو مخاطب کر کے کہا :

اس لیے آپ لوگوں کو چاہیے کہ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

کیوں کہ ناشکری سے انسان راندہ درگاہ ہو جاتا ہے"۔

اس کے بعد اپنے بھائی ریاست اللہ خاں سے مخاطب ہو کر کہا :

"اگر میرے بعد کوئی سانحہ پیش آئے تو اسے من جانب اللہ تصور کیجیے گا اور صبر سے کام لیجیے گا۔ صبر اس کے خزانے کی کنجی ہے"۔

اور کہا آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ وہ زندہ رہے گا اور اس سے ہمارے خاندان کا نام چلے گا۔ میں نے کہا ایک لڑکا موجود ہے، اب نہ ہوگا۔ کیوں کہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ اب اولاد نہ ہوگی۔ اس پر اشفاق اللہ خاں نے کہا، نہیں، اولاد ضرور ہوگی اور وہ زندہ رہے گی۔ اس کا نام میرے نام پر اشفاق اللہ خاں رکھنا تاکہ میری یاد تازہ رہے"۔

ایک سبق آموز واقعہ :

اس کے بعد انھوں نے کہا :

بھیا! میں بہت خوش ہوں اور دل اندر سے پھولتا چلا آتا ہے کہ جلد سے جلد مجھ کو پھانسی دے دی جائے۔ مجھ کو کوئی فکر نہیں ہے اور نہ کوئی ڈر ہے۔ بلکہ بہت خوش ہوں۔

دیکھیے! میرے سامنے جو آدمی کنڈ منڈ سیل میں بند ہیں، ان کو محض ڈھائی سیر راب پر پھانسی دی جارہی ہے۔ ان کی بیل یعنی کھنڈ سارتھی۔ ان کے چند ملنے والے آئے تھے، جن کو ان لوگوں نے ڈھائی سیر راب کا شربت بنا کر پلایا تھا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور جھگڑا ہو گیا اور وہ شخص جس نے اعتراض کیا تھا، ان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ بیچارے ڈھائی سیر راب کی وجہ سے پھانسی پارہے ہیں۔ مجھ کو تو اطمینان ہے کہ میں ایک بڑے اور اونچے مقصد کے لیے پھانسی پارہا ہوں"۔

اشفاق اللہ خاں سے سب ساتھیوں نے بات چیت کی۔ وہ بے حد خوش تھے اور بہت سی باتیں بالکل اطمینان سے کیں۔ ان پر کوئی خوف اور ہراس نہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ کو ایک خط دیا کہ آپ گنیش شنکر ودیارتھی

کو دے دیجیے گا۔ اور ایک تار مجھ کو لکھ کر دیا۔ یہ بھی انھی ودیارتھی جی کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں دو بجے دن کو لکھنؤ آرہا ہوں۔ اسٹیشن پر ملاقات کر لیجیے گا"۔

اس کے بعد بہت سی باتیں ماں اور مکان کے متعلق کیں"۔

موت کی تیاری :

اس کے بعد ملاقات ختم ہو گئی۔ چوں کہ اشفاق اللہ خاں کے پھانسی پانے میں صرف ایک دن درمیان میں تھا۔ اس لیے دو راتیں اور ایک دن فیض آباد ہی میں گزارا۔ ۱۹ر دسمبر کی صبح کو پھانسی دی جانی تھی۔ اس روز کے حالات اور واردات کے بارے میں ریاست اللہ خاں لکھتے ہیں :

"۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو اشفاق اللہ خاں نے پھانسی سے پیشتر غسل کیا۔ کپڑوں کو جو انھیں استعمال کے لیے دیئے گئے تھے، ایک یوم قبل دھو لیا تھا۔ پاجامہ کھدر کا زرد رنگا ہوا پہنا اور زرد رنگا ہوا کھدر ہی کا گرتا تھا۔ اور ایک زرد رنگ کی کھدر کی چادر اوڑھی، قرآن شریف کو گلے میں حمائل کیا، بالوں میں کنگھی کی، چپل پہنی اور اپنے ہی پاؤں سے چل کر کلمہ پڑھتے ہوئے پھانسی کے تختے کی جانب روانہ ہوئے۔

جلاد مسمّی مُنّی کو بھی جو لکھنؤ سے بلایا گیا تھا، اپنے سامنے غسل کرایا تھا۔ وہ وہاں پہلے سے موجود تھا"۔

موت کا استقبال :

"اشفاق اللہ خود پھانسی کے تختے پر گئے۔ پہلے پھانسی کے پھندے کو چوما۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا : کون مولوی صاحب قرآن پڑھیں گے، وہ آئیں۔ نواب منور علی خاں شاہ جہاں پوری فوراً آئے۔ اشفاق اللہ خاں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جلاد نے کہا خان صاحب! پاؤں ملا لیجیے۔ پاؤں باندھ دیئے گئے۔ گلے میں پھندا ڈال دیا گیا۔ کلمہ زبان پر تھا کہ پھانسی لگ گئی۔

فیض آباد کے ایک وکیل نے جو کشمیری پنڈت تھے، چھپا کر فوٹو لے لیا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک گھنٹے کے بعد نعش پھانسی سے اُتار کر لوہے کے پلنگ پر لٹادی گئی۔ اتنے میں کلکٹر صاحب فیض آباد گھوڑے پر سوار آگئے۔ مجھ سے سلام کے بعد کہا : مجھے افسوس ہے کہ یہ نوجوان غلط سمت میں پڑکر اپنی جان سے گیا۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ بتائیے! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں نے ان سے کہا : آپ مجھے سول سرجن مسٹر کک سے سرٹیفکیٹ دلوادیجیے تاکہ نعش لے جانے میں ریلوے کو کوئی اعتراض نہ ہو! دوسرے پھانسی گھر کھول دیا جائے تاکہ غسل اور نماز جنازہ پھانسی گھر میں ہوسکے۔ تیسرے تیس جوان مسلح پولیس پندرہ جوان جنازے کے آگے اور پندرہ جوان جنازے کے پیچھے باوردی رہیں۔ کلکٹر صاحب نے پوچھا یہ کیوں؟ میں نے کہا : دیکھیے! تقریباً دس ہزار آدمی یہاں موجود ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ نعش زبردستی چھین کر لے جائیں اور پروسیشن (جلوس) نکالیں۔ ہم مسلمان ہیں، پروسیشن نہیں نکالتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کلکٹر شاہ جہاں پور مسٹر ہوباٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس شاہ جہاں پور مسٹر کارلس سے وعدہ کیا ہے کہ پروسیشن نہیں نکالا جائے گا۔ کلکٹر صاحب فیض آباد نے میرا یہ مطالبہ مان لیا۔ اور حکم دیا کہ پندرہ باوردی نعش کے آگے آگے جائیں گے اور پندرہ جوان نعش کے پیچھے رہیں گے۔ چنانچہ پولیس کے تیس جوان اس مقصد کے لیے فوراً آگئے۔

اتنے میں فیض آباد کے ایک پروفیسر جو قوم کے سید اور افغانستان کے رہنے والے تھے، آملے اور مجھ سے نعش دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا آیئے، دیکھ لیجیے! ان کو لے کر پھانسی گھر میں گیا۔ پروفیسر صاحب نے چادر اٹھا کر دیکھا اور بہت روئے۔ اور مجھ سے کہا کہ ان کو غسل وغیرہ نہ دیا جائے۔ یوں ہی انھی کپڑوں میں دفن کردیجیے، یہ شہید ہیں! شہید کے لیے غسل اور کفن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا : انھوں نے وصیت کی تھی اور میں وصیت کے مطابق کھدر کا کفن اور عطر کی شیشیاں لایا

ہوں۔ پروفیسر صاحب نے کہا: یہ خدمت میرے سپرد کی جائے۔ میں نے منظور کرلیا۔

پروفیسر صاحب نے جب غسل دینے کے لیے نعش سے چادر ہٹائی اور دیکھا کہ قرآن کریم ان کے گلے میں پڑا ہوا ہے تو فارسی کا یہ مصرعہ پڑھا جو خوب ہی حسب حال تھا:

پیش جاناں می روم فرمانِ جاناں در بغل

پروفیسر صاحب نے غسل دیا اور کفن پہنا کر نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز میں تقریباً پانچ ہزار اشخاص شریک ہوئے۔ میرے ایک دوست آباد احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس فیض آباد میں سادہ کپڑوں میں ملبوس، موجود تھے۔ انھی نے پلنگ بنوایا تھا۔ ہم لوگوں سے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا۔ میں نے کہا جب تک تدفین نہ ہو جائے، ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ انھوں نے ایک ٹوکری میں پان، چھالیہ، کتھا، چونا، الائچیاں، لونگیں وغیرہ رکھ دیں اور بہت ہمدردی کا برتاؤ کیا"۔

اشفاق شہید کا جلوس:

نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد میت اٹھائی گئی، تو دس ہزار کا مجمع تھا۔ پولیس کے پندرہ باوردی مسلح جوان آگے اور پندرہ پیچھے چل رہے تھے۔ میت کا یہ جلوس

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کی تصویر بنا ہوا تھا۔ مسلح پولیس کے مسلح جوانوں کو جنازے کے آگے اور پیچھے چلنے کے لیے ریاست خاں نے جو مطالبہ کیا تھا، اس کا مقصد یہی تھا کہ جنازہ تزک واحتشام سے اٹھایا جائے۔ ریاست اللہ خاں لکھتے ہیں:

"میرا مطلب یہ تھا کہ نعش کے آگے پیچھے مسلح گارڈ کا ہونا یوں ضروری تھا کہ مجمع تو دس ہزار کا ہے، بہت اچھا پروسیشن نکل جائے گا اور یہی ہوا"۔

آخری دیدار:

اس کے بعد ریاست اللہ خاں لکھتے ہیں:

"لوگوں کا اصرار تھا کہ اشفاق اللہ خاں کی صورت دکھادوں۔ لیکن میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اسٹیشن پر میت کا دیدار کرایا جائے۔ چنانچہ اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے منہ سے کفن اٹھادیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سو رہے ہیں۔ لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ لوگوں نے ان پر اتنے پھول نچھاور کیے کہ نعش پھولوں سے چھپ گئی"۔

لکھنؤ اسٹیشن پر شہید کا استقبال :

"گاڑی فیض آباد سے روانہ ہوئی۔ میرا ڈبہ جس میں نعش تھی سب سے آخر میں تھا۔ ہر اسٹیشن پر لوگ آتے تھے اور دیکھتے تھے۔ گاڑی دو بجے لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچی اور پلیٹ فارم نمبر ۴ پر کھڑی ہوئی۔ شری گنیش شنکر ودیارتھی اور ان کے ساتھ کونسل کے نو ممبران گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ پی سی شاہ فوٹو گرافر بھی آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا اشفاق اللہ خاں کہاں ہیں؟ میں نے انھیں ڈبے میں لے جاکر دکھا دیا۔ اشفاق اللہ خاں کی صورت دیکھ کر ودیارتھی جی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، انھوں نے مجھ سے بڑی ہمدردی کی اور اشفاق اللہ خاں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے فوٹو گرافر سے کہا کہ فوٹو لے لیں۔ میں نے کہا جیل میں مجھے فوٹو نہیں لینے دیا گیا۔ کہا گیا کہ گورنمنٹ کا حکم نہیں ہے۔ ودیارتھی جی نے کہا ہم گورنمنٹ کو ٹھوکر سے مارتے ہیں۔ میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ خفیہ پولیس ساتھ تھی۔ فوٹو لے لیا گیا۔ میں نے ودیارتھی جی کو اشفاق اللہ خاں کا خط دیا، جو انھوں نے مجھے فیض آباد جیل میں ودیارتھی جی کے لیے دیا تھا۔ خط پڑھ کر ودیارتھی جی نے کہا کہ اشفاق اللہ خاں نے لکھا ہے کہ میرے بھائی محتاج ہو گئے ہیں۔ میری قبر آپ بنوایئے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا : قبر بنوانے کے لیے روپیہ میں بھیجوں گا۔ تمھیں قبر بنوانے کی ضرورت نہیں اور جو مجھ سے ہو گا، آپ کی مدد کروں گا۔

جب تک گاڑی رہی ودیارتھی جی موجود رہے اور مجھ کو تسلی دیتے رہے۔ ودیارتھی جی اشفاق اللہ خاں سے خاص محبت رکھتے تھے"۔

آخری رسوم :

"نعش لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۱ بجے شب کو شاہ جہاں پور پہنچی، جہاں ہزار ہا لوگ جمع تھے۔ نعش مکان پر لے جائی گئی۔ والدہ صاحب، بہن، بھاوج، غرضے کہ سب عزیز اور رشتہ دار تقریباً دو سو عورتیں موجود تھیں۔ والدہ صاحب نعش کے پاس آئیں اور اشفاق کی صورت دیکھی۔ اس وقت ان کا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ بالکل خاموش تھیں۔ صورت دیکھ کر ان کی زبان سے صرف یہ نکلا :

بیٹا سدھارو! ہم بھی جلد آئیں گے۔

والدہ کی ہدایت تھی کہ کوئی روئے دھوئے نہیں! تمام رشتہ دار عورتوں نے بہت ضبط کیا، لیکن پھر بھی ان میں سے بعض کی چیخیں نکل گئیں اور پچھاڑیں کھا کھا کر گر پڑیں۔

دو بجے شب کو تدفین عمل میں آئی"۔

ان کا آبائی مکان محلہ ایمن زئی میں ہے۔ یہ محلہ شاہ جہاں پور کے ریلوے اسٹیشن کے شمال میں محلہ جلال نگر سے متصل ہے۔ مکان کے قریب ہی ان کا مزار ہے۔ اہل محلہ اور باشندگان شاہ جہاں پور کو تو فکر نہیں کہ یہاں کون آسودہ خواب ابدی ہے لیکن آل انڈیا یا صوبائی سطح کا کوئی رہنما شاہ جہاں پور آتا ہے یا وہاں سے گزرتے ہوئے ان کے مزار کے درشن یا زیارت کرنے پہنچ جاتا ہے۔

باب نہم

عظمت موت کے دروازے پر

مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کے دور ثالث (۱۹۲۷ء) میں "انسانیت موت کے دروازے پر" مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ایک نہایت عبرت آموز اور متاثر کن مضمون شائع ہوا تھا، جو ہندوستان پاکستان سے متعدد بار کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کا یہ عنوان بہ تصرف ادنی اسی سلسلۂ مضمون سے مستعار ہے۔

اور یہ پورا باب زعیم ملت اسلامیہ ہندیہ مولانا محمد کے اخبار ہمدرد، دہلی مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۸ء کے صفحہ "شعروسخن" سے مستعار ہے۔ ادارے نے اشفاق اللہ خاں شہید کی زندگی کے آخری وقت کی کیفیات پر ایک موثر نوٹ کے ساتھ ایک فارسی نظم بھی شائع کی تھی، جس میں موت کے دروازے پر شہید کے قلب کے اطمینان کی صورت بیان کی ہے اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ یہ حیرت انگیز صورت حال اور متاثر کن جذبات قارئین کی نذر ہیں۔

اس نظم کے پختہ کار شاعر اور ترجمانِ حقیقت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس واقعے پر پورے چھیتر (۷۶) برس کے لیل و نہار گزر چکے ہیں۔ دنیا متعدد بھونچال سے گزر چکی ہے۔ برصغیر ہندپاکستان میں بھی کئی انقلاب آچکے ہیں۔ گوناگوں مشکلات نے تحقیق کے راستے میں پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ بہر حال ہم گمنام شاعر کے حق میں دعا گو ہیں۔ اس نے آخری وقت کی کیفیت کی خوب ترجمانی کی ہے اور جذبات دلی کا ایک حسین مرقع تیار کر دیا ہے۔ ہم قارئین کرام کو ہمدرد کے پُر اثر نوٹ اور شاعر حقیقت ترجمان کے جذبات کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔

نوٹ یہ ہے :

"اشفاق اللہ خاں مرحوم کا آخری وقت :

محمد اشفاق اللہ مرحوم جس کو کاکوری کے مقدمہ کے سلسلہ میں ۱۹ر دسمبر کو فیض آباد جیل میں پھانسی دی گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس جوانمرگ نے انھی

کپڑوں میں پھانسی پر چڑھائے جانے کی خواہش کی تھی جو اپنی سزایابی کے دن پہنے تھا۔ مرحوم نے خود غسل کیا اور اپنا سارا جسم خوب مل مل کر دھویا اور شام کو قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہا۔ پھانسی کے روز علی الصباح اس نے جونہی کپڑے بدل کر نماز پڑھی اور قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر اس کو اپنے گلے میں ڈالے ہوئے کوٹھری سے اس طرح نکلا کہ اس کے چہرہ پر کوئی خوف وہراس کے آثار نہیں تھے اور وہ کلمہ پڑھتا ہوا پھانسی کی جگہ تک گیا اور اپنا سر اونچا کیے ہوئے احاطہ کے اندر داخل ہوا اور پھانسی کی رسّی کو بوسہ دیا اور کلمہ و آیات قرآنی پڑھنی شروع کیں۔ ان حالات سے متاثر ہو کر ایک صاحب نے حب وطن کے اس پُر جوش شیدائی کی سزائے موت پانے کے حالات پر ذیل کے اشعار لکھ کر ہمارے پاس بھیجے ہیں جن کو ہم ہدیۂ قارئین کرتے ہیں"۔ (ہمدرد)

اور گمنام شاعر کے اشعار یہ ہیں :

آں حلاوت کو بگیرد در دل مومن مکاں

ترس چیزے را نماند در دلش جاء و مکاں

دار را بوسہ کناں گل بانگ ایماں می زند

می زند بانگِ شہادت تا باوجِ آسماں

دار را گوید کہ قربانت شوم اے جاں ستاں

تو رسانی مر مراد وصل آں سلطانِ جاں

بود این دنیائے فانی بس حجاب آں چناں

واں رہانم زیں جمالش تا در آئم در جہاں

تا بہ بینم جلوۂ نور خدائے لا مکاں

ہم بہ بینم نور پیغمبر رسولِ انس و جاں

بود ایں حالت ·آں جری اشفاق را

ایزدم جانش رساند در فرادیس و جناں

در گرفت قرآن را ہم چوں حمائل در بغل

آں کلام اللہ گو ہست قوت روح انس و جاں

هر زبان حال بود را ز گویاں با اجل
می رود پیش خدا قرآن جاناں در بغل
گر گناہم بیش و جرم بیش ہست
باکہ ہست از نکوئی دستم تہی یا در ذلل
من نیم نامید از مہر خدائے داور
می رود پیش خدا قرآن جاناں در بغل
مومناں قرآن راکن در دل پیہم در بغل
تا رہی از فکر دیو و ہم ز وسواسِ دغل
چوں رود پیش خدایت بود ایں ست دلیل
آمدم پیش خدا قرآن دارم در بغل
حافظا اکنوں دعا کن تا خدا آساں کند
تا بگوئی پیش او قرآن دارم در بغل
حال اشفاق ہمدم می گفت باگروہِ حاضراں
می روم پیش خدا قرآنِ جاناں در بغل
ای عزیزو ای برادر مادرم را گو سلام
تا نرنجد گر روم پیش خدائے عزّ و جل
تحفہ بس بے بہائے می برم زینجا بخود
می روم پیشِ خدا قرآن جاناں در بغل
مادر من رنج مکن بس انتظارت می کنم
در جناب سرورِ ہم در حضورِ عزّ و جل
مومناں را ہست منزل در مقام علّیین
ہستند آنجا انبیاء و اتقیائے باعمل
گر نیم با عمل امیدوارم از خدا
می روم پیش خدا قرآنِ جاناں در بغل

باب دہم

افکارِ سیاسی

سیرت یا کیریکٹر کی پختگی کا دارومدار عقاید کی صحت اور اس پر یقین کامل و محکم پر ہوتا ہے۔ اگر عقیدے میں رسوخ اور پختگی نہ ہو تو اس بنیاد پر سیرت کی مضبوط تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اشفاق اللہ خاں کی سیرت کی عظمت اور پختگی کا راز بھی ان کے عقاید سیاسی کی محکمی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے حالات کے مطالعے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ

۱- وہ زندگی صرف آزادی کی زندگی کو سمجھتے تھے۔ غلامی کے تصور سے خواہ وہ کسی قسم کی غلامی ہو وہ موت کو بہتر سمجھتے تھے۔

۲- تحریک آزادی کی کامیابی کے لیے وہ ہندو مسلم اور دوسرے لفظوں میں وہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ اتحاد ضروری اور لازمی سمجھتے تھے۔

ان دونوں باتوں کے خلاف وہ کوئی بات سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک اس اتحاد کے بغیر نہ آزادی کا حصول ممکن تھا اور نہ ایک باوقار اور باعزت زندگی کا قیام ہی ممکن تھا۔

۳- ان کے خیال میں ہندوستان کے لیے جمہوری نظام ہی مناسب طرز حکومت تھا۔

۴- وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ملک اور قوم کے لیے ایک لعنت خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا موجودہ جاگیردارانہ نظام انگریز نے اپنے مصالح اور استعمارانہ مقاصد کے حصول کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی طرح ہندوستان کا سرمایہ دارانہ نظام ہندوستان میں انگریز کے استعماری مقاصد کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔

۵- ان کا یہ بھی پختہ خیال تھا کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ اس کی ترقی کا راز زراعت میں پوشیدہ ہے۔ زراعت کے کام کو ملک کی ترقی کے لیے وہ ایک مقدس

عمل سمجھتے تھے۔

۶- اس کے ساتھ وہ ایک خاص حد تک صنعت کے فروغ کو بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ ملک اپنی زندگی کی ضروریات میں ہر پہلو سے خود کفیل ہو۔ اور ضروریات کی جن اشیاء میں وہ درآمدات کے لیے مجبور ہو، اس کے مطابق وہ اپنی مصنوعات کی برآمد سے زرمبادلہ کما سکے۔ وہ صنعت کاروں کو اس حد تک چھوٹ دینے کے خلاف تھے کہ وہ ملک ہی کو لوٹ مار کا بازار بنالیں اور عوام ان کے اسیر اور نخچیر بن کر رہ جائیں۔

آزادیٔ وطن کا آرزومند

اشفاق اللہ خاں آزادی کے متوالے تھے۔ پابندی انھیں کسی قسم کی گوارا نہ تھی۔ وہ خود آزاد رہنا چاہتے تھے۔ آزادی کی جدوجہد ان کی زندگی کا مقصد تھا اور وہ اسی راہ میں اپنی زندگی کو بِتادینا عین حیات سمجھتے تھے۔ بنارسی لال چترویدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

> "ملازمت کے معنی ہیں اپنے ضمیر کا خون کر دینا۔ اور یہ بات تمھیں اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں آزادی کا پجاری ہوں اور اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ غلامی کا طوق میں اپنے گلے میں ہرگز ڈالنا نہیں چاہتا، خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ میں اس کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں اور جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو گھنٹوں روتا رہتا ہوں۔ لیکن میرے عزیزوں کی خواہش ہے کہ میں کوئی ملازمت ضرور اختیار کرلوں اور اس طرح مجھے اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرنی چاہیے۔ بلاشبہ یہ بات درست ہے اور ہمارے مذہب کی تعلیم بھی یہی ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اس کے بعد مجھے مادرِ وطن کی خدمت کا موقع نہ مل سکے گا۔
>
> اگر میں بھوپال میں ملازمت کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو سر اسرار حسن خاں مجھے فوراً کوئی نہ کوئی ملازمت دلادیں گے ... اور مجھے امید ہے کہ ان کی سفارش سے مجھے فوج میں صوبے دار کا عہدہ مل جائے گا۔ لیکن اس کا

نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ کہ میرے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ مجھے صرف اس لیے تو اپنی زندگی عزیز نہیں کہ روپیہ کماؤں اور عیش کروں۔ میں تو وطن کی آزادی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے لیے بڑے سے بڑے کی بھی پروا نہیں کرتا۔ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ دنیا مجھے دیوانہ یا پاگل کہہ کر پکارے گی۔ آزادی میرا عقیدہ ہے۔ میں اسی کے لیے زندہ رہوں گا اور اسی کے لیے جان دوں گا"۔

کھیتی باڑی کی اہمیت :

اشفاق اللہ خاں نے اس خط میں بنارسی لال کو اپنی زمینوں میں کھیتی باڑی کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کے اس خط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھیتی باڑی کو کتنا مقدس، مفید اور ہندوستان کی آزادی کے لیے اسے کتنا اہم سمجھتے تھے۔ اس خط کا یہ جملہ ان کے ان خیالات کی عکاسی کرتا ہے :

"ہمارے لیے دنیا میں اگر کوئی مقدس اور مفید کام ہے تو وہ کھیتی باڑی ہے"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں :

"اگر میرے پاس سرمایہ ہوتا تو میں تمھیں یہ کچھ نہ لکھتا، بلکہ کام شروع کر دیتا اور تمھیں اپنا حصہ دار بنا لیتا۔ مگر افسوس! میرے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے اور میرے رشتہ دار اس کام میں کسی قسم کی امداد کرنے کی بجائے غلامی کے قعر مذلت میں ڈھکیلنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی کی اہمیت اور اس بات کو قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ ہندوستان کی آزادی کا انحصار کسانوں پر ہے۔ اس لیے آؤ ہم اکٹھے کھیتی باڑی کریں"۔

چند اقوال زرّیں :

وہ کاشتکاری کو اس لیے بھی ضروری خیال کرتے تھے کہ اس کے ذریعے وہ اس قابل ہو جاتے کہ اپنے انقلابی مقاصد کو بروئے کار لا سکیں۔ اپنے بھتیجوں کے نام اپنے پیغام میں انھوں نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ان کے بھتیجوں کے نام ان کا آخری

پیغام و نصیحت نہیں، بلکہ یہ زرّیں خیالات برصغیر کے باشندوں اور تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہیں۔ وہ اس پیغام میں لکھتے ہیں :

۱- ''آزادی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

۲- وہ انسان جس کے دل میں آزادی کی لگن اور وطن کی محبت نہیں، وہ کنکر پتھر سے بھی بدتر ہے۔

۳- سب سے بدبخت وہ انسان ہے، جس نے غلام ملک میں پیدا ہو کر بھی آزادی کے لیے کبھی نہ سوچا۔ وہ غلام پیدا ہوا، بڑا ہوا اور مر گیا۔

۴- خدا کی اطاعت اور وطن کی محبت انسانیت کے اعلیٰ جوہر ہیں۔

۵- غلام ملک کا باشندہ خواہ کتنا ہی معزز، تعلیم یافتہ، خاندانی اور سرمایہ دار کیوں نہ ہو، اس کی کہیں عزت نہیں۔

۶- عزت آزادی میں ہے، نہ کہ سرکاری خطابات اور مال و دولت میں۔

۷- آزادی کے لیے جیو اور آزادی کے لیے مرو۔

۸- ہمیشہ اپنے اپنے ارادوں پر قائم رہو، دوستوں کے ساتھ سچے بنے رہو، راز کو پوشیدہ رکھو، مشکلات اور پریشانیوں سے بالکل نہ گھبراؤ۔ بہادر بن کر زندہ رہو اور بہادری کی موت مرو۔

۹- بہادر کی موت ایک بار آتی ہے۔ مگر بزدل ہر روز سو بار مرتا ہے''۔

یہ ایک سچے مسلمان اور کھرے پٹھان کے حقیقی اسلامی جذبات ہیں اور قوم پرور اور وطن پرستانہ خیالات ہیں۔ یہ ایک محبِّ وطن کے سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل افکار ہیں اور اگرچہ مخاطب ان کے بھتیجے ہیں، لیکن یہ ایسے بصائر و حکم ہیں جنھیں ہر نوجوان کو حق بین نگاہوں سے دیکھنا اور گوش حقیقت نیوش سے سننا اور دل سے ان کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نیز ہر شخص کو انھیں اپنی زندگی کا شعار اور اپنی قومی سیرت کا کلاہِ افتخار بنا لینا چاہیے۔

ہندو مسلم اتحاد :

ہندوستان میں فرقہ وارانہ اتحاد کا مسئلہ گزشتہ ایک صدی سے وقت کا بہت بڑا مسئلہ

رہا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت سے کبھی کسی سیاسی رہنما اور مدبّر نے انکار نہیں کیا۔ لیکن سب سے زیادہ رکاوٹیں بھی انھی رہنماؤں کی طرف سے پیدا کی گئیں۔ اور یہ مسئلہ سلجھنے کی جگہ روز بہ روز الجھتا ہی گیا۔

دوسری بہت سی قدیم و جدید اقوام کی طرح مسلمان بھی یہاں باہر سے آئے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا۔ اس کی تعمیر کی، اس کی ترقی میں حصہ لیا، انھوں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا اور خود اس کے دُکھ درد میں شریک ہوگئے۔ ان کے آنے سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک شان دار دور شروع ہوا۔ زراعت، صنعت، تعلیم، کلچر، رسم و رواج، مذہب، سیاست ہر لحاظ سے ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک کا ظہور ہوا۔ انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی اور دفاع کو اپنی عزت و آبرو اور اپنے دفاع کا مسئلہ بنالیا۔ وہ اپنی عادات و خصائل، رسم و رواج، تاریخ و روایات میں ایک متحدہ قوم کے سانچے میں ڈھل گئے۔ ہندوستان کی قدیم اقوام نے مسلمانوں کی لائی ہوئی تہذیب، تمدن، رسم و رواج، عادات و اطوار، طرز بود و ماند حتیٰ کہ مذہبی افکار و عقائد کو اس حد تک اپنایا کہ دوئی کا فرق مٹ گیا۔ مذہبی اصلاح اور ایک نئی قوم کی تعمیر میں مسلمانوں کے علوم و افکار اور مذہبی تعلیمات سے اتنا استفادہ کیا کہ نئے نئے مت وجود میں آئے اور انھوں نے عوام میں فروغ پایا اور مقبولیت حاصل کی۔ شاعروں، سادھوؤں، سنیاسیوں، مدبّروں، مصلحوں اور تعلیم یافتوں میں ایسی شخصیات پیدا ہوئیں کہ بعض اوقات ناموں کی تہمت کے سوا سب کچھ مسلمانوں کا تھا یا وہ ایک نئے عالم کی مخلوق تھے۔ اسی طرح عام مسلمان بھی عقاید و اعمال کے لحاظ سے بمقابلہ اسلام غیر مسلموں اور ہندوانہ عقاید و افکار سے قریب تھے اور ہندوستانی رسوم و رواج میں گرفتار تھے۔ لیکن بحث یہ تھی کہ وہ پہلے مسلمان ہیں یا ہندوستانی؟ حال آں کہ یہ دونوں باتیں صرف رسماً درست معناً غلط تھیں وہ نہ سچے مسلمان تھے اور نہ سچے ہندوستانی! وہ نہ اسلام کے تقاضے پورے کرتے تھے نہ ہندوستانی ہونے کے ناتے اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔

ہندوستان پر جتنا حق ہندوؤں کا تھا، اس سے ذرا کم مسلمانوں کا تھا۔ اس حق کا تقاضا تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ برٹش استعمار اور حکومت کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ لیکن افسوس کہ وہ ایک دوسرے سے اتحاد و اتفاق کی بجائے ایک دوسرے کے درپے آزار ہوگئے

تھے۔ اشفاق اللہ خاں کو اس صورتِ حالات پر بہت قلق تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک قوم کی تباہی اور نقصان سے دوسری قوم بے تعلق نہیں رہ سکتی، ایک قوم کی بربادی پر دوسری قوم کی ترقی اور پُر امن معاشرے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

ہندو مسلم اتحاد کا گیند کسی ایک قوم کی جھولی میں نہیں گر سکتا۔ اس کا فائدہ ہندوستان کی تمام قوموں کو پہنچ گا۔ اس کے نتیجے میں وطن آزاد ہوگا۔ ملک آزادی اور تعمیر و ترقی کے ایک دور میں داخل ہوگا۔ دنیا کے قوموں میں عزت اور احترام کا مقام حاصل کرے گا۔ اشفاق اللہ خاں اس دور کی خوشیوں سے اپنے دامن کو بھر لینا چاہتے تھے۔ لیکن حالات نے ان کے دل پر زخم لگائے اور رنج و غم اور مایوسی ان کے حصے میں آئی۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب کہ پوری دو دہائیاں گزر چکی تھیں۔ تبلیغ و تنظیم اور شدھی سنگھٹن کی تحریکوں نے اتحاد اور یک جہتی کی تحریک اور عمل کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ افسوس کہ دونوں قومیں وطن کی دلہن کے سنگھار کو نوچ رہے تھے اور اس کے حسین چہرے کو زخمی کر دیا تھا لیکن زعم میں مبتلا تھے کہ وہ اسے بنا رہے اور اس کے حسن کو سنوار رہے تھے۔ اشفاق اللہ خاں کا خیال تھا کہ شدھی اور تبلیغ کی دونوں تحریکوں کے پیچھے انگریز کا ذہن فتنہ ساماں اور دستِ فریب کار چھپا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ تحریکیں ملک کو اس کی تعمیر اور آزادی کے مقصد سے دور لے جارہی ہیں۔ ان میں مذہب کے مقدس نام کی شمولیت کے باوجود ان کی سرشت میں فتنہ چھپا ہوا ہے۔ وہ انھیں ہندوستان کی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی زندگی اور پُر امن فضا کے لیے تباہ کن خیال کرتے تھے، ان کا یہ خیال کتنا حقیقت پسندانہ تھا کہ نہ تو ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان شدھ کیے جاسکتے ہیں، نہ بائیس کروڑ ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاسکتا ہے۔ پھر اس صورت میں کہ تبلیغ اور شدھی کی دو متحارب تحریکیں ایک دوسرے کے مقابل چل رہی ہوں کسی شخص کو اپنے عقاید و اعمال کی صحت و صواب کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔ البتہ انگریز اس سے جو فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور ملک کو اس سے جو نقصان پہنچ رہا ہے، اسے کون روک سکتا ہے۔

اشفاق اللہ خاں نے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت پر شدھی اور تبلیغ کی تحریکات کے نتائج اور اس کے مختلف پہلوؤں پر برادرانِ وطن کے نام اپنے پیغام میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک ان خیالات کی اہمیت کا تعلق ہے، ان کی حیثیت صرف ایک تاریخی

تحریر یا ایک انقلابی کے وقتی خیالات اور جذبات ہی کی نہیں بلکہ جس طرح ان کی افادیت ماضی میں تھی، آج بھی ہے اور مستقبل کی آخری حد تک دراز رہے گی۔ اشفاق اللہ خاں نے ہندو مسلم اتحاد پر بحث کرنے سے پہلے ملک کی حالت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

"برادرانِ وطن! میں اس پاک اور مقدس وطن کی قسم کھا کر کہوں گا کہ ہم ننگ و ناموس وطن پر قربان ہو گئے ہیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہ تھی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ نت نئے مظالم ہو رہے ہیں اور غریب ہندوستانی ہر حصہ ملک اور خطۂ دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ اس کے لیے نہ کہیں ٹھکانا ہے اور نہ کوئی سہارا ہے! قصہ مختصر یہ کہ ہمارا وطن بھی ہمارا نہیں ہے۔ ہم پر ٹیکسوں کی بھرمار، ہماری حالت کا روز بہ روز گرتے جانا، تینتیس کروڑ بہادر ہندوستانی غیر مسلح، بھیڑ بکریوں کی طرح بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمارے گورے آقا ہمیں ٹھوکریں ماریں تو ان سے باز پُرس نہ ہو، جلیان والا باغ کو نمونۂ حشر بنا دیں، ہماری ماؤں کی بے عزتی کریں، ہمارے بوڑھوں اور معصوم بچوں پر بم کے گولے اور مشین گنوں کی گولیاں برسائیں اور ہر نیا دن ہمارے لیے نئی مصیبتیں لے کر آیا اور پھر بھی ہم سب بادۂ غفلت میں مدہوش اور عیش و عشرت میں مست رہ کر ایام نوجوانی اور عہد شباب کو گزار دیئے! اس لیے ہم نے یہ خیال کر کے کہ

جنونِ حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے!

جو بھی کیا بھلا کیا۔ آج ہم ناکام رہے۔ اگر ہم کامیاب ہوتے تو محبِّ وطن کے نام سے پکارے جاتے اور جو ہم پر جھوٹی گواہیاں دے گئے، وہ ہمارے نام کی جیکار لگاتے..."۔

ان حالات کی وضاحت کے بعد وہ شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کے پیچھے انگریزوں کی فتنہ انگیزیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ملک کے ان اعلیٰ دماغوں پر افسوس کرتے ہیں جو ملک کی رہنمائی کے ذمہ دار ہیں، لیکن حالات سے بے خبر اور انگریز کے بچھائے ہوئے دام میں پھنستے چلے جاتے ہیں اور اس بات کا انھیں بالکل احساس نہیں۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

"آہ! کیا ایسے دور میں زندگی پیاری خیال کی جاسکتی ہے، جب کہ ہماری سیاسی گروہ میں خلفشار مچا ہوا ہے۔ کوئی تبلیغ کا دلدادہ ہے تو کوئی شدھی پر مر مٹنے کو باعث نجات سمجھ رہا ہے۔ مجھے تو رہ رہ کر غصہ ان دماغوں اور عقلوں پر آرہا ہے جو کہ ملک کے بہترین دماغ اور ماہرین سیاست ہیں۔ کاش کہ وہ آزادی مصر کی جدو جہد، احرارِ مصر کے کارنامے اور برطانوی چالیں اسٹڈی کر لیں اور پھر ہمارے ہندوستان کی موجودہ حالت سے اس کا مقابلہ و موازنہ کریں۔ کیا ہندوستان کی ٹھیک وہی حالت اس وقت نہیں ہے کہ گورنمنٹ کے خفیہ ایجنٹ مذہبی بنیادوں پر پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد مذہب کی حفاظت، اشاعت، تبلیغ یا شدھی نہیں ہے، بلکہ چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانا (یعنی آزادی کی تحریک کا رُخ موڑنا اور ملک کے اتحاد کو تہس نہس کرنا) ہے۔...

میں اپنے ہندو اور مسلمان بھائیوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب ڈھونگ ہے جو سی آئی ڈی کے خزانے کے روپے سے رچایا گیا ہے"۔

ان کے یہ خیالات کتنی واضح اور کھلی ہوئی حقیقت ہیں، انھیں جھٹلانے کی کون جرأت کر سکتا ہے؟

"بھائیو! تمھاری یہ خانہ جنگی، تمھاری آپس کی پھوٹ، تم دونوں میں سے کسی کے لیے سودمند نہ ہوگی۔ یہ غیر ممکن ہے کہ سات کروڑ مسلمان شدھ کر لیے جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی مہمل ہے کہ بائیس کروڑ ہندو مسلمان بنا لیے جائیں۔ مگر ہاں! یہ آسان ہے کہ یہ سب غلامی کا طوق گلے میں ڈالے رہیں"۔

اس کے بعد وہ اہل ہند کی غیرت کو للکارتے ہیں:

"اے وہ قوم! جس کا کوئی جھنڈا نہیں، اے وہ قوم کہ تیرا وطن تیرا وطن نہیں! اے وہ قوم جو دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے رحم کی درخواست پر نظر رکھتی ہے! یہ میری اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ تو غلام ہے اور پھر بھی وہ غلطیاں کر رہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تو غلامی کا

دھبہ چھوڑ جائے گی اور تیرے بعد جو بھی سرزمین ہند پر قدم رکھے گا، غلامی میں مرے گا"۔

اس کے بعد وہ نہایت پُر سوز اور دلدوز آواز میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں :

"اے خداوند قدوس! کیا کوئی ایسا سویرا نہیں آئے گا کہ تیرا آفتاب آزاد ہندوستان پر چمکے اور فضائے ہند آزادی کے نعروں سے گونج اٹھے"۔

اشفاق اللہ خاں نے یہ تحریر ۱۹۲۷ء میں جب کہ وہ پھانسی کے انتظار میں فیض آباد کی جیل میں تھے، لکھی تھی۔ اس کے ٹھیک بیس برس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ۱۵/اگست کی صبح کو طلوع ہونے والا آفتاب آزاد ہندوستان کی سرزمین پر چمکا تھا اور ملک کی فضا آزادی کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔ ان کے خواب کو تعبیر مل گئی تھی، لیکن افسوس کہ یہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء والا ہندوستان نہیں تھا اور ایسا اتحاد کہیں نظر نہیں آتا تھا جس کا نظارہ چشم فلک نے احمد آباد کانگریس کے اجلاس کے موقع پر دیکھا تھا، جب کہ ۱۹۲۲ء میں انھی ایام میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بھی ہو رہے تھے اور ایک اجلاس کا مندوب اور زایر و شایق دوسری جماعتوں کے اجلاسوں میں شوق کے ساتھ آزادانہ اور بے دھڑک شریک ہو رہا تھا۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

"کانگریس والے ہوں یا سوراجسٹ، تبلیغ والے ہوں یا شدھی والے، کمیونسٹ ہوں یا ریولیوشنری، اکالی ہوں کہ بنگالی، میرا پیغام ہر فرزند وطن کو پہنچے۔ میں ہر اس شخص کو اس کی عزت و مذہب کا واسطہ دیتا ہوں اور اگر وہ مذہب کا قائل نہیں ہے تو اس کے ضمیر سے یا جس عقیدے کو بھی وہ جانتا ہو، اس کے واسطے سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم کاکوری کیس کے مر جانے والوں پر ترس کھاؤ اور پھر ہندوستان کو ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء والا ہندوستان بنا دو! پھر احمد آباد کانگریس کا سا اتحاد و اتفاق سامنے ہو۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو اور مکمل آزادی کا جلد از جلد اعلان کر کے ان گورے آقاؤں کو بتا دو کہ یہ کالے اب کینچلی اتار چکے، اب یہ کسی منتر سے رام نہ ہوں گے"۔

اس کے بعد انھوں نے شدھی اور تبلیغ والوں کو خاص طور پر مخاطب کیا ہے۔ ان

کے الفاظ کس قدر درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ سوال ان کا کتنا فکر انگیز ہے کہ کیا غلام قوم کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟ وہ لکھتے ہیں :

> "تبلیغ اور شدھی والو! خدارا آنکھیں کھولو! دیکھو تم کہاں تھے اور کہاں پہنچ گئے؟ آج کون ایسا ہندو اور مسلمان ہے جو مذہبی آزادی اتنی رکھتا ہو، جتنا اسے حق ہے! کیا غلام قوم کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟ تم اپنے مذہب کا سدھار کیا کر سکتے ہو؟ آپس میں مل جل کر رہو اور متحد ہو جاؤ! سارے ہندوستان کی بد بختی کا بار تمھاری گردن پر ہے۔ غلامی کا باعث تم ہو"۔

اتحاد اسلامی :

آزادی کے بارے میں ان کے شدید احساسات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غلامی سے انھیں صرف اس لیے ہی نفرت نہ تھی کہ وہ انگریز کی غلامی تھی۔ بلکہ وہ ان کے نزدیک اس لیے قابل نفرت تھی کہ وہ غلامی تھی۔ غلامی ان کے نزدیک ایک شرمناک چیز تھی۔ خواہ برٹش استعمار کی ہو، خواہ ٹرکی یا افغانستانی شہنشاہیت کی۔ انگریز سے نفرت تو ان کے رگ و ریشہ میں بچپن سے سرایت کیے ہوئے تھی۔ تحریک اتحاد اسلامی کے دور میں کہیں ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے تو یہ بہتر ہے کہ ترک یا افغان ہندوستان پر حملہ کر دیں اور ...... ہم ان کی رعایا بن جائیں! لیکن بعد میں جب ان کے حریت پسندانہ خیالات میں پختگی آئی تو انھیں یہ خیال بھی شرمناک معلوم ہونے لگا۔ وہ لکھتے ہیں :

> "روز و شب یہی دعا کرتا تھا کہ ترک ہندوستان کو فتح کر لیں اور یہاں کے بادشاہ بن جائیں، ہم خلیفہ وقت کی رعایا بن جائیں گے اور اگر افغانستان نے حکومت قائم کر لی تو بھی کیا ہے، ہم پھر بھی حقدار ہیں۔ لیکن اس وقت کا یہ خیال آج مجھے بہت ذلیل معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک کا حلقہ غلامی اتار کر دوسرے کی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھنے میں مسرت سی محسوس کرتے تھے"۔

اشفاق اللہ خاں نے اس دور کو اپنی ناسمجھی کا زمانہ قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ آگے

چل کر لکھتے ہیں :

"دنیا میں اختلافات و تغیرات کتنی تیزی سے ہوا کرتے ہیں۔ کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں۔ کل میں ترکوں کی حکومت اپنے اوپر باعث صد ناز وافتخار اور ذریعہ بخشش سمجھتا تھا اور آج بدترین ذلت!"

ان کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے باب میں کتنے سنجیدہ اور کتنے پختہ فکر تھے اور اس باب میں ان کا ذہن کتنا صاف اور کیسا سلجھا ہوا تھا۔ آزادی کے باب میں جب تک فکر اتنی ہی پختہ اور ذہن اتنا ہی صاف اور سلجھا ہوا نہ ہو، نہ آزادی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا تحفظ اور دفاع ہی کیا جاسکتا ہے۔

وہ اسلامی ممالک سے تعلقات رکھنے اور ان کی مصیبتوں اور دکھوں میں کام آنے کے خلاف نہ تھے، لیکن وہ ان سے ہمدردی، ان کی دستگیری اور ان کے لیے ایثار و قربانی کے ایک حد تک قائل معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس ہمدردی اور ایثار کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے اپنی آزادی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

"اس وقت کے لیڈر آج بھی اتحاد اسلامی پر عمل کرتے ہیں۔ گو کہ ایک حد تک میں بھی ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ بھائی سمجھنے میں کوئی نقصان نہیں۔ مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ کیوں کہ ہم فیاض ملک کے فیاض باشندے ہیں۔ لیکن کسی حکومت کو اپنے اوپر مسلط کر لینا بالکل دوسری بات اور جان بوجھ کر دوسرے کی غلامی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لینے کے برابر ہے۔ یہ بہت کم عقلی کی اور بدبختی کی بات ہے۔ یہ کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں ہو سکتی"۔

ان چند جملوں میں انھوں نے ایک خوددار اور حریت پسند قوم کی پوری سیاسی حکمت عملی اور برادر ملک سے اپنے حدود اور خارجہ پالیسی بیان کردی ہے۔ یہ بات ان کی سیاسی بصیرت، اعلیٰ تدبّر اور کمالِ غیرت قومی پر دلالت کرتی ہے۔

کمیونسٹوں سے خطاب :

اشفاق اللہ خاں نے کمیونسٹوں اور ان کے انداز فکر کے بارے میں بھی اظہار خیال

کیا ہے۔ بر صغیر میں کمیونسٹ تحریک اور ان کا نظریہ گزشتہ صدی میں بحث و نظر کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ بلاشبہ انگریزوں کے خلاف تحریک میں اور آزادی وطن کی جنگ میں ان سے تقویت پہنچی ہے۔ لیکن ملک سے ان کی وفاداری شک و شبہ سے بالا کبھی نہیں رہی۔ غالباً وہ ملک کے مفاد کے مقابلے میں اپنے نظریے کے وفادار رہے ہیں۔ کسی نظریے کی صحت اور رویّے کی مقبولیت کے دو طریقے ہیں؛

☆ ایک یہ کہ اپنے ملک کے مخصوص سماجی، ثقافتی، مذہبی اور تاریخی و جغرافیائی حالات کے تناظر میں ملک کے بہترین مفاد اور اہل ملک کی فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے ملک اور قوم کا سیاسی و معاشی مطمحِ نظر قرار دینا۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحت مند نظریہ اور معقول رویّہ ہے۔

☆ دوسرے یہ کہ کسی سیاسی یا معاشی نظریے پر ایمان لاکر، خواہ وہ کتنی ہی دیانت اور کیسے ہی بے میل اخلاص پر مبنی ہو، کسی ملک کے قدرتی اور جغرافیائی حالات اور اس کی آبادی کی مخصوص سماجی، ثقافتی، تاریخی اور مذہبی اقدار اور روایات کو نظر انداز کر کے اپنے پسند کیے ہوئے سیاسی اور معاشی نظریات کو ملک اور اس کی آبادی کے سر تھوپنے کی کوشش کرنا! میرا خیال ہے کہ یہ نظریہ اور رویہ صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا اور کمیونسٹوں کا نظریہ اور رویّہ کچھ اسی قسم کا رہا تھا!

اشفاق اللہ خاں نے ان کی بعض خوبیوں اور کارگزاریوں کے اعتراف کے باوجود ان کے انداز فکر پر تنقید کی ہے اور ان سے ایسا اندازِ فکر بدلنے اور خالص قومی اور بر صغیر کے مخصوص حالات و مفادات کے پیش نظر اپنے رویّے کو بدلنے کی توقع کا اظہار کیا ہے۔ کمیونسٹوں کے رویے پر ان کا تبصرہ نہایت فکر انگیز ہے۔ اس سے ان کے انداز فکر اور سیرت کے ایک نئے گوشے اور خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں غریب کسانوں اور مزدوروں کی کتنی اہمیت اور ان کی حالت کیسی زار ہے۔ اس لیے ان کے تبصرے کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ تبصرہ انھوں نے برادرانِ وطن کے نام اپنے پیغام میں کمیونسٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "کمیونسٹ گروپ سے اشفاق کی گزارش ہے کہ تم ایک غیر ملکی تحریک کو لے کر ہندوستان آئے ہو۔ اس لیے اپنے آپ کو غیر ملکی ہی تصور

کرتے ہو۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اپنے اپنے اصل اور ہندوستانی رنگ میں آجاؤ! دیس کے لیے جیو، دیس کے لیے مرو! میں تم سے کافی طور پر متفق ہوں اور کہوں گا کہ میرا دل ہمیشہ غریب کسانوں اور دکھیا مزدوروں کے لیے دکھی رہا ہے۔ اپنے ایام فراری میں بھی اکثر ان کی حالت دیکھ کر میں رویا ہوں۔ کیوں کہ مجھے ان کے ساتھ دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔

مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ میرا بس چلے تو میں دنیا کی ہر ممکن چیز ان کے لیے وقف کر دوں۔ ہمارے شہروں کی رونق، ان کے دم سے ہے۔ ہمارے کارخانے ان کے دم سے آباد اور کام کر رہے ہیں۔ ہمارے کنوؤں سے ان کے ہاتھ پانی نکالتے ہیں۔ غرضے کہ دنیا کا ہر کام انھیں کے دم سے ہوا کرتا ہے۔ غریب کسان برسات کی موسلادھار بارش میں اور جیٹھ بیساکھ کی تپتی ہوئی دوپہر میں کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ہماری خوراک اور عیش و راحت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ بالکل سچ ہے کہ وہ خود دکھ اور تکلیف میں اور مفلوک الحال رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ پیدا کرتے ہیں، اس میں ان کا حصہ نہیں ہوتا یا بہت تھوڑا ہوتا ہے اور ان کی محنت سے ہم عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی اس خستہ و مفلوک الحالی کے ذمہ دار ہمارے گورے آقا اور ان کا نظام ہے۔ مگر اس کا علاج کیا ہے کہ وہ اس حالت میں آجائیں کہ اپنی اہمیت کو محسوس کرنے لگیں اور ان کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو''۔

اشفاق اللہ خاں نے مرض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ اس کا علاج اور روگ کی دارو بھی تجویز کر دی ہے۔ لیکن مرض کی تشخیص اور دارو کی تجویز کے ساتھ انھوں نے بہت لطیف پیرایے میں کمیونسٹ دوستوں کو بھی ان کی بعض خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ برصغیر میں کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا مرکز اور میدانِ عمل شہری زندگی رہی ہے۔ جن لوگوں نے کمیونسٹ نظریہ درآمد کیا اور ملک میں اس کے چلن کی کوشش کی، وہ پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ شہر ان کے مسکن اور وسائل ان کا ذریعہ ابلاغ تھا۔ ان کی زندگی بھی شہر کے

بابوؤں کی طرح گزرتی تھی۔ دیہات کے کسانوں کا ان شہری بابوؤں سے، ان کی زندگی کے رکھ رکھاؤ اور پہننے اوڑھنے کے ڈھنگ سے، شہر کی زندگی سے اور ان وسائل سے جن میں ان کی بلند پایہ تخلیقات اور ترقی پسند ادب کے شہ پارے چھپتے تھے، کوئی تعلق نہ تھا۔ ترقی پسند ادب کے فن پارے جو کمیونسٹ نوجوانوں کی محفلوں میں نقد و نظر کا موضوع بنتے تھے، غریب کسان اور مزدور ان فن پاروں اور ان کی ادبی حیثیت کا مطلب بھی نہ سمجھتے تھے۔ کمیونسٹوں کا کسان دوستی کے دعووں کے سوا ان کی حقیقی زندگی سے دور و نزدیک کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ بعض نے تو شاید گاؤں بھی نہ دیکھا ہو! ان کے ادیب، رہنما اور کارکن غریبوں کی مصیبتوں اور مسائل کے جس غم میں گھلے جا رہے تھے، اس کا انھیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا، بلاشبہ شہروں کے قرب و جوار کے ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں کچھ کام کیا۔ لیکن یہاں بھی ان کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مصیبتوں میں کام آنے کے بجائے انھیں اپنے نظریات سے آشنا کرنے اور انھیں اپنا ہم خیال بنانے میں ان کی کوششیں زیادہ صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مزدوروں کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آسکا۔ انھوں نے مزدوروں کی رہنمائی بھی مزدوری اور محنت سے باہر رہ کر کی۔ مزدوروں کی زندگی کی واقعی مشکلات اور محنت کی زندگی سے کوئی مزدور رہنما فی الواقع آشنا نہ تھا۔ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے مزدوروں کی کوئی اچھی بھلی خدمت کی ہے، تب بھی برصغیر ایک زراعتی خطہ ارض ہے اور اکثریت کسانوں کی ہے جو دیہات میں آباد ہے اور انھی کے حالات کی درستگی اور بہتری پر ملک کی ترقی اور مستقبل کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ اس لیے انھیں نظر انداز کر دینا ملک کی بہی خواہی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہندوستان کے کمیونسٹوں نے اس میدان میں قدم ہی نہ رکھا تھا، ان کی خدمت کا دعویٰ کرنا ایک پوچ بات ہے۔

اشفاق اللہ خاں نے انھیں دیہاتوں میں جانے، غریبوں اور کسانوں کی زندگی اختیار کرنے، ان کے رنج و غم میں شریک ہونے اور ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کی یہ بات بڑی قیمتی ہے اور بڑا وزن رکھتی ہے کہ تم سوٹ پہن کر اور کالر، ٹائی درست کر کے لیڈر ضرور بن سکتے ہو، ان کے ادیب کہلا سکتے ہو، ادب میں ایک خاص قسم کا اضافہ کر سکتے ہو لیکن کسانوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اشفاق اللہ خاں کے چند جملوں میں ہندوستانی کمیونسٹوں کی پوری زندگی اور ان کے طرز عمل کی

پوری تصویر آگئی ہے۔ بہر حال پچھلے منقولہ پیراگراف میں انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے مرض کی جو تشخیص کی تھی تو اس کا علاج بھی بتلایا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"اس کا واحد طریقہ ہے کہ تم ان جیسی وضع و قطع اختیار کرو اور جینٹل مینی چھوڑ کر دیہات کے چکر لگاؤ۔ کارخانوں میں ڈیرے ڈالو اور ان کے حالات کی اسٹڈی کرو اور پھر ان میں احساس پیدا کرو کہ ان کی اہمیت کیا ہے۔ تم "کیتھرائن -- گرانڈ مادر آف رشا" کی سوانح عمری پڑھو اور وہاں کے نوجوانوں کی قربانیاں دیکھو۔ تم کالر، ٹائی اور عمدہ سوٹ پہن کر لیڈر ضرور بن سکتے ہو، مگر کسانوں اور مزدوروں کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے"۔

اس کے بعد وہ کمیونسٹوں کو ایک اور مشورہ دیتے ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ برصغیر کے مخصوص سماجی، ثقافتی حالات اور مذہبی پس منظر میں ان کا یہ مشورہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اشفاق اللہ خاں لکھتے ہیں :

"تم دیگر پولٹیکل پارٹیوں سے متحد ہو کر کام کرو اور مادہ پرستی سے کنارہ کشی اختیار کرلو کہ یہ فضول ہے"

غرضے کہ اشفاق اللہ خاں کا برادرانِ وطن کے نام یہ پیغام اسی قسم کے فکر انگیز اور نہایت بصیرت افروز خیالات اور افکار سے پُر ہے۔ آخر میں انھوں نے کمیونسٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ہم انھیں بلا تبصرہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں کس قسم کا انقلاب لانا چاہتے تھے اور کس قسم کی آزادی کے وہ خواہش مند تھے اور انھوں نے انقلاب و احتجاج کی یہ زندگی، جس نے انھیں پھانسی کے تختے تک پہنچادیا تھا، کیوں اختیار کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

"میرے دل میں تمھاری عزت ہے اور میں مرتے ہوئے بھی تمھارے سیاسی مقاصد سے بالکل متفق ہوں۔ میں ہندوستان کی ایسی آزادی کا خواہش مند تھا، جس میں غریب خوشی اور آرام سے رہتے اور سب برابر ہوتے۔ خدا میرے بعد وہ دن جلد لائے جب کہ چھتر منزل پر لکھنؤ میں عبداللہ ورکشاپ مستری، دھنیا چمار اور کسان بھی مسٹر خلیق

الزماں، جگت نرائن اور نواب صاحب محمود آباد کے برابر کرسی پر بیٹھے نظر آئیں!

میرے کامریڈو، میرے ریولیوشنری بھائیو! تم سے میں کیا کہوں اور تم کو میں کیا لکھوں۔ کیا تمھارے لیے یہ کچھ کم مسرت کی بات ہوگی، جب تم سنوگے کے تمھارا ایک بھائی ہنستا ہوا پھانسی پر چڑھ گیا اور وہ مرتے مرتے خوش تھا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ جو اسپرٹ تمھارا طبقہ رکھتا ہے، مجھ کو بھی اس پر فخر ہے اور اب بہت زیادہ فخر ہے کہ ایک سچّا ریولیوشنری ہوتے ہوئے جان دے رہا ہوں۔ اپنا پیغام تم تک پہنچانا فرض تھا۔ میں خوش ہوں، مسرور ہوں اور اس سپاہی کی طرح جو فائرنگ لائن پر ہنستا ہوا جا رہا ہو اور خندقوں میں بیٹھا ہوا گا رہا ہو"۔

سیاسی نظام :

انگریزوں کے تسلط و اقتدار کے بعد، اس وقت سے جب ہندوستان میں تحریک آزادی شروع ہوئی، یہ مسئلہ ہر دور میں اٹھتا رہا ہے کہ ہندوستان کا آیندہ سیاسی نظام کیا ہوگا اور اس میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی؟ اشفاق اللہ خاں ایک انقلابی تھے۔ وہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں برصغیر کے سیاسی نظام کے بارے میں تصور کیا تھا؟

اشفاق اللہ خاں فرقہ وارانہ انداز فکر کے حامل نہیں تھے۔ وہ ہندو مسلم امتیاز اور نقطہ نظر کو ملک کے لیے نہایت مہلک سمجھتے تھے اور اس انداز میں سوچنے والے کو ملک اور وطن کا دشمن خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ملک کا سیاسی مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں، طبقہ وارانہ تھا۔ زمیندار، جاگیردار اور سرمایہ دار، خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان۔ سب کے یکساں مفادات تھے، سب ایک ہی انداز سے سوچتے تھے اور سب کا رویہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ خواہ ہندو خواہ مسلمان، یکساں تھا۔ اس کے برعکس کسان اور مزدور خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان سب کی حالت یکساں تھی، سب ایک ہی عذاب میں مبتلا تھے اور ایک ہی طرح پر سب کا استحصال کیا جا رہا تھا۔ ہندو سرمایہ دار اور جاگیردار کی اخلاقی سطح مسلمان جاگیردار

اور سرمایہ دار سے بلند نہ تھی اور مسلمان مزدور کسان کی حالت ہندو مزدور کسان سے اچھی نہ تھی تو مسئلہ ہندو مسلمان کا کہاں ہوا؟ جس طرح زندگی کے اس دایرے میں ہندو اور مسلمان زمیندار، جاگیردار اور سرمایہ دار بہ مقابلہ، ہندو اور مسلمان مزدور اور کسان منظم اور متقابل تھے، اسی طرح زندگی کے دوسرے دایروں میں یکساں مفاد رکھنے والے ہندو اور مسلمان متحد و منظم تھے اور ان کے طبقوں یا پیشوں سے متاثر ہونے والے مسلمان اور ہندو ان کے متقابل تھے۔

اشفاق اللہ خاں کے ملک کے آیندہ سیاسی مسئلے کا حل ایسا نظام تھا جس سے طبقہ واریت ختم ہو اور ہر شخص کی معاشی و سماجی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں اور جس میں ملک کی آبادی کی سماجی، ثقافتی اور مذہبی و تہذیبی اقدار و روایات کا تحفظ کر دیا گیا ہو۔ اس کے لیے ان کے خیال کے مطابق سماج کے ان طبقوں کے خلاف جنھوں نے ظالم کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور عوام کا خون چوس رہے تھے، جنگ فرض ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ”میرا خدا پر ایمان ہے اور میں اسے مانتا ہوں۔ وہ سب کو ایک ہی صورت میں پیدا کرتا ہے اور ایک ہی صورت پر مارتا ہے۔ اس کے خوانِ کرم سے سب کو کھانے کے لیے ملتا ہے۔ بدمعاش بدمعاشی سے، لٹیرا لوٹ سے اور ظالم ظلم سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وکیل موکلوں سے، زمیندار کسانوں سے اور سرمایہ دار مزدوروں سے جونک کی طرح چمٹ کر ان کا خون چوستے ہیں۔ کیوں کہ وہ کمزور اور نربل ہیں، اس لیے لٹ جاتے ہیں۔ یہ سب قانونِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے خلاف جنگ فرض ہے“۔

اس جنگ کے نتیجے میں جو نظام وجود میں آئے گا، اس کی طرف انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ”دنیا میں انقلابات و تغیرات کتنی تیزی سے ہوا کرتے ہیں۔ کل میں کیا تھا اور آج میں کیا ہوں۔ کل میں ترکوں کی حکومت اپنے اوپر باعث صدناز و افتخار اور ذریعہ بخشش سمجھتا تھا اور آج بدترین ذلت! آج میں ہر بدیشی حکومت کو برا سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی ہندوستان کی ایسی غیر جمہوری

حکومت کو بھی جس میں کمزوروں کا حق، حق نہ سمجھا جائے یا جو حکومت
سرمایہ داروں اور زمینداروں کے دماغوں کا نتیجہ ہو یا جس میں مزدوروں اور
کسانوں کا مساوی حصہ نہ ہو یا باہم امتیاز و تفریق رکھ کر حکومت کے قوانین
بنائے جائیں"۔

گویا انھوں نے اپنے طرز فکر کا اظہار کر کے بتا دیا کہ وہ ایسی حکومت پسند کرتے ہیں، جس میں ملک کے تمام طبقات کے ہر قسم کے مفادات کا یکساں خیال رکھا جائے۔ اگر برصغیر میں انقلاب کے نتیجے میں ایسی حکومت نہ قائم ہو سکے تو پھر ان کی یہ خواہش تھی :

"میں تو کہوں گا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو، اور ہمارے گورے
آقاؤں کی بجائے ہمارے وطنی بھائی حکومت کی باگ ہاتھ میں لیں اور امیر و
غریب اور زمیندار کاشتکار میں تفریق و تمیز باقی رہے تو اے خدا! مجھے ایسی
آزادی اس وقت تک نہ دینا جب تک تیری مخلوق میں مساوات قائم نہ
ہو جائے"۔

برادرانِ وطن کے نام ان کے آخری پیغام میں اس مسئلے کی مزید وضاحت ملتی ہے کہ وہ ہندوستان میں کیسی آزادی کے خواہش مند ہیں۔ ایسی آزادی جس میں غریب کسان و مزدور کے لیے بھی خوشی اور آرام ہو۔ جہاں غیر فطری اونچ نیچ نہ ہو اور حقیقی جمہوریت اور سچی مساوات ہو۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں ہندوستان کی ایسی آزادی کا خواہش مند تھا، جس میں
غریب خوشی اور آرام سے رہتے اور سب برابر ہوتے۔ خدا میرے بعد وہ دن
جلد لائے جب کہ چھتر منزل لکھنؤ میں عبداللہ ورکشاپ مستری اور دھنیا
چمار اور کسان بھی مسٹر خلیق الزماں، جگت نارائن اور نواب محمود آباد کے
برابر کرسی پر بیٹھے نظر آئیں"۔

باب یازدہم

سیرت و شمائل

(۱)

تصنیف و تالیف کے عام قاعدے کے مطابق اب ہمیں اشفاق اللہ خاں شہید کی سیرت پر بحث کرنی چاہیے۔ لیکن اب تک بھی ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سیرت کے سوا اور کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سوانح کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے، وہ ایک انقلابی کی سیرت ہے۔ اس لیے کتاب کے اس باب میں ان کے اخلاق، عادات، اطوار، تواضع، انکسار، وضع داری وغیرہ عنوانات قرار دے کر بیان کی ہوئی باتوں کو دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے بارے میں ان کے دوستوں کے خیالات اور آراء کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے انھی کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بسمل کا خراج تحسین :

رام پرشاد سے اشفاق اللہ خاں کی ملاقات ان کی زندگی کی چوں کہ ایک انقلابی موڑ ثابت ہوئی تھی۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ان کی ذہانت، ان کی اصابت رائے، ان کے تجربہ، ان کے اخلاص کے وہ بہت قائل تھے، ان کے دل میں بسمل کا احترام بھی تھا اور محبت بھی۔ انھی کی رہنمائی میں کاکوری میں ریلوے کا خزانہ لوٹا گیا تھا۔ اشفاق اللہ خاں کو بسمل سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ بسمل بھی ان سے اسی طرح محبت اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ بسمل کی زبان سے ان کا تعارف اور مابین تعلقات اور اعتماد و محبت کی داستان بیان کر دی جائے۔ اس سے اشفاق اللہ خاں کی سیرت کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ رام پرشاد بسمل کا یہ آخری مضمون ہے جس میں انھوں نے پھانسی سے پہلے اشفاق اللہ

خاں کے کردار، ان کے ایمان و اعتقاد فی الاسلام اور قوم و ملک کی خدمت کرتے ہوئے بہادری کے ساتھ سزائے موت کو لبیک کہنے پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ مضمون انھوں نے جیل کی کال کوٹھری میں اشفاق اللہ خاں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا :

"اشفاق! مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں شاہی اعلان کے بعد شاہ جہاں پور آیا تھا تو تم سے اسکول میں ملاقات ہوئی تھی۔ تمھیں مجھ سے ملاقات کرنے کا انتہائی شوق تھا۔ تم نے مجھ سے مین پوری سازش کیس کے سلسلے میں گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن میں نے یہ سمجھ کر کہ اسکول کا ایک مسلمان طالب علم مجھ سے اس قسم کی بات چیت کیوں کرنا چاہتا ہے، نظر انداز کر دیا تھا۔ جس کا تمھیں بہت افسوس ہوا تھا۔ تمھارے چہرے سے دلی تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن تم نے اپنے ارادے کو یوں ہی ترک نہیں کیا، بلکہ اپنے ارادے پر قائم رہے۔

جس طرح ممکن ہو سکا، کانگریسی جلسے میں بات چیت کی اور اپنے دوستوں کے ذریعے مجھے اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ تم صرف گفتار کے غازی نہیں ہو بلکہ کردار کے بھی غازی ہو اور تمھارے دل میں خدمت وطن کا سچا جذبہ ہے۔ آخر میں تمھاری فتح ہوئی۔ تمھارے اجتہاد نے میرے دل میں جگہ پیدا کر لی"۔

تمھارے بڑے بھائی میرے اردو مڈل کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ یہ جان کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور تھوڑے دنوں بعد ہی تم میرے چھوٹے بھائی کی مانند ہو گئے۔ لیکن محض چھوٹا بھائی بن کر ہی تم مطمئن نہ ہوئے۔ تم مساوات کے حقوق اور دوست کا درجہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور آخر میں یہی ہوا۔ تم میرے مخلص دوست تھے۔

سب کو تعجب تھا کہ ایک کٹر آریہ سماجی اور ایک مسلمان کا اتحاد کیسا؟ میں مسلمانوں کی شدّھی کرتا تھا اور آریہ سماج مندر میں میرا قیام تھا۔ لیکن تم ان باتوں کا ذرا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ میرے کچھ ساتھی تمھیں مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن تم اپنے ارادے

میں مضبوط تھے۔ میرے پاس آریہ سماج مندر میں آتے جاتے تھے۔ ہندو مسلم فساد ہونے کے باعث تمھارے محلے کے سب لوگ تمھیں گالیاں دیتے تھے اور کافر کے نام سے تمھیں پکارتے تھے لیکن تم کبھی بھی ان کی رائے سے متفق نہیں ہوئے۔ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ تم واقعی ایک سچے مسلمان اور سچے خادم وطن ہو۔ تم کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کو خدا عقل دے تاکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنے وطن ہندوستان کی بھلائی کرسکیں۔ جب میں ہندی میں کوئی مضمون یا کتاب لکھتا تو تم ہمیشہ یہی تقاضا کرتے کہ اردو میں کیوں نہیں لکھتے، جسے مسلمان بھی پڑھ سکیں۔

تم نے خدمت وطن کے تاثرات کو سمجھنے کے لیے ہندی کا مطالعہ کیا۔ تم جب اپنے گھر پر والدہ محترمہ یا برادرِ محترم سے گفتگو کرتے تو اس میں ہندی الفاظ اکثر تمھاری زبان سے نکل جایا کرتے تھے، جنھیں سن کر سب کو تعجب ہوتا تھا۔ تمھارا اس قسم کا طرز عمل دیکھ کر اکثر لوگوں کو اندیشہ ہوتا تھا کہ تم کہیں مذہب اسلام ترک کر کے شدھی نہ کرالو، لیکن تمھارا دل پاک تھا۔ تمھارے اس طرزِ عمل نے میرے دل پر مکمل فتح حاصل کرلی تھی۔ اگرچہ دوستوں میں تذکرہ ہوتا کہ کہیں مسلمان پر یقین کر کے فریب میں نہ آجانا۔ لیکن تم کامیاب رہے۔ مجھ میں اور تم میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اکثر میں نے اور تم نے ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا اور میرے دل سے یہ امتیاز ہی ختم ہوگیا کہ ہندو مسلم میں کوئی فرق ہے!

تم مجھ پر اعتماد کامل رکھتے تھے اور انتہائی محبت سے پیش آتے تھے۔ تم میرا نام نہ لے کر صرف 'رام' کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب تم دل کے دورے میں مبتلا ہو کر بے ہوش ہوگئے تھے تو تمھاری زبان سے رام، ہائے رام، نکل رہا تھا۔ پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ رام رام کیوں کہتا ہے۔ وہ کہتے تھے اللہ اللہ کہو لیکن تمھیں رام، رام کی رَٹ تھی۔ اس وقت ایک دوست کی آمد ہوئی جو لفظ 'رام' کے بھید سے واقف تھے۔ انھوں نے فوراً مجھے بلایا۔ اور میرے آنے سے تمھیں سکونِ قلب حاصل ہوگیا۔ اس

وقت سب لوگ رام رام کے بھید سے واقف ہوئے"۔

یہاں پر یہ بات بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بقول پنڈت بنارسی داس، پنڈت رام پرشاد بسمل بھی اشفاق اللہ خاں کا نام نہ لیتے تھے۔ بلکہ پیار سے انھیں 'کرشن' کہا کرتے تھے۔ رام پرشاد بسمل بعد کے حالات اور تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آخر میں اس اخلاص و محبت اور دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے خیالات کے رنگ میں تم بھی رنگ گئے، تم بھی کٹر انقلابی بن گئے، اور تم اس فکر میں رہنے لگے کہ مسلمان نوجوانوں پر بھی انقلابی خیالات اثرانداز ہو جائیں اور وہ بھی انقلابی مظاہروں میں شامل ہوں۔ جتنے تمھارے دوست تھے تم نے سب پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

انقلابی جماعت کے افراد کو بھی بعض اوقات اس بات پر حیرت ہوتی کہ میں نے تمھیں کس طرح جماعت کا معزز رُکن بنالیا۔ میرے ساتھ تم نے جو کارہائے نمایاں کیے، وہ قابل تعریف ہیں۔ تم نے کبھی میری حکم عدولی نہیں کی۔ ایک فرماں بردار خادم کی طرح تم ہمیشہ میری فرماں برداری میں مشغول رہتے۔ تمھارے دل میں بڑی وسعتیں تھیں اور تمھارے خیالات بہت بلند تھے"۔

آخر میں رام پرشاد بسمل لکھتے ہیں :

"میں مطمئن ہوں تو اس لیے کہ تم نے دنیا میں میرا منہ روشن کر دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہوگا کہ اشفاق اللہ خاں نے انقلابی مظاہروں میں کارِ نمایاں انجام دیا۔ اپنے عزیزوں اور متعلقین کے سمجھانے بجھانے کی بھی تم نے پروا نہیں کی۔ گرفتار ہونے پر بھی اپنے خیالات پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہے۔ جیسے تم جسمانی طور پر طاقتور تھے۔ ویسے ہی دماغی طور پر بھی بہادر اور روحانی طور پر بھی پورے اُترے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر تم کو میرا معاون (لیفٹیننٹ) عدالت میں بھی سمجھا گیا۔ اور جج نے ہمارے مقدمے کا فیصلہ لکھتے ہوئے تمھاری گردن پر بھی "جے مال" (پھانسی کا پھندا) ڈال دیا۔

پیارے بھائی! تمھیں جان کر سکون واطمینان ہوگا کہ جس نے اپنے ماں باپ کی دولت کو خدمتِ وطن کی راہ میں لٹا کے انھیں تہی دست بنادیا اور دامے، درمے، قدمے اور سخنے سب کچھ خدمت وطن کی راہ میں لٹا کے، اپنے پیارے بھائی اشفاق کو بھی مادر وطن پر قربان کردیا :

اصغرؔ حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے!

پرتھوی سنگھ کی نظر میں :

رام پرشاد بسمل سے اشفاق اللہ خاں کے تعلقات و روابط محبت کا ذکر ان کے تمام دوستوں نے کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چیدہ واقعات اور خاص خیالات سے قارئین کرام کو واقفیت کرادیا جائے۔ پرتھوی سنگھ لکھتے ہیں :

”اشفاق اللہ خاں اور بسملؔ — دونوں وطن کے سچے عاشق تھے اور سچے عشق میں چور ہو کر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے تھے۔ وہ انسانیت کی راہ میں بلند ہو کر فرشتوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ ان دونوں کی زندگی سے ہم نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک جان دو قالب بن سکتے ہیں اور انسانیت کی راہ میں چلنے والے اور انسانیت کی پرستش کرنے والے دو انسان آپس میں مل کر زندہ رہ سکتے ہیں“۔

چٹرجی کی رائے :

جگدیش چندر چٹرجی فرماتے ہیں :

”وہ مسلمان تھے اور ہماری اتر پردیشی انقلابی جماعت میں کوئی دوسرا مسلمان نہیں تھا۔ وہ شہید وطن رام پرشاد بسمل کے جگری دوست تھے۔ حال آں کہ دونوں میں ایک آریہ سماجی پنڈت تھے اور دوسرے پٹھان! شاہ جہاں پور شہر میں جہاں کے یہ دونوں رہنے والے تھے، ہندو مسلم فسادات کا دور دورہ تھا۔ لیکن یہ دونوں دوست متواتر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رہتے تھے اور دوسرے لوگ تعجب کرتے تھے“۔

حیرت انگیز کردار :

لیکن ان کی دوستی کا سب سے بڑا ثبوت بسمل کا اعتراف اور اشفاق اللہ خاں کا کردار ہے۔ بسمل کا اعتراف پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ اشفاق اللہ خاں کے کردار پر بھی نظر ڈال لیجیے۔

عام حالات میں اور عیش و راحت کے دنوں میں تو دوستی اور محبت کے دعوے بہت آسان ہوتے ہیں، لیکن دوستی اور تعلقات کی صحیح آزمائش مصیبت کے دنوں میں ہوتی ہے عیش و راحت کے دنوں میں نہیں! انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو دوستی کے بڑے بڑے مدعی نگاہیں پھیر لیتے ہیں اور اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقی اور سچے دوست عیش کے دنوں میں دعویٰ نہیں کرتے مصیبت کے دنوں میں ہاتھ تھام لیتے ہیں اور حالات کے نشیب و فراز اور زمانے کے نرم گرم موسم میں ساتھ دیتے ہیں اور دوست پر سے مصیبت ٹالنے کے لیے سینہ سپر ہو جا۔تے ہیں۔ اشفاق اللہ خاں کا کردار ایک ایسے ہی سچے دوست اور جاں نثار بھائی کا کردار تھا۔ ان کی کَسی تحریر اور شعر میں بسمل سے دوستی کے بلند بانگ اور شاعرانہ دعوے تو ہمیں نہیں ملے، لیکن ان کے عمل میں ایک دوست کی سچی محبت کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔ گرفتاری کے بعد سی آئی ڈی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر تصدق حسین نے ان کے مشفق ناصح بن کر انھیں سمجھاتے یا ورغلاتے ہوئے کہا تھا کہ رام پرشاد بسمل تو ہندو ہے، تم مسلمان ہو، تم اس کی پروانہ کرو اور اقبال جرم کر لو، حکومت تمھیں معاف کر دے گی۔ یہ سن کر اشفاق اللہ خاں کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور انھوں نے اسے جواب دیا تھا کہ آپ میرے سامنے سے چلے جائیے۔ میں رام پرشاد جی کی بُرائی نہیں سننا چاہتا۔

اس سے بڑھ کر دوستی کا ثبوت اس وقت دیا جب کہ سیشن کورٹ کے بعد چیف کورٹ نے بھی ان کی سزائے موت کی تصدیق کر دی تھی اور پریوی کونسل میں اپیل کی تیاری کی جارہی تھی اور زندگی کی ایک ہلکی سی کرن پریوی کونسل کے اس دریچے سے نظر آرہی تھی۔ یہ ان کے لیے سخت آزمایش کا موقع تھا۔ اب دوست کی خاطر تکالیف کو بڑھ کر اٹھا لینے اور مصائب کو سینے سے لگا لینے کا سوال نہ تھا، بلکہ اپنی زندگی کے بدلے دوست کو بچانے کا مسئلہ تھا۔ اس موقع پر کوئی اور ہوتا تو اس کے قدم شاید ڈگمگا جاتے۔ لیکن اشفاق اللہ خاں کو جب

معلوم ہوا کہ رام پرشاد کی خواہش ہے کہ وہ کیس کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لیں اور پارٹی کے بہترین وفادار اور اس سے وابستہ ملک کے مستقبل کی خاطر رام پرشاد کو بچانے کی کوشش کریں تو انھوں نے اپنی زندگی کی خواہش اور اپنے گلے سے پھانسی کا پھندا نکالنے کی کوشش کرنے کی بجائے دوست کی خواہش پر قربان ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے وکیل کرپا شنکر ہجیلا کے مشورے اور ہدایت کے باوجود گورنمنٹ کو وہ اپیل بھجوا دی، جس میں کیس کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے کر رام پرشاد بسمل کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہجیلا صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا کہ :

"یہ کام ان کی سچی دوستی اور موت کا نوالہ بنتے ہوئے بھی اپنے لیڈر کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری کا اعلیٰ نمونہ ہے"۔

بنارسی داس کا خیال :

پنڈت بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں :

"اشفاق جو چاہتے تھے، وہی ہوا۔ ان کی تمنا وطن کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہو جانے کی تھی۔ اس لیے انھوں نے گھوڑے کی سواری، خونخوار جانوروں کا شکار، کود پھاند وغیرہ سب کچھ سیکھا تھا۔ پڑھنا لکھنا اسی کے لیے چھوڑا تھا۔

شری اشفاق اللہ خاں ہندوستان کے پہلے انقلابی مسلمان تھے۔ وہ فرقہ واریت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ شری رام پرشاد بسمل انھیں پیارے کرشن اور وہ بسمل کو رام کہا کرتے تھے"۔

(۲)

ہم نے اشفاق اللہ خاں کو نہیں، انکی تصویر کو دیکھا ہے اور سوچا ہے کہ جب ان کی تصویر میں یہ کشش جاذبیت اور وجاہت ہے تو خدا جانے خود ان میں اور ان کی شخصیت کی دل آویزیوں اور نظر فریبیوں کا کیا عالم ہو گا؟ شاہ جہاں پور میں عم محترم مولانا عبدالہادی خاں کے پاس ان کے ایک دوست اور کاکوری کیس سے متعلق ایک شخصیت پریم کشن کھنا صاحب آیا کرتے تھے اور ہر ملاقات میں اشفاق اللہ خاں شہید کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور آجایا کرتا تھا۔

کھنا جی خود بھی اچھے ڈیل ڈول والے اور دل کش اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سفید دھوتی، سفید کھدر کے کرتے اور گاندھی کیپ میں بہت اچھے لگتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی ننگے سر نہیں دیکھا(۱)۔

جب کھنا جی اشفاق اللہ خاں شہید کے ڈیل ڈول کا تذکرہ کرتے تھے تو سینہ پھلا کر، سر اونچا کر کے اور دونوں بازوؤں کو کہنیوں تک پھیلا کر ان کے سینے کی چوڑائی کا اندازہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور ان کی قد کی بلندی بتانے کے لیے اپنا پورا ہاتھ سر کے اوپر بلند کر دیتے تھے۔

اشفاق اللہ خاں کے تمام دوستوں اور ان کے تذکرہ نگاروں نے جہاں ان کی بہادری، ثابت قدمی، موت سے بے خوفی، پارٹی ڈسپلن کے احترام اور پارٹی لیڈر رام پرشاد بسمل سے ان کی محبت، فدائیت اور ذوقِ اطاعت شعاری وغیرہ ان کے خصائص سیرت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں ان کے شمائل، حسن و جمال، شکل و صورت، رنگ و روپ اور شباہت و وجاہت کا ذکر بھی ضرور کیا ہے۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی نے لکھا ہے :

> "وہ نہایت شکیل و وجیہ، تنومند اور بھیم کی طرح توانا انسان تھے۔
>
> جیسا کہ پال داس شاستری ہو داس نے اپنی تاریخ کی کتاب میں اشفاق اللہ خاں کے لیے بھیم جیسی طاقت والے لکھا ہے۔
>
> ان کا رنگ گورا، چہرہ بھرا ہوا اور بہت خوبصورت انسان تھے"۔

جگیش چندر چٹر جی لکھتے ہیں :

> "یہ پٹھان ایسے تھے کہ ان سے ایک بار ملاقات کر لینے کے بعد انھیں کوئی بھول نہیں سکتا تھا۔ لمبا دہرا بدن، جوڑا سینہ، کشادہ پیشانی، سادا اور مسکراتا ہوا چہرہ تو جاذبِ نظر تھا ہی، ساتھ ہی بات چیت کا اسٹائل اور فیض رساں خیالات لوگوں پر فی الحقیقت بہادر کی طرح اثر انداز ہوتے تھے۔ ویسے تو بہت سے نوجوان وطن پر قربان ہوئے، لیکن اشفاق اللہ خاں ان میں خصوصیت رکھتے تھے"۔

---

(۱) پریم کشن کھنا۔ ان کے والد رائے بہادر رام کشن کھنا تھے۔ رائے بہادر صاحب وی آئی آر میں پہلے اگزیکیٹو انجینئر تھے۔ بعد میں وہ ترقی کر کے چیف انجینئر ہو گئے تھے۔

یہی چٹرجی ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"بیرونی طور پر ان کا چہرہ ہی خوبصورت نہ تھا، اندرونی طور پر ان کا دل اور بھی زیادہ پاک وصاف تھا"۔

سچیندر ناتھ بخشی نے بھی ان کے چہرے کی کشش اور ان کے حسن و تبسم کی دل آویزیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بھی متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں اشفاق اللہ خاں شہید کی شخصیت کے اس پہلو کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

"اشفاق اللہ خاں لمبے، چوڑے، پکّے کھلاڑی اور شکیل ووجیہ انسان تھے۔ ان کا وزن ایک سو پچھتّر پونڈ تھا۔ پھر بعد کو جیل میں جاکر ان کا وزن دو سو تین پونڈ ہو گیا تھا۔ نہایت پُر کشش اور بھاری بھر کم ہونے کے باعث، وہ بھیڑ میں بھی سے الگ پہچانے جاسکتے تھے۔ ہم لوگ جب بندوق یا رائفل لے کر چلا کرتے تھے تو اشفاق اللہ خاں ہم لوگوں کے درمیان راجہ صاحب یا کنور صاحب بن جایا کرتے تھے اور ہم لوگ درباری یا شکار پارٹی کے افراد بن جاتے تھے۔ کئی بار ہم لوگوں نے اس طرح کا سوانگ بھر کر پولیس کو چکمہ دیا تھا۔ ان میں طاقت بھی غضب کی تھی۔ وہ تھکاوٹ کا تو نام ہی نہیں جانتے تھے۔ ایک بار ۵۵،۵۶ میل لگاتار چلنے کے بعد ہم سب لوگ تھک کر چور ہو گئے اور خود پنڈت رام پرشاد بسمل بھی چلنے سے مجبور ہو گئے، لیکن اشفاق اللہ خاں کی پیشانی پر شکن بھی نہ آئی"۔

شمائل کے سلسلے میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں، ان میں بعض ایسی ہیں جو نئے اعتبار سے شمائل میں شمار نہیں کی جاتیں۔ لیکن چوں کہ یہ طے کر لیا تھا کہ خود کچھ لکھنے کے بجائے ان کے دوستوں اور ان سے ملاقات کرنے والوں کے بیانات ہی نقل کر دیئے جائیں گے، ان بیانات کے تسلسل میں بعض ایسی باتوں کو بھی گوارا کر لیا۔ البتہ اس وجہ سے بیانات کی روانی اور دل آویزی برقرار رہ گئی ہے۔ اگر بیانات کے کچھ جملے اور حذف کر دیئے جاتے تو یہ لطف بیان باقی نہ رہ سکتا تھا۔

باب دوازدہم

فکروفن

اشفاق اللہ خاں شہید ایک سپاہی کے بیٹے تھے اور وہی سپاہیانہ جذبہ ان کے ذوق و مزاج میں پیدا ہو گیا تھا جو ان کی انقلابی شخصیت کی تعمیر میں اور اس کے اعمال میں کام آیا۔ لیکن ان کا گھریلو ماحول تعلیم اور علم و ادب سے بیگانہ نہ تھا۔ ان کے کان بچپن ہی سے شعر و ادب سے آشنا رہے تھے۔ ان کی والدہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ان کے پاس کتابوں کا ایک مختصر سا ذخیرہ بھی تھا اور بعض رسائل کے علاوہ اخبار بھی ان کے پاس آتا تھا۔ اس لیے اشفاق اللہ خاں کو مطالعے کا شوق یہیں سے پیدا ہو گیا تھا۔ ادبی جلسوں اور مشاعروں کے انعقاد کا عام رواج تھا۔ انگریزوں کے خلاف نظموں، قومی نغموں اور وطن کے ترانوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آتا تھا اور سینہ بہ سینہ پھیلتا رہتا تھا۔ یہ ماحول اشفاق اللہ خاں کے ادبی و شعری ذوق کی تربیت میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

اس کے بعد انھیں گھر کے باہر، اسکول اور اس کے علاوہ جو ماحول ملا، ان میں کئی دوست شاعر تھے۔ خود ان کی انقلابی پارٹی میں رام پرشاد بسمل اور چندر شیکھر آزاد اچھے شاعر تھے۔ راجکمار سنہا اور سریش بھٹاچاریہ بھی ذوق نغمہ و ساز سے آشنا تھے۔ اگرچہ اس دور میں ان کی زندگی کا انداز ادب و شعر کی بزم آرائیوں اور رنگینیوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے باوجود ان انقلابی دوستوں کی شب و روز کی معیت اور صحبت نے اشفاق اللہ خاں کے ذوق کو مٹانے اور ختم کرنے کی بجائے اس کے لیے ترغیب و تحریص کا کام کیا۔ کاکوری کی ڈکیتی کے بعد انھوں نے ڈالٹین گنج ضلع پلاموں میں چند ماہ جو گزارے تھے، وہاں ان کا مشغلہ مطالعے اور شاعری کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

اس طرح بچپن ہی میں ان کی طبیعت میں ادب و شعر گوئی کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اسے ہر دور میں مناسب فضا اور سازگار ماحول ملتا رہا اور یہ ذوق اشفاق اللہ خاں میں نشو و نما پاتا

رہا۔ انھوں نے زندگی کے ہنگاموں میں بھرپور حصہ لیا تھا، انھوں نے انسانی زندگی کی حقیقی تصویریں دیکھی تھیں، وہ قدرتی مناظر سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوئے تھے۔ وہ زندگی کے تلخ حقایق سے دوچار ہوئے تھے۔ زندگی کے بارے میں ان کا مشاہدہ حقیقی اور گہرا تھا۔ انسانی زندگی ایک بحر ذخار کی طرح اپنی تمام ہیبت ناکیوں اور حسن وجمال آرائیوں کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں ان کا نظریہ محض تصوراتی، رومانی یا سبک ساران ساحل کا سا نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے غواصوں اور تیراکوں کی طرح زندگی کے اس سمندر میں اتر کر راز زندگی کو پانے کی کوشش کی تھی۔ مشاہدے اور تجربے کے ساتھ انھوں نے علمی اور ادبی مطالعے کا دامن بھی نہیں چھوڑا تھا۔

غرضے کہ ان کے ذوق وشوق مطالعہ، سیر وسیاحت زمانہ، زندگی کے تجربات و مشاہدات، شعر وادب اور سیاسی مطالعے اور ادیب وشاعر دوستوں کی صحبتوں، ادبی مجلسوں کے مباحثوں اور مشاعروں کی نکتہ آفرینیوں نے ان کی زبان، اسلوب اور فکر میں پختگی پیدا کردی تھی۔

شاعری :

اشفاق اللہ خاں نے نظم ونثر دونوں اصناف ادب میں اپنا کلام یادگار چھوڑا ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی پر ذوق عمل اور شوق سیاست اور جذبہ انقلاب چھایا ہوا تھا اور شعرا کی رسمی وروایتی زندگی اختیار کرنے اور اسی شوق وشغل میں شب وروز گزارنیکی انھیں فرصت و فراغت میسر نہ تھی، اور نہ مقدار ومعیار کے اعتبار سے انھوں نے اتنا اور ایسا کلام یادگار چھوڑا ہے کہ انھیں شعرا کے زمرے میں ضرور ہی شمار کیا جائے۔ لیکن ان کے شعر وادب کے کم و بیش سرمایے کے ہوتے ہوئے انھیں ادیب یا شاعر ماننے سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے شاعر کی حیثیت میں ان کے فکر وفن کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

اشفاق اللہ خاں شاعری میں حسرتؔ تخلص استعمال کرتے ہیں اور غالباً حاجی وارث علی شاہ سے عقیدت کی بنا پر اپنے لیے "وارثی" لکھنا پسند فرماتے تھے۔ شاعری میں انھوں نے کسی کو اپنا کلام دکھایا اور کسی سے استفادہ واصلاح کا تعلق بھی پیدا کیا تھا؟ اس بارے میں ہمارے سامنے کوئی بیان موجود نہیں۔ اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ بحکم الشعراء تلامیذ الرحمٰن استاد

ازل کے سوا وہ کسی سے اصلاح و تلمذ میں کسی کے رہینِ منت نہیں۔

شاعری میں کسی اور شاعر سے ان کا مقابلہ و موازنہ تو ایک فعل عبث ہوگا۔ اس طرح شاعری میں ان کے مقام اور مرتبے کے تعین کی کوشش بھی محض لاحاصل ہے۔ لیکن یہ اعتراف بہرحال کرنا پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو زبان کی سادگی، اسلوب کی ندرت کاری اور فکر و معنی آفرینی کی بہ دولت قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں :

مندرجہ ذیل اشعار اسی قسم کی بعض خوبیوں کے حامل ہیں :

موت اک روز جب آنی ہے تو ڈرنا کیا ہے
ہم سدا کھیل ہی سمجھا کیے مرنا کیا ہے!

زندگی بعد فنا تجھ کو ملے گی حسرتؔ!
تیرا جینا ترے مرنے کی بدولت ہوگا

یہ دو قطعے بھی اپنی سادگی و پُر کاری اور فکر آفرینی کی وجہ سے لائق توجہ ہیں :

ہوں گرفتارِ بلا کیا کیا پریشانی نہیں
دامنِ قسمت میں میرے تارِ آسانی نہیں
اف! مری تقدیر میں آسودہ سامانی نہیں
کون سا غم آج مجھ میں دردِ پنہانی نہیں

جوش پر اللہ! کیسا دیدۂ خوں ریز ہے
اشک کا ہر ایک قطرہ آج طوفاں خیز ہے
آتشِ مایوسیٔ دل آہ! کیسی تیز ہے
جو نظر کے سامنے منظر ہے غم انگیز ہے

لیکن ان کی شاعری کا اصل جوہر زبان یا اسلوب نہیں، بلکہ ان کی سیاسی فکر اور دعوت ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں ہندی کے الفاظ اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کے استعارے بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے عام بول چال کے بہت سے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ہم یہاں صرف انھی دو خصوصیات کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

نشچے یہ کر چکا ہوں سندیہہ کچھ نہیں ہے
تیرے لیے جیوں گا تیرے لیے مروں گا!
پھانسی ملے مجھے یا ہو جنم قید میری
بیڑی بجا بجا کر تیرا بھجن کروں گا!

ان اشعار میں نشچے، سندیہہ، جنم، بھجن وغیرہ الفاظ ٹھیٹھ ہندی کے استعمال ہوئے ہیں۔

پھٹا یہ مونج کا پھر پھولوں کی سیج ہو گی
اس کو بچھا کے تیری جب گود میں پڑوں گا
چکی کی ہو مشقت یا رام بانس کی ہو
سب کچھ میں تیری خاطر ماتا کیا کروں گا

ان دونوں اشعار میں پھٹا، مونج، رام بانس، ماتا عام بول چال کے الفاظ ہیں۔ قیدیوں کو جیل میں بچھانے کے لے مونج کے پھٹے دیئے جاتے تھے۔ مشقت میں چکی پسوانے کے علاوہ رام بانس کٹوایا جاتا تھا۔ وطن کے لیے ماتا (ماں) کا لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے۔

موت اور زندگی ہے دنیا کا اک تماشا
فرمان کرشن کا تھا ارجن کو بیچ رن میں

اس شعر میں موت وحیات کے فلسفے کو سمجھانے کے لیے ہندی ادب اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کی ایک تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ لیکن عام طور پر معلوم و مشہور ہے۔

اگر ہندی زبان اور عام بول چال کے الفاظ کو سلیقے کے ساتھ اردو میں ہندوستان کی تاریخ کے مناظر و اشیاء کے استعاروں، تشبیہوں اور تلمیحوں کے استعمال کی تحریک کو آگے بڑھایا جاتا تو ہماری معاشرتی، سیاسی اور ادبی زندگی پر اس کے بہت اچھے اثرات پڑ سکتے تھے۔ اسی طرح اشفاق اللہ خاں نے پنڈت رام پرشاد بسمل سے اردو میں بھی مضمون لکھنے کی جو فرمائش کی تھی، اگر ہندی کے ادیب اور شاعر اس بات کی اہمیت کو محسوس کرتے تو اردو ہندی کا وہ جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا جس نے بعد میں ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

نثر:

اشفاق اللہ خاں کی شاعری کے مقابلے میں ہمیں ان کی نثر زیادہ جاندار نظر آتی

ہے۔ نثر میں ادبی محاسن زیادہ ہیں۔ اس میں چوں کہ انھوں نے زیادہ آزادی اور وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اس کی فکری اور تاریخی اہمیت زیادہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اثرات :

ان کے نثر کے بیشتر پارے بلکہ ایک خط (بنام بنارسی لال) کے سوا تمام سرمایۂ قلم ان کی جیل کی پریشان خیالی کی یادگار ہے۔ اس پر انھیں نظر ثانی کا اور دوبارہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں ان کے مطالعے میں آئی ہیں۔ وہ مولانا کے خیال سے بہت متاثر ہیں اور اندازِ فکر بھی انھیں کا ہے اور اسلوب تحریر میں بھی اگر کوئی جھلک نظر آتی ہے تو وہ مولانا آزاد کے طرزِ فکر اور اسلوب نگارش کی ہے۔

جب انھوں نے ہندوستان میں برٹش حکومت کے بجائے ترکوں کی حکومت کے قیام کے تصور پر فخر کا اظہار کیا تھا تو گویا انھوں نے مولانا محمد علی اور گاندھی جی کے انداز میں سوچا تھا۔ مولانا محمد علی نے کہا تھا کہ وہ ہندوستان پر افغان حملے کا استقبال کریں گے اور گاندھی جی نے سوچا تھا کہ ہندوستان پر جاپان کے حملے کا دفاع نہ کیا جائے۔ دونوں بزرگوں کی وطن سے محبت اور استعمار دشمنی میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ دونوں کی استعمار دشمنی کی یہ انتہا تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے خاتمے کے لیے کوئی بھی دوسری حکومت اور کسی کا اقتدار قبول کر لیں گے۔ یہی بات حسرت موہانی نے رشین گورنمنٹ کے بارے میں سوچی تھی۔ یہ برٹش استعمار دشمنی کی انتہا تھی جس کا اظہار اس طرح ہوا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ حضرات ترکی، افغانستان، جاپان اور رشیا کی حکومت قائم کرنے کے مساعی یا متمنی تھے۔ استعمار دشمنی کے اظہار کا ایک اور اسلوب ملاحظہ ہو۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (شیخ الحدیث دارالعلوم، دیوبند) کی انگریز دشمنی ضرب المثل تھی۔ ایک صاحب نے ان سے پوچھا : حضرت! انگریزوں کی کوئی چیز اچھی بھی ہے؟ حضرت نے جواب دیا : "ہاں! ان کے گوشت کے کباب بہت لذیذ ہوں گے"۔

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا کے نزدیک انسانی گوشت حلال ہو گیا تھا یا مولانا محمد علی، اشفاق اللہ خاں، مہاتما گاندھی اور مولانا حسرت موہانی افغانستان،

ترکی، جاپان اور روس کے اقتدار کے قیام کی تحریکیں چلا رہے تھے! ابوالکلام کا کہنا تھا کہ اقتدار کا اپنا ذوق و مزاج ہوتا ہے۔ جب کسی قوم پر دوسری قوم کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے اور استحکام جڑ پکڑ لیتا ہے تو وہ اپنے برگ و بار پیدا کرتا ہے۔ یہ بات اس کی فکر کی تاثیر اور اس کے فطری خواص کے خلاف ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ کسی کو شریک یا فتح کے نتائج اور قبضے کے بعد حکومت کی سرشاری اور مسرت کسی اور کے دامن میں ڈال دے۔ ابوالکلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانیوں میں اتنا کس بل ہونا چاہیے کہ وہ آزادی کی جنگ کے لیے اپنے دست و بازو کی قوت پر بھروسہ کر سکیں اور اپنے وطن کا دفاع اپنے قومی وسائل اور ہمت سے کر سکیں خواہ یہ خطرہ اس کے پڑوسی ملک افغانستان کی طرف سے پیدا ہو۔ اسی لیے مشرقی ہند پر جاپان کے قبضے سے پہلے اس علاقے، خصوصاً کلکتے کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لینا ضروری سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر ہندوستان کی برٹش حکومت کے پسپا ہوتے ہی کلکتہ کا نظم و نسق نہ سنبھال لیا گیا تو سخت پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور ایک نئے استعمار کی تولید اور اس سے معرکہ جنگ برپا ہو جائے گا۔ یہ کیسے سمجھ لیا جا سکتا تھا کہ کلکتے پر قبضہ کر لینے، برٹش حکومت کو مشرقی ہند سے پسپا کر دینے اور اپنی طاقت و قوت سے اس علاقے پر اپنا کامل تسلط قائم کر لینے کے بعد جاپان ہندوستانیوں کی مروت سے ان کے حق میں اقتدار و حکومت سے ضرور ہی دست بردار ہو جائے گا؟

اشفاق اللہ خاں پڑوسی (جاپان) کے بہ لحاظ افغانستان سے اسلامی رشتے کی عصبیت سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔ جیسے کہ آج ایران۔ عراق، کویت۔ عراق، پاکستان۔ افغانستان وغیرہ تمام اسلامی ممالک اپنے اپنے قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تھا۔ تحریک خلافت، تحریک ہجرت، ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر ٹھیک وہی تھا، جو ابوالکلام کا تھا۔ انھوں نے ہندوستان پر ترکی حکومت گوارا کرنے کے بارے میں جو بات سوچی تھی، مجھے یقین ہے کہ وہ خیالات کی ایک وقتی رو تھی اور محض عدم پختگی فکر کی بنا پر وہ جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے۔ مجموعی طور پر ان کے خیالات پر ابوالکلام آزاد کے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۵ء کے خیالات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

بعض لوگ شکوہ سنج ہیں کہ اگر اس وقت افغانستان ہندوستان پر حملہ کر دیتا یا ترکیہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایثار، ان کی مصیبت میں امداد اور محبت کی قدر کی ہوتی اور جرمنی

سے مل کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہوتا تو آج اسلامی دنیا، خصوصاً برصغیر کا نقشہ بالکل دوسرا ہوتا۔ حال آں کہ دونوں ملک اس پوزیشن ہی میں نہ تھے کہ وہ ہندوستان میں برٹش حکومت کے خلاف نقل و حرکت کا کوئی قدم اٹھاتے۔

افغانستان ہندوستان کی تحریک آزادی میں کیا مدد کر سکتا تھا جب کہ وہ اسی ستمگر کا وظیفہ خوار تھا جس کے قریب کے نخچیر اہل ہند تھے۔ اگر ۱۹۱۵ء کے ہندوستانی مہاجر یا سیاسی انقلابی ذوق رکھنے والے مفرورین ہند جن کے سرخیل مولانا عبید اللہ سندھی تھے، ۱۹۱۸ء کی جنگ استقلال میں اس کی مدد نہ کرتے تو وہ اپنی آزادی کی جنگ بھی نہ جیت سکتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ :

☆ سب سے پہلے اسی فاتح نے انھیں مجاہدین و محسنین کو ہندوستان کی سیاسی تحریک — تحریک استقلال کے کام سے روک دیا اور پھر ان تمام کو افغانستان سے نکل جانے پر مجبور کر دیا جو جنگ استقلال افغانستان میں فتح کا سب سے اہم عنصر تھے۔ اور

☆ ان کے اخراج کے بعد افغانستان کی بے بسی اور کمزوری کا اس سے اندازہ لگایئے کہ افغانستان کے استقلال کا ہیرو "امان اللہ خاں" اپنی قوم کے ایک لٹیرے اور ڈاکو "......" کے مقابلے میں اپنا دفاع بھی نہ کر سکا۔

ترکیہ اپنے ممالک محروسہ میں برٹش استعمار کی ریشہ دوانیوں کے تدارک، اپنے حدودِ سلطنت کے دفاع اور اپنے مقبوضات کے تحفظ میں ناکام رہا تھا۔ کمال اتاترک کے ظہور سے پہلے قسطنطنیہ کی "مسند خلافت" استعمار کی آلۂ کار بنی ہوئی تھی اور اتاترک کے انقلاب کے بعد، صرف ایک انقلابی ہندوستانی — غازی عبدالرحمٰن شہید کو جو ترکیہ کا نہایت مخلص و جاں نثار اور مجاہد ترک کے استقلال و استحکام کی تحریک کا سرگرم رُکن تھا، حکومت اسے برداشت نہ کر سکی اور وہ انقرہ کی سڑک پر شہید کر دیا گیا اور ترکی کے کسی زعیم کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

کیا اس افغانستان سے اور اس ترکیہ سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اہل ہند کے لیے اس کی سرزمین پر آزادی کی جنگ لڑیں گے اور جیت کا میٹھا پھل وہ اہل ہند کی جھولی میں ڈال دیں گے؟

غرضے کہ اتحاد اسلامی میں، تحریکاتِ ملّیہ بیرون ملک میں ملتِ اسلامیہ ہند کے

مخصوص حالات، ملکی ضرورتوں اور قومی تقاضوں کو نظر انداز نہ کرنا، خالص مسلمانوں کے ملی مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت، اسلاف اور خاندان کے تاریخی و روایتی سرمایے کی بجائے اپنے عمل کی پونجی پر فخر اور زندگی کا سرمایۂ عیش پیٹ کی بجائے دماغ کو سمجھنا اور اپنے ہی مطالعہ و فکر اور آزادی کو اپنی جائیداد سمجھنا، ٹھیک ابوالکلام آزاد کا اندازِ فکر ہے۔

ابوالکلام کے طرزِ نگارش کی جھلک :

اشفاق اللہ خاں کے اسلوبِ تحریر میں بھی ابوالکلام کے طرزِ نگارش کی جھلک نظر آتی ہے۔ تخاطب کا شاعرانہ انداز، تمثیلی پیرایہ، سوالیہ و استعجابیہ بیان، جملوں کی طوالت، تراکیب کا تسلسل، مترادفات کی کثرت آیاتِ قرآنی سے استدلال اور اشعار سے تحریر و بیان کی تزئین ابوالکلام کے اسلوب خاص سے مشابہت رکھتا ہے۔

میں یہاں اشفاق اللہ شہید کی تحریروں کے چند ٹکڑے نقل کرتا ہوں، جن سے میرے خیال کی تائید اور توثیق ہو جائے گی۔ والدہ کے نام اپنے خط میں صبر کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "آپ سب کے سامنے راہِ عمل کیا ہے؟ میں نے بُرا کیا یا اچھا!
> میں اقرار کرتا ہوں کہ میری زندگی کی اتنی برسیں گمراہی، معصیت، سیاہ کاری اور گناہوں میں گزریں۔ اس کے لیے میرے دوست، میرے عزیز و قریب، میرے بھائی اور مختصر یہ کہ ہر ہمدرد مسلمان دعائے مغفرت کرے اور آپ سب لوگ صبر کیجیے :
>
> صبر تلخ است و لیکن برِ شیریں دارد"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

> "کیا آپ نے سوچا تھا کہ مجھے موت نہ آئے گی؟ تم بھی جانتی تھیں اور مجھے بھی معلوم تھا کہ ہم تم سب مریں گے۔ کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ یا تو مجھ کو تم پر رونا پڑتا یا تمھیں میرے لیے! لیکن اس کا منشا یہ ہے کہ بوڑھی ماں جوان اولاد کے لیے روئے گی اور بقیہ تین بھائی اپنے چھوٹے بھائی کا ماتم کریں گے! تو کیا آج اس دنیا میں کوئی اتنی طاقت والا ہے کہ اس خداوند

قدوس کے احکام کو پلٹ دے؟"

اور اس سے آگے لکھتے ہیں :

"دنیا ایک معجون مرکب ہے، جس میں سب ذائقے ہیں۔ عیش و مسرت، غم و اندوہ، آرام و تکلیف، غفلت و بیداری، نیکی و بدی، موت و زیست، غرض ہر چیز یہاں ملے گی۔ پس خوش قسمت ہے وہ جس نے اچھی باتیں قبول کیں اور برائیوں سے پرہیز کیا، غفلت پر ہوشیاری کو ترجیح دی اور معبود حقیقی کی یاد میں دل لگایا"۔

والدہ محترمہ کے نام اسی خط میں یہ سطریں بھی ملتی ہیں۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ عزیمت دعوت کے کس مقام پر تھے۔ یہ وہ شخص افکار کے گوہر لٹا رہا ہے، جو صرف اٹھائیس برس کا ہے۔ یہ وہ نوجوان اپنی بوڑھی والدہ کو الوداع کہہ رہا ہے اور اللہ کی طرف بلا رہا ہے جو اس تحریر کے ٹھیک چار روز کے بعد سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔ وہ لکھتا ہے :

"آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک کون ایسا ہے جو مرا نہ ہو۔ جس نے بساط عالم پر زندگی کے مہرے بچھائے، موت کے ہاتھوں اس نے ضرور مات کھائی۔ پس اس کا غم بیکار ہے اور ہونے والی اور ضرور ہونے والی بات کے لیے پریشان ہونا سراسر غلطی ہے۔ اب رہی محبت، ڈاہ، موہ، پریم، یہ سب دنیاوی دھندے ہیں۔ خدا سے محبت کرو۔ اس کو پوجو جو ہمیشہ زندہ و قائم رہے گا۔ اس کے لیے تمھیں اپنی بقیہ زندگی میں کبھی رونا نہیں پڑے گا۔ جو بات ہونے والی ہے، ہوتی ہے۔ اس کے اسباب پیشتر سے ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور جب اسباب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، بات پوری ہو جاتی ہے۔ پس میرے لیے یہ موت اور یہ دن تھا، جو مجھے ملا۔ اور تمھارے لیے دکھ، بڑھاپے کا دھکا اور سینہ کوبی لکھی تھی، وہ تمھیں مل رہی ہے۔ جو جس کے لیے اس نے مناسب سمجھا، وہ اسے تقسیم کر دیا۔ پس کون ہے جو شکوہ کرے اور لب شکایت کے واسطے کھولے؟ اگر تم کو گریۂ یعقوب عطا کیا تو مجھ کو سنت یوسفی ادا کرنے کے لیے پکارا۔ اگر تم کو ماتم کناں مثلِ خاندان نبویؐ بنانا چاہا، بنا دیا۔ تو مجھے متبع حسین شہید تیغ جفا کے خطاب

سے نوازا۔ اس کی شان نرالی، اس کی ادا انوکھی۔ وہ ہر جگہ نئے رنگ میں، ہر طرف نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ جو کچھ ہوا، جو ہوگا اور جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے اور ہوگا۔ کون ہے جو سرتابی کرے اور کون ہے جو اس کے حکم سے باہر جا سکے۔ پس اسی پر نظر رکھو اور صبر د قرار ہاتھ سے نہ دو۔ شکر کرو کہ اس کی امانت اس کی طرف جا رہی ہے۔ صانع اپنے مصنوع کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ پھر تم کون تڑپنے والی ہو۔ اس کی چیز تھی، اسی کو اختیار ہے۔

صبر کرو، صبر اور بقیہ زندگی کا بیش بہا وقت میرے لیے رونے میں صَرف نہ کرو بلکہ اس سفر کی تیاری میں لگاؤ جو ایک دن درپیش ہے۔ عبادت میں مغفرت ہے۔ گناہوں میں وقت نہ گزارو۔ یہی کام آئے گا، غفلت چھوڑو۔ اب اس کو پکڑو۔ دنیا فنا ہونے والی ہے اور تمھارا بھی بڑھاپا ہے۔

اچھا، میری خطائیں معاف کرو اور مجھے اپنے حقوق سے سبک دوش کرو، تم کو خدا کی دین میں دیتا ہوں۔ وہ تمھیں نیک بی بی اور صابرہ بی بی بنائے۔ آمین!"

آخر میں انھوں نے اسی خط میں اپنے بھائیوں اور بھاوجوں کو بھی مخاطب کیا ہے :

"بھاوجو اور بھائیو! فراق بنی و بینکم! تم آپس میں مل جل کر رہنا اور دکھیا اور بدقسمت ماں کی خدمت میں لگی رہنا اور انھیں بقیہ زندگی کو سکون سے گزارنے کا موقع دینا"۔

اشفاق شہید کا یہ پورا خط اسی قسم کے اسلامی خیالات اور بہادرانہ افکار سے بھرا ہوا ہے۔ بہ قول پنڈت بنارسی داس چترویدی کے :

"اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اشفاق اللہ خاں کے عزائم اور حوصلے کتنے بلند تھے اور انھیں خدائے قدوس کی نصرت اور اعانت پر کس قدر کامل یقین اور پورا بھروسا تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ کو بھی اس کی تلقین کی ہے۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ایک

عجیب فلسفیانہ ڈھنگ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے"۔
والدہ ماجدہ کے لیے ان کے یہ جملے کتنے بلند اور معنی خیز ہیں :

"خدا سے محبت کرو! اس کو پوجو جو ہمیشہ زندہ و قائم رہے گا۔ اس کے لیے تمھیں اپنی بقیہ زندگی میں کبھی رونا نہیں پڑے گا"۔

برادرانِ وطن کے نام ان کا پیغام شروع سے آخر تک بالکل سیاسی خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی قوم کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے :

"اے وہ قوم جس کا کوئی جھنڈا نہیں، اے وہ قوم کہ تیرا وطن تیرا وطن نہیں! اے وہ قوم جو دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے رحم کی درخواست پہ نظر رکھتی ہے۔ یہ تیری اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ تو غلام ہے۔ اور پھر بھی وہ غلطیاں کر رہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تو غلامی کا دھبہ چھوڑ جائے گی اور تیرے بعد جو بھی سرزمین ہند پر قدم رکھے گا، غلامی میں رکھے گا اور غلام مرے گا"۔

اس خط میں وہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے اس سے سوال کرتے ہیں :

"اے خداوند قدوس! کیا کوئی ایسا سویرا نہیں آئے گا کہ تیرا آفتاب آزاد ہندوستان پر چمکے اور فضائے ہند آزادی کے نغموں سے گونج اٹھے!"

ایک فکر انگیز اور شگفتہ تحریر :

میں ان کی تحریر کے ایک اور اقتباس کے مطالعے کی آپ کو دعوت دوں گا۔ اس میں ان کے جذبہ حریت، ذوقِ خدمت وطن، ان کے فکر، ان کے تیکھے اسلوبِ تحریر اور ایک نہایت عمدہ استعارے سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اقتباس قدرے طویل ہے، لیکن فکر انگیز ہے اور آج جب کہ ہم آزاد ہیں، جس اتحاد کی انھوں نے دعوت دی ہے، اس کی ضرورت ہمیں آج غلامی کے دور سے کچھ کم نہیں، زیادہ ہے۔ کل اس پر آزادی وطن کا دارو مدار تھا، آج تعمیر وطن کا بنیادی پتھر یہی "اتحادِ اقوام وطن" ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"کانگریس والے ہوں یا سوراجسٹ، تبلیغ والے ہوں یا شدھی

والے، کمیونسٹ ہوں یا ریولیوشنری، اکالی ہوں کہ بنگالی، میرا پیغام ہر فرزند وطن کو پہنچے۔ میں ہر اس شخص کو اس کی عزت و مذہب کا واسطہ دیتا ہوں اور اگر وہ مذہب کا قائل نہیں ہے تو اس کے ضمیر سے یا جس عقیدے کو بھی وہ مانتا ہو، اس کے واسطے سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم کاکوری کیس کے مرجانے والے نوجوانوں پر ترس کھاؤ اور پھر ہندوستان ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء والا ہندوستان بنا دو! پھر احمد آباد کانگریس کا سا اتحاد و اتفاق سامنے ہو۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو اور مکمل آزادی کا جلد از جلد اعلان کر کے ان گورے آقاؤں کو بتا دو کہ یہ کالے اب کینچلی اتار چکے، اب یہ کسی منتر سے رام نہ ہوں گے"۔

"تبلیغ اور شدھی والو! خدارا آنکھیں کھولو! دیکھو تم کہاں تھے اور کہاں پہنچ گئے؟ اپنی اپنی شان ختم کرو، سوچو تو! مذہب میں زبردست اور اختلاف رائے پر جنگ۔ ایک کام نامکمل چھوڑ کر دوسری جانب رجوع ہو گئے۔ آج کون ایسا ہندو اور مسلمان ہے جو مذہبی آزادی اتنی رکھتا ہے جتنا اس کا حق ہے؟ کیا غلام قوم کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟ تم اپنے مذہب کا سدھار کیا کر سکتے ہو؟ تم خدا کی عبادت پُرسکون طریقے پر کرو، ایشور کا دھیان خاموشی سے کرو اور دونوں مل کر اس سفید بھوت کو منتر سے جنتر سے اتار بھگاؤ۔ اسی کی یہ ساری کارروائی ہے۔ جب یہ بھوت اُتر جائے گا، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ آو ہماری بھی سنو! پہلے ہندوستان کو آزاد کرا لو، پھر کچھ اور سوچنا۔ خدا نے جس کے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے وہ آ پر رہے گا۔ تم کسی کو ہٹا نہیں سکتے۔ آپس میں مل جل کر رہو اور متحد ہو جاؤ! سارے ہندوستان کی بدبختی کا بار تمھاری گردن پر ہے۔ غلامی کا باعث تم ہو!"

خداوند قدوس کے حضور :

ان کی یادگار تحریرات میں ایک "دعا" بھی ہے۔ اس کے ان جملوں کے اسلوب پر غور کیجیے! کیا یہ ایک صاحبِ طرز انشاپرداز کے قلم کی ندرت کاری کا منہ بولتا ثبوت

نہیں ہے؟

"مجھے خوب یاد ہے، جب اپیل خارج ہوئی تھی اور رحم کی درخواست مسترد ہوگئی تھی اور ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۷ء پھانسی کی تاریخ مقرر ہوگئی تھی۔ صرف چار روز میرے پھانسی دیئے جانے میں رہ گئے تھے۔ سب انتظامات پورے ہوگئے تھے، جلاد آگیا تھا، اس وقت کی پریشانی تجھ پر خوب روشن ہے! کیا میں موت سے ڈر رہا تھا؟ کیا مجھے یہ خیال تھا کہ ہر چیز مجھ سے چھٹ جائے گی اور یہاں پھر نہ آنا ہوگا؟ کیا مجھے دوست، احباب، اعزا و اقربا کی یاد ستاتی تھی؟ نہیں! میرے مالک نہیں! نہیں میرے آقا ایسی بات نہیں تھی! مجھے دکھ اس بات کا تھا اور تکلیف اس بات کی تھی کہ میں تیری جناب میں کیا جواب دوں گا!"

مزاح لطیف کی ایک جھلک :

ان کی تحریر میں مزاح لطیف کا بھی ایک عمدہ نمونہ ملتا ہے۔ اپنے ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سبق پڑھاتے وقت مولوی صاحب مجھ سے خوش رہتے تھے، مگر شرارت کے وقت اور زیادہ خوش کہ سیکڑوں بیٹھکیں لگواتے تھے۔ گویا مولوی صاحب مجھے پہلوان بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ ہمارے مولوی صاحب کا طریقۂ تعلیم نرالا تھا۔ ان کی لیاقت ذاتی میں کوئی شک نہیں تھا۔ علم ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مگر ہم ایسے بدقسمت تھے کہ علم ریاضی میں ہمیشہ کمزور رہے۔ وہ سبق کم دیتے تھے، انگریزی زبان کا مضحکہ زیادہ اڑاتے تھے اور انگریزوں کی دوستی کو جہنم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انگریزی پوشاک سے سخت نفرت تھی اور ایسے ایسے قصے بنا بنا کر سنایا کرتے تھے کہ جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ کوٹ پینٹ پہنتے ہوئے آج بھی جھجکتے ہیں"۔

ان کی خود نوشت کا ایک اور جملہ جو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا، مزاح لطیف کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اس جملے کی داد ہمارے دوست مشفق خواجہ یا کوئی غیر پٹھان ہی دے

سکتا ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں :

"میں چوں کہ پٹھان تھا اور یہ قوم چوں کہ عام طور پر جاہل شمار کی جاتی ہے، گو میں اب ایسا نہیں ہوں، ان خیالات میں ڈوب گیا۔۔۔"۔

وہ جو موت کی وادی میں کھو گیا :

ہم اس باب کو جناب پنڈت بنارسی داس چترویدی کی اس رائے پر ختم کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنے کام کا دوسرا یعنی انقلابی حلقہ متعین نہ کر لیا ہوتا تو وہ ایک دن ضرور وطن کے مقتدر ادیب اور ایک بلند پایہ شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے۔ چترویدی صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

"وہ ایک اچھے خاصے ادیب بھی تھے۔ حال آں کہ سوائے چند خطوط اور آپ بیتی کے جو جیل کی کال کوٹھری میں منظر شہود پر آئی (اور سوائے مختصر کلام کے اور کوئی چیز اُن کی ادبی یادگار نہیں ہے) انھیں کبھی عملی طور پر ادب سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ وہ اچھی طرح تعلیم سے فراغت بھی حاصل نہ کر پائے تھے اور

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

کے مصداق انھیں انقلابی جماعت اور انقلابیوں سے وابستگی پیدا ہو گئی اور انھوں نے اپنی حب الوطنی کے فطری لگاؤ کے باعث اپنا کام کرنے کا حلقہ ہی دوسرا متعین کر لیا۔ ورنہ وہ ایک دن وطن کے مقتدر ادیب اور شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے"۔

باب سیز دہم

ہندوستان ری پبلکن ایسو سی ایشن

آغاز وانجام پر ایک نظر

اشفاق اللہ خاں شہید نے وطن کی تحریک آزادی کی راہ میں قدم رکھا تھا تو یہ محض نا سمجھی کا عمل اور جوش و جذبات کا بے ساختہ اور غیر ارادی انفجار نہ تھا اور نہ کسی غلط صحبت کا نتیجہ یا اغوائے فکر کا حادثہ تھا۔ اس بارے میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اور راہ کی مشکلوں اور کٹھنائیوں کا پورا پورا اندازہ کر کے قدم اٹھایا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے واقعات و حوادث اور آزمائش کے ہر موڑ پر اپنی سمجھ، اپنی ذمہ داریوں کے احساس اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کی ذمہ داریوں کا آغاز ایک باقاعدہ نظام سے ان کی وابستگی کے عمل اور اس سے وفاداری کے حلف و سوگند سے ہوتا ہے۔

یہ نظام "ہندوستان ری پبلکن ایسو سی ایشن" کے نام سے قائم تھا۔ یہ ایک حریت پرست اور غیر فرقہ وارانہ انقلابی تنظیم تھی۔ اگست ۱۹۲۵ء میں کاکوری کے قریب سرکاری خزانہ لوٹنے کی واردات اسی تنظیم کے جھنڈے تلے اس کے دس جیالے کارکنوں نے انجام دی تھی۔

ایسو سی ایشن کا قیام

ایسو سی ایشن کے قیام کی قطعی تاریخ کا ہمیں ابھی تک علم نہیں ہو سکا۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۲۲ء میں یہ ایسو سی ایشن موجود تھی۔ ڈاکٹر بی۔ این۔ چوپڑا چیف ایڈیٹر "شہیدان آزادی" چندر شیکھر آزاد کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ

"۱۹۲۲ء میں ہندوستانی انقلابی پارٹی میں شامل ہوئے"۔

(شہیدان آزادی (حصہ اول)، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲)

مجھے یقین ہے کہ یہ اشارہ ''ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن'' کی طرف ہے۔ اس سے ان کا تعلق آخر تک رہا۔ اس کے نام کی تبدیلی ان کی رضامندی سے عمل میں آئی۔ اس کا نام ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن'' ہو گیا اور جب اس کا ملٹری ڈویژن قائم ہوا تو آزاد ہی اپنے ذوق اور صلاحیتوں کی بنا پر اس کے کمانڈر بنائے گئے۔ (ایضاً)

بہر حال ۱۹۲۲ء تک اس کے وجود کا سراغ مل ہی جاتا ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ اس دور میں انقلابی تحریکات وہی ہیں جو ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے واقعات کے ردِّ عمل میں پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۷ء تک کی انقلابی تحریکات کا ذکر سڈیشن کمیٹی ۱۹۱۸ء کی تحقیقاتی رپورٹ میں آ گیا ہے۔ لیکن اس رپورٹ کے نتیجے میں رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء کا نفاذ عمل میں آیا، جس نے قانون کے دایرے میں بھی سیاسی عمل کو ناممکن کی حد تک مشکل تر بنا دیا اور پولیس کو اتنے اختیارات دے دیئے جن کا تصور بھی کسی آئینی حکومت میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جلسے، جلوس، احتجاج، ہڑتال، پوسٹر، ہینڈ بل، پمفلٹ، اخبار کے ذریعے جدوجہد کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا تو ملک چیخ پڑا۔ نوجوانوں نے اس کا خاص طور پر اثر لیا اور اس کا شدید ردّ عمل ہوا۔ اس کا اظہار انقلابی اور خفیہ تحریکات کی صورت میں ہوا۔ خفیہ جماعتیں اور تحریکیں چوں کہ علی الاعلان وجود میں نہ آتی تھیں، اس لیے عام طور پر ان کے آغاز و قیام کا پتا نہ چلتا تھا۔ اس لیے یہ قیاس بے جا نہ ہو گا کہ ''ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن'' کے قیام کے عہد کو ہم ۱۹۱۹ء سے پہلے نہیں لے جا سکتے۔

ایسوسی ایشن کے نام اور نظام میں تبدیلی

۱۹۲۵ء کی کاکوری واردات کے بعد تنظیم کے لیڈروں میں سے چندر شیکھر آزاد اور چند دوسرے لوگ جو گرفتاری سے بچ گئے تھے، انھوں نے اس کے نظام اور اس کے پہلوؤں پر حالات اور تجربات کی روشنی میں غور و فکر کیا اور اس کے نام میں تبدیلی کے ساتھ بعض دوسری تبدیلیوں کا فیصلہ کیا اور ۱۹۲۸ء تک اس کے نام میں ''سوشلسٹ'' کے اضافے کے ساتھ ''ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن'' کر دیا گیا۔ ایسوسی ایشن کے ایک رکن اجے کمار گھوش لکھتے ہیں :

۱۹۲۸ء میں ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص

یکا یک داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ بھگت سنگھ تھے۔ لیکن ان میں اور دو سال پہلے کے بھگت سنگھ میں بڑا فرق تھا۔ اب وہ اونچے، پورے اور تنومند ہو گئے تھے۔ چہرے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ جب میں نے ان سے باتیں کیں تو میں نے محسوس کیا کہ نہ صرف عمر میں بلکہ تجربے اور قابلیت میں بھی وہ کئی سال آگے نکل چکے تھے۔

وہ چندر شیکھر آزاد کے ساتھ تھے جو اس وقت ہماری پارٹی کے لیڈر تھے۔ کاکوری سازش کی گرفتاریوں سے وہی ایک تھے جو بچ نکلے تھے اور اس وقت روپوش تھے۔ اس ملاقات میں انھوں نے پارٹی کا نیا پروگرام بتلایا اور یہ بھی بتلایا کہ تنظیم میں اب کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں :

- ☆ اب ہماری پارٹی کا نام "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" ہو گیا تھا۔ اور
- ☆ ہمارا مقصد تھا کہ ہندوستان میں اشتراکی راج قائم کیا جائے۔
- ☆ اس کے علاوہ پارٹی کی ایک مرکزی کمیٹی بنائی گئی اور اس کے تحت
- ☆ صوبہ داری اور ضلع داری کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اصول یہ طے پایا کہ
- ☆ ان کمیٹیوں میں اکثریت جو فیصلہ کرے گی اس کا سب کو پابند ہونا پڑے گا"۔

(بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی، ۱۹۸۵ء، کراچی، ص ۱۸)

اجے کمار گھوش کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارٹی کے نام میں لفظ "سوشلسٹ" کے اضافے کے لیے دل سے آمادہ نہ تھے، لیکن جو حالات پیش آ گئے تھے، اس میں وہ اس کے لیے مجبور تھے۔ سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ وہ تنہا ہو گئے تھے اور انھیں نئے ساتھیوں اور ہمدردوں کی ضرورت تھی۔ اجے کمار لکھتے ہیں :

"وہ ۱۹۲۵ء کے کاکوری کے ریل کے واقعے میں شریک تھے۔ لیکن وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگ سکے۔ پولیس ان کے پیچھے سرگرداں تھی۔ وہ اگر کہیں اس کے ہاتھ لگ جاتے تو پھانسی کے تختے کے سوا ان کے لیے کوئی

دوسری جگہ نہ ہوتی۔ اس کے باوجود وہ ایک دن بھی خاموش نہ بیٹھ سکے۔
انھیں پارٹی کو منظم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ چنانچہ کاکوری کی گرفتاریوں کے بعد
وہ بھگت سنگھ اور سکھ دیو کے ساتھ پارٹی کی نئے سرے سے تنظیم کرنے لگے۔
جب ہم نے اپنی پارٹی کا نام بدل کر "ہندوستان سوشلسٹ ری
پبلکن ایسوسی ایشن" رکھا تو انھوں نے اسے منظور کر لیا"۔

(ایضاً، ص ۳۶-۳۷)

لیکن اس کے ساتھ ہی جب اجے کمار یہ کہتے ہیں کہ

"لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے نزدیک ان سب چیزوں کا کچھ اس
قدر زیادہ اہمیت نہیں تھی، وہ عمل کے پجاری تھے اور انھیں نظریے سے زیادہ
کام سے دلچسپی تھی"۔ (ایضاً)

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ پارٹی کے نام میں تبدیلی کا تعلق ان کی مجبوری یا مصلحت سے تھا۔ ان کی فکر اور خوشی کو اس میں دخل نہ تھا۔ دل سے وہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی بنیاد میں اور اس کے بعد قائم ہونے والے نظام میں کسی بیرونی فکر کی آمیزش ہو۔

ایسوسی ایشن میں تبدیلی اور تنظیم جدید کے سلسلے میں شیو ورما کا نام خاص طور پر آیا ہے۔ شیو ورما کا تعلق شاہ جہاں پور کے پڑوسی ضلع ہردوئی سے تھا۔ وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی ان کی عمر ۱۶-۱۷ برس سے زیادہ نہ تھی کہ ترک موالات کی تحریک میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ جنگ آزادی کی تحریک میں آگے اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔
اجے گھوش لکھتے ہیں:

"ہماری پارٹی کا نام "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی
ایشن" رکھا گیا۔ اس نئی تبدیلی میں شیو کا بڑا حصہ تھا۔ اس لیے کہ نئے
خیالات کا ان پر سب سے زیادہ اثر تھا۔
وہ اپنی تعلیم ترک کر کے انقلابی تحریک میں آگئے تھے اور جب
ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کی مرکزی کمیٹی کے رکن
ہوئے اور یوپی کے چیف آرگنائزر مقرر ہوئے تو پھر انھوں نے ہر ضلع کا

دورہ کیا۔ پرانے مرکزوں کو مضبوط کیا اور نئے مراکز قائم کیے"۔

(ایضاً، ص ۴۷)

ایک اور اہم تبدیلی

۱۹۲۸ء میں پارٹی میں ایک اور تبدیلی عمل میں آئی۔ یہ تبدیلی اس کی نوعیت کی تھی۔ اس تبدیلی کا اثر اس کے نصب العین پر پڑا تھا۔ اس تبدیلی کا اظہار اس کے نام میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اب اس کا نیا نام "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" ہو گیا تھا۔ "جدید ہندوستان کے معمار" (مؤلفہ و مترجمہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی، ناشر: ترقی اردو بورڈ حکومت ہند، دہلی، ۱۹۷۹ء (پہلا اردو ایڈیشن، مترجم: احمد) میں کہا گیا ہے کہ چندر شیکھر آزاد کاکوری کیس میں شامل تھے، لیکن وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ ان کی گرفتاری کے لیے پولیس نے تیس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جب کہ پارٹی ری پبلکن سے "سوشلسٹ ری پبلکن" ہو چکی تھی، "ایسوسی ایشن" کے بجائے "آرمی" بنادی گئی۔ چندر شیکھر آزاد کے حالات میں لکھا ہے:

> ... مگر آزاد نے خود کو پولیس سے بچائے رکھا۔ (ایسوسی ایشن) کی از سر نو تنظیم کی اور بنگال میں اپنے ہم وطنوں سے رابطہ قائم کیا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں دہلی میں جب پارٹی نے ایک انتہا پسندانہ نصب العین کے لیے جدوجہد کا فیصلہ کیا اور بہ ایں وجہ وہ "ہندوستان ری پبلکن آرمی" میں تبدیل ہو گئی تو آزاد اس کے اعلیٰ ترین لیڈر اور ملٹری ڈویژن کے کمانڈر بن گئے"۔
>
> (ص ۱۲۷)

پارٹی کے انتہا پسندانہ نصب العین کی تبدیلی کے بعد آزاد کے عزائم اور اقدامات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی، اس کا اندازہ اس بیان کی اگلی سطروں ہی سے ہو جاتا ہے۔ اوپر کے اقتباس سے یہ سطریں مربوط ہیں:

> "آزاد بڑے خوش تدبیر تنظیم کار تھے۔ وہ وائسرائے کی ٹرین کو اڑا دینے کی کوشش میں، اسمبلی میں بم پھینکنے کے واقعے میں، دہلی سازش میں، سانڈرس کو لاہور میں گولی سے ہلاک کرنے میں اور دوسری لاہور سازش

میں شریک تھے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی پھانسی کا فیصلہ ہو گیا تو آزاد بہت پریشان ہوئے۔ ان لوگوں کو آزاد کرانے کے طریقے اور ذرائع وہ دیوانہ وار تلاش کرنے لگے اور دلیری اور شجاعت کے انفرادی کارناموں کی قدر و قیمت بھی ان کو مشکوک نظر آنے لگی"۔ (ایضاً)

سکھ دیو کے حالات میں بھی پارٹی کے "ایسو سی ایشن" کے "آرمی" بن جانے کا ذکر آیا ہے :

"انھوں نے ستمبر ۱۹۲۸ء میں انقلابی پارٹی کی دوبارہ تنظیم کر کے اس کو "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" میں تبدیل کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور پنجاب اور یوپی میں اس کی سرگرمیوں کی نگرانی کی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں سانڈرس کے قتل اور اپریل ۱۹۲۹ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکنے کا منصوبہ تیار کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھے"۔ (جدید ہندوستان کے معمار، ص ۱۲۹)

... آرمی کی تشکیل کا پس منظر

ان بیانات میں پارٹی کے انتہا پسندانہ نصب العین کی تبدیلی کا ذکر تو آگیا ہے لیکن ان حالات پر روشنی نہیں پڑتی کہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جس نے پارٹی کے ارکان کو پارٹی کے انتہا پسندانہ نصب العین کو اختیار کرنے اور انتہائی اقدامات کی حد تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتا رامیہ کے شکر گزار ہیں۔ ان کی تاریخی تالیف "تواریخ کانگریس" نے ہماری رہنمائی کی اور گتھی بہ خوبی سلجھ گئی۔

۱۹۲۸ء میں ہندوستان کی لیجس لیٹو اسمبلی میں ریزرو بنک اور پبلک سیفٹی کے متعلق دو بل پیش ہوئے۔ دونوں بلوں پر کانگریس کے نمائندوں اور حکومت کے ارکان میں زور کا معرکہ رہا۔

(۱) ریزرو بنک بل پر بحث ہوئی اور حکومت نے مسٹر سری نواس آئنگر کی متبادل تجویز پر "اسٹاک ہولڈرز بنک" کے قیام کو منظور کر لیا۔ لیکن پھر اس سے انکار کر دیا اور

بعض ترمیمات کے بعد پھر اسی بل کو پیش کرنا چاہا تو صدر (مسٹر وی جے پٹیل) نے ضابطے کی بنیاد پر اسے پیش کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے اس وقت بل کو ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا (ص ۴۰-۵۳۹)۔ لیکن ۸/اپریل ۱۹۲۹ء کو یہ بل پاس کر دیا گیا۔ (ص ۵۵۲)۔

اس بل کی اہمیت اور اس کو پاس کرانے کے لیے گورنمنٹ کے داؤں پیچ کے تفصیلی مطالعے کے لیے "تواریخ کانگریس" (حصہ سوم کے باب ۹) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۲) اصل بل جو ہمارا موضوع بحث ہے اور ہم قارئین کو جس کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، پبلک سیفٹی بل ہے، جس سے سنجیدہ سیاسی حلقے سے لے کر نوجوانوں اور خصوصاً انقلاب پسند نوجوانوں میں غصے اور اشتعال کی لہر دوڑ گئی تھی اور نوجوان کچھ کرنے اور مرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اور پنجاب سے لے کر بنگال تک کی انقلابی پارٹیاں ایک انتہا پسندانہ نصب العین اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ مؤلف "تواریخ کانگریس" لکھتے ہیں:

> "پبلک سیفٹی بل کی بھی کانگریس کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی۔ گو بہ ظاہر یہ بل غیر ملکی باشندوں کے لیے تھا۔ مگر یہ واضح ہو چکا تھا کہ اسے ہندوستانیوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے نے کہا:
>
> "میں ہاؤس کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا کہ یہ بل صرف غیر ملکی کمیونسٹوں کے خلاف استعمال نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ ہندوستانی مزدوروں اور قوم پرستوں کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ غیر ملکی کمیونسٹ تو ہندوستانی ٹیکس دہندگان کی رقوم پر ہندوستان سے نکالے جا سکتے ہیں۔ وہ انگلستان یا کسی اور جگہ لے جائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہاؤس یہ بل اور خصوصاً اس کی دفعہ نمبر ۲ منظور کرے گا تو یہ ہندوستانی قوم پرستوں اور ان لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا جو ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی

آزادی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس بل کا محض یہی مقصد
ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر سری نواس آینگر جو کامل
آزادی کا پرچار کر رہے ہیں، اسی دفعہ کے تحت آسکتے ہیں۔
اس بل پر ووٹ لیے گئے۔ ووٹ برابر تھے۔ لیکن
صدر نے ان کے (گورنمنٹ کے ارکان کے) خلاف رائے دی
اور بل فیل ہو گیا"۔ (ص ۵۴۰)

لالہ لاجپت رائے نے جس خطرے کی طرف اپنی تقریر میں اشارہ کیا تھا، وہ کوئی واہمہ نہ تھا۔ اس کا ثبوت گورنمنٹ کے عزائم اور اس کا سابقہ رویہ تھا اور جلد ہی اس کے کئی نظائر حکومت نے اپنے اقدامات سے پیش کر دیئے تھے۔ اور سب سے بڑی بات اسی بل کے بارے میں حکومت کا رویہ اور اسے پاس کرانے کے لیے وائسرائے کی بے چینی تھی اور راست طریقے سے بل کے پاس کرانے میں تاخیر ہوتے دیکھ کر آرڈی ننس کے ذریعے بل میں مجوزہ اختیارات انتظامیہ کو سونپ دینا اس کی بدنیتی کا ثبوت تھا۔

اس بل کے سلسلے میں اسمبلی کے پچھلے سیشن میں جو تقریریں ہوئی تھیں، جن میں سے لالہ لاجپت رائے کی تقریر کا اقتباس ہم ابھی پیش کر چکے ہیں۔ اس سے ارکان اسمبلی کے رجحان خصوصاً کانگریس کی رائے کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ۱۲/اپریل ۱۹۲۹ء کو صدر (مسٹر وی جے پٹیل) کی تقریر اور اس پر وائسرائے کے ردّعمل سے حکومت کے عزائم کھل کر اس طرح سامنے آگئے تھے کہ اب ان کے بارے میں کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ صدر نے کہا:

"پیشتر اس کے کہ میں ہاؤس کو پبلک سیفٹی بل پر جیسا کہ سلیکٹ کمیٹی نے بنایا ہے، غور کرنے کے لیے کہوں، میں اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہاؤس کے گزشتہ اجلاس سے اس وقت تک میں ہاؤس کے لیڈر کی پبلک سیفٹی بل کے متعلق مختلف تقاریر جو انھوں نے کیں، ان پر اچھی طرح غور کرتا رہا ہوں اور دوسری طرف کراؤن کی طرف سے ۳۱ اشخاص کے خلاف میرٹھ کی عدالت میں جو درخواست دی گئی ہے، اس پر بھی سوچتا رہا ہوں۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس بل کا تعلق اس مقدمے سے ہے جو ۳۱ اشخاص کے خلاف میرٹھ میں چلایا جانے والا ہے۔

آنریبل ممبران جانتے ہیں کہ اس ہاؤس کے کام کے قواعد کے مطابق کوئی ممبر اس معاملے کے متعلق نہ کوئی سوال دریافت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ریزولیوشن پیش کر سکتا ہے، جو کسی کورٹ آف لا میں سماعت کے لیے آگیا ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہاؤس اس سینٹی بل پر غور کر سکتا ہے کہ نہیں، جس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ مقدمۂ میرٹھ سے تعلق ہے۔ میرے خیال میں اس کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اس کے علاوہ اس بل کو منظور کرنا عملی طور پر اس اصول کی منظوری یا اس کا استرداد اس اصول کا مسترد کرنا ہوگا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں میں کیسے حکومت کو اسے پیش کرنے کی اجازت دوں! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کوئی رولنگ دینے کے بجائے گورنمنٹ کو اس پر دوبارہ غور کرنے کا مشورہ دوں۔ گورنمنٹ کو چاہیے کہ پہلے میرے خیالات پر غور کرے اور اس بل کو میرٹھ کے مقدمے کی سماعت تک کے لیے ملتوی کر دے"۔

صدر کی اس تقریر اور گورنمنٹ کے لیے مشورے پر مؤلف تواریخ کانگریس لکھتے ہیں :

"گورنمنٹ نے ان ہر دو تجاویز اور مشورے کو ماننے سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور اس بل کو پیش کرنے پر اصرار کیا۔ اب صدر نے اس بنا پر کہ ہاؤس کے قواعد اور قوانین کے خلاف ہے۔ اسے پیش کرنے کی اجازت نہ دینے کی رولنگ دے دی۔

دوسرے روز وائسرائے نے ہر دو ہاؤسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے ان طاقتوں اور اختیارات کو حاصل کرے جو پبلک سینٹی بل میں تجویز کیے گئے ہیں"

چنانچہ انھوں نے ایک آرڈی ننس جاری کر کے ایگزیکیٹو کو وہ اختیارات دے دیئے"۔

وائسرائے کے اس طرز تقریر اور نکتہ چینی پر مسٹر وی جے پٹیل (صدر قانون ساز اسمبلی) نے "زبردست پروٹسٹ" کیا۔ اس کے جواب میں وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری

نے ان کی طرف سے جواب دیا کہ

"ہز ایکسی لینسی کی خواہش ہے کہ میں آپ کو لکھوں کہ

ان کا ارادہ نہ تو آپ کے رولنگ پر کسی قسم کی نکتہ چینی کرنے کا تھا اور نہ آپ پر اعتراض کرنا مقصد تھا۔ وہ ہاؤس کی عزت اور چیئر کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے، اس تشویش میں آپ کے ساتھ شریک ہیں"۔

(کانگریس کی تواریخ یا ہندوستان کی جنگ آزادی : ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتارامیہ، ۱۹۳۰ء، لاہور، ص ۵۲-۵۵۰)

پچھلے صفحات میں چندر شیکھر آزاد اور سکھ دیو کے سلسلے میں "جدید ہندوستان کے معمار" کے حوالے سے ستمبر ۱۹۲۸ء میں "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کے نظام پر نظر ثانی، از سر نو تنظیم اور نصب العین کی تبدیلی کا جو ذکر آیا تھا اور اس تبدیلی اور انتہا پسندانہ نصب العین کے پس منظر کے جن واقعات کی تلاش میں ہم نکلے تھے۔ ان میں سب سے اہم یہی واقعہ "پبلک سیفٹی بل کا قضیہ" تھا۔ یہ بل ستمبر ۱۹۲۸ء میں اسمبلی میں پیش ہوا تھا۔ پھر جنوری ۱۹۲۹ء اور بعد میں اپریل میں زیر غور آیا اور وسط اپریل میں وائسرائے نے آرڈی ننس کے ذریعے سے نافذ کر دیا تھا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن امید تھی کہ یہ بل شاید ایکٹ نہ بن سکے اور ملک اس کی نحوست سے محفوظ رہ جائے لیکن اب جب کہ یہ وبال قوم پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ قوم کا اضطراب بھی عمل سے گزر گیا تھا۔ اس کی زد میں تو آئین و قانون کی حدود میں رہ کر کام کرنے والا بھی آسکتا تھا۔ لیکن انقلابی اور آزادی کو ہر صورت میں حاصل کرنے کا عزم رکھنے والے کارکن جو عام حالات میں محفوظ نہ تھے، ان کے لیے اس کے پھندے سے بچ نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔

آرمی کی تاریخ تشکیل

اب ہم... آرمی کی تشکیل کی قطعی تاریخ، اس کے پس منظر، اس کے ارکان اور اس سلسلے میں ان کوششوں کی تفصیلات تک پہنچ گئے ہیں۔ ان معلومات کے لیے ہم "انٹلی جینس بیورو ہوم ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا" کے شکر گزار ہیں اور اس کی مرتبہ رپورٹ "ٹیررازم ان انڈیا ـــ ۱۹۱۷ء-۱۹۳۶ء" سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ ایک خفیہ رپورٹ ہے جو

صرف گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام کے مطالعے کے لیے چھاپی گئی تھی۔ اس کے دو ابتدائی صفحوں کا عکس زیر نظر کتاب میں شامل کیا جاتا ہے جس کے مطالعے سے اس رپورٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے :

"پی این گھوش (Phanindra Nath Ghosh) نے ۱۹۲۸ء کے ابتدائی چند مہینے کلکتہ میں گزارے۔ لیکن یہاں اس کے مشاغل کا کوئی خاص نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ البتہ اس نے دوسروں کے ساتھ من موہن بنرجی اور کنول ناتھ تواری کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں گھوش نے وجے کمار سنہا کے ساتھ دورہ کیا۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ ہمیں پنجاب، یوپی، بہار، بنگال کی موجودہ پارٹیوں کو ملا کر ایک نئی پارٹی تشکیل دینی چاہیے۔ اس سلسلے میں ۸، ۹/ ستمبر کو دہلی میں ایک خفیہ میٹنگ کا انتظام کیا۔ اس تجویز کے مطابق ۴/ ستمبر کو یہ دونوں دہلی پہنچے اور ۹/ ستمبر کو قلعہ فیروز شاہ تغلق میں پہلے سے مقرر کی ہوئی ایک جگہ گئے اور پنجاب پارٹی کے ایک ممبر کندن لال سے ملے اور اس کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر ایک خفیہ جگہ گئے، جہاں بھگت سنگھ، سکھ دیو، جے دیو، شیو ورما، وجے کمار سنہا، برہم دت اور سریندر ناتھ پانڈے کے ساتھ ایک میٹنگ میں شریک ہوئے۔ دوسرے روز (۱۰/ ستمبر کو) گھوش اور بنرجی نے ایک دوسری میٹنگ میں حصہ لیا جس میں بھگت سنگھ، کندن لال، وجے کمار سنہا، سکھ دیو، جے دیو اور شیو ورما شریک تھے۔ اس میٹنگ میں طے پایا کہ "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی" کے نام سے ایک پارٹی تشکیل دی جائے گی، جس کی ایک سنٹرل کمیٹی ہو جس میں بہار کے لیے گھوش خدمات انجام دیں گے۔ اس میٹنگ کی تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ بنگال سے بم بنانے والوں کو لایا جائے گا جو آرمی کے ارکان کو بم بنانا سکھائیں گے۔ اس مقصد کے لیے گھوش اور بھگت سنگھ نے طے کیا کہ وہ کلکتہ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر دسمبر میں ملیں گے۔ بھگت سنگھ اور گھوش کے ساتھ ڈاکے ڈالنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور طے پایا کہ اس کے لیے بہار موزوں علاقہ ہے اور خاص وارداتوں کے تعین کے

لیے مشورہ ہوا۔

میٹنگ کے بعد گھوش بہار لوٹنے سے پہلے میرٹھ گئے اور وہاں سے امرتسر اور لاہور کا سفر کیا۔ اس سفر میں جب کہ وہ بھگت سنگھ کے ساتھ تھے، ڈکیتی کا فیصلہ معطل کر دیا گیا۔ اس دوران میں گھوش نے بھگت سنگھ کو ایک ریوالور دیا"۔

ایسوسی ایشن کا خاتمہ اور اس کا پس منظر

ری پبلکن آرمی کا قیام بڑے زور شور اور عزائم کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس کی شاخیں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئیں، اس نے کئی انقلابی منصوبے بنائے۔ لیکن کامیابی کا کیا سوال، کسی منصوبے پر عمل ہی نہ کیا جا سکا۔ ہمراہیوں کے بچھڑنے، گرفتار اور قید ہو جانے، سولی پر لٹکا دیے جانے، کالے پانی کی سزاؤں کی وجہ سے تمام سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ ادھر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اعلان سے مستقبل کے بارے میں کچھ امیدیں بندھ گئی تھیں، پھر ۱۹۳۷ء کے انتخابات اور قومی حکومتوں کے قیام سے تاریخ آزادی کی جس نئی صبح کا آغاز ہوا تھا اس کے بعد اندھیرے میں کوئی تحریک چلانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ گویا کہ انقلابی تحریکوں کا جو دور تھا وہ وقت کے ساتھ گزر گیا تھا۔

ان انقلابی تحریکات کے خاتمے کے وجوہ میں ایک بڑے دکھ کی بات بھی تھی اور وہ تھی اپنوں کی بے وفائی! اجے کمار گھوش نے ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن اور مختلف حالات میں وقت کی مصلحتوں کے مطابق تبدیل شدہ صورتوں کے انتشار اور خاتمے کے کئی وجوہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"۲۷ر فروری ۱۹۳۱ء میں چندر شیکھر آزاد کی موت سے ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کو اتنا بڑا دھکا لگا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکی۔ حکومت کی سختی اور مظالم کی وجہ سے یہ پارٹی ختم نہیں ہوئی، بلکہ اس کی چند بنیادی وجوہات تھیں۔

آزاد کی شخصیت میں لوگوں کو اتنا اعتماد اور اتنا بھروسہ تھا کہ باوجود ناکامیوں اور اندرونی نفاق کے پارٹی ٹوٹنے نہیں پائی۔ ان کے مرنے کے بعد

مایوسی بہت بڑھنے لگی۔ کیلاش پاٹھے جیسے سرگرم لیڈروں کے دھوکے سے پارٹی کے کارکنوں کو بہت دھکا پہنچا۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آزاد کی موت بھی اسی لیے ہوئی کہ ایک دوسرے مشہور ساتھی نے دھوکا دیا تھا۔ کسی کو کسی پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ہر شخص دوسرے پر الزام رکھتا تھا۔ اس سے فضا اور خراب ہونے لگی۔ پولیس کے ایجنٹ جو پارٹی میں گھس آئے تھے، انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ پھر بعض خود غرضوں نے پیسے ادھر اُدھر کر دیے۔ بعض نے ذاتی اغراض کے لیے ڈاکے ڈالے۔ اخلاقی حالت بہت گر گئی۔

ان حالات سے بددل ہو کر اکثر نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھیں نہ دہشت پسندی میں اعتماد رہا، نہ اپنے ساتھیوں میں، نہ اپنی ذات میں اور نہ ہی ملک کی آزادی میں۔ وہ اب کہنے لگے تھے کہ اس ملک میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈرپوک لوگوں اور غداروں کا ملک ہے۔ پولیس نے آہستہ آہستہ بہت ساروں کو گرفتار کر لیا اور بڑی بڑی سزائیں دیں، جو اس سے بچ رہے انھوں نے ہر چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آزاد اور بھگت سنگھ نے جس پارٹی کو اپنی بے غرض قربانیوں اور اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا، آج اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں کی تاب نہ لا سکنے کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے پوری طرح سے واضح ہو رہی تھی کہ درمیانی طبقے کے نوجوانوں پر مشتمل انقلابی جماعت لوگوں سے علیحدہ رہ کر محض اپنی انفرادی جدوجہد سے ملک کو بیدار اور متحرک نہیں کر سکتی اور اس پارٹی کے اندرونی اتحاد اور جذبے کا انحصار لیڈروں کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں نے ہمیں خیالی دنیا سے نکال دیا"۔

(بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی: اجے کمار گھوش،

۱۹۸۵ء، کراچی، ص ۵۷-۵۶)

باب چہاردہم

چند تاریخی دستاویزات

ذیل میں چند ہسٹاریکل ڈاکومنٹس مرتب کیے گئے ہیں، ان کی تاریخی اہمیت اور مطالعے کی افادیت میں شبہ نہیں۔ یہ اصل دستاویزات انگریزی زبان میں ہیں۔ اس لیے ان کی ڈاکومنٹری اہمیت بھی انگریزی میں ہے، ان کے ترجمے میں نہیں۔ یہ ایں وجہ ان کا انگریزی میں چھپنا تو لازمی ہے۔ اب اگر انگریزی کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی شامل کرلیا جائے تو عام قارئین کے لیے یہ بلاشبہ دلچسپی کا موجب ہوگا، لیکن کتاب اوسط ضخامت کے دایرے سے نکل جائے گی اور اس سے بعض مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس لیے میرا خیال ہے کہ ان دستاویزات کا ان کی تحریر واشاعت کی زبان ہی میں شائع ہونا ضروری ہے۔ جن اصحابِ ذوق و مطالعہ کی توجہ کا موضوع یہ دستاویزات بنیں گی وہ ان کے ترجمے کے محتاج نہیں ہو سکتے!

دستاویزات یہ ہیں :

(۱) ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن :

نام

مقصد

صوبائی تنظیم

شعبہ جات

ڈسٹرکٹ آرگنائزر اور اس کی ذمہ داریاں

صوبائی کونسل اور مرکزی کونسل (اور ان کے حصے)

پروگرام

عوامی (پبلک)

ذاتی (پرائیویٹ)

رکنیت

(۲) ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن :

منشور

فلاسفی آف بم — تعارف
تشدد اور عدم تشدد
ہمارا آئیڈیل
دہشت گردی
انقلابی اصول
کانگریس اور انقلاب پسند
گاندھیائی طریقۂ جنگ
کیا عوام عدم تشدد پر یقین رکھتے ہیں؟
محبت کی خوش خبری!
کیا کچھ ہو سکتا ہے

کانگریس کا مستقبل
تشدد اور فوجی خرچ
اصلاحات
کانگریس کا طریقہ
ترک موالات کی ناکامی
کیا یہ نیا زمانہ ہے؟
دھونس نہیں چلے گی
ایک اپیل!
جیت یا موت!

(۳) ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن :

منشور : ایک دو ورقہ جو کانگریس کے سالانہ اجلاس کلکتہ (دسمبر ۱۹۲۸ء) کے موقع پر تقسیم کیا گیا۔

(۴) انقلاب زندہ باد :

ایک نوٹس جو سینٹ جونز کالج، آگرہ کے گیٹ پر چسپاں کیا گیا تھا۔

(۵) بنگال کے نوجوان :

ایک دو ورقہ جو مچھوابازار (کلکتہ) میں دسمبر ۱۹۲۹ء میں پایا گیا۔

(۶) خفیہ — ایک اقتباس :

چٹاگانگ میں قائم کی جانے والی ایک خصوصی ٹریبونل کے مقدمے کی روداد سے ایک اہم اقتباس۔

child of any age to its headquarters, dead or alive, will be amply rewarded.

BY ORDER
PRESIDENT IN COUNCIL,
Indian Republican Army,
Chittagong Branch.

—

up who will triumph over death, who with their fresh blood prepare the steps to Independence of Young Ireland in the next era". Pearse died and by so dying he roused in the heart of the nation an indomitable desire for armed revolution. Who will deny this truth? That lion of a hero did not tremble owing to the inferiority of his number – that revolutionary was not moved at the request of the old man. This is his peculiarity. Oh, the party of men deprived of everything – open your eyes and see where your position is. So, the call to break the bondage has come today and you will have to respond to that call. You will have to make the place of the enchained Bharat Mata in the world glorious, and it would be a matter of pride if you will have to stand alone at the outset against the despotism of the blood-thirsty English.

No fear there is no fear

He who will give his life completely

Will sustain no loss.

SECRET

EXTRACT FROM PAGES244-245, VOLUME I, OF THE PROCEEDINGS OF THE COURT OF SPECIAL TRIBUNAL, CHITTAGONG.

The Indian Republican Army, Chittagong Branch, hereby declares today the lives of all Englishmen and white-skinned Anglo-Indians who are prejudicial to the interest of Indian freedom, forfeited to it. It also entreats all the members of The Indian Republican Army and the people of chittagong to begin a vigorous campaign of murdering these people wherever found to avenge the murders of their forefathers and thus to relieve the country of the pernicious exploitations which they are doing in this land of OURs.

The Indian Republican Army further declares that any person who will be able to produce any Englishman, woman or

sort of wrong doing by the foreigner. Anyhow I shall try to make a campaign with my little power against it" – it will at once be proclaimed by the self sufficient leaders that this is the work of a spy. In this way the so-called grandiloquent leaders want to pulverize the movement of a nation's life; because it strikes at the root of their proficiency – hurts their leadership.

The extreme proof of barbarism of the fiendish English people is the murder of Jatindranath in the Lahore Prison House. Bengali Youths! Will it not drag you now towards a bloody campaign? Will the fascination of untruth keep you as imbecile even now? Young Bengalis? Will not your revolutionary spirit stir up to play with fire at the self sacrifice of Jatin? Will it not blossom like a red lotus? Will not the proof of convetousness of the English Government, the merciless oppressions on all quarters and the barrowing persecutions teach you to think seriously where your path lies? Do not select a wrong path being stupefied by the old leaders of Bengal. Stand on your legs. You will find that your strength is irresistible and unlimited. You will be in a position to crumble everything.. What is your fear? What is your anxiety? This is how a nation awakes. Flare up with the fire of vengeance for the annihilation of foreign enemies. You will find that the victory is yours. History bears testimony to this. Read and learn the history of Pearse – the gem of young Ireland and you will find how noble is his sacrifice: how he stimulated new animation in the nation, being mad over independence. When everybody was reluctant to die he alone proclaimed loudly – "I cannot live. Even if I am alone I shall have to come to the field of activity with the banner of an armed revolution in order to bring vigour in the life of this inanimate nation. With my death a hundred heroes will spring

some by welcoming hangman's rope, some by receiving bullet wounds, some by courting imprisonment in solitary cells and some by welcoming transportation in distant islands. That midnight dawned with the self-sacrifice of the revolutionary hero, Khudiram, Rudra (violence) worshipper, Kanialal and the bloody revolutionary Satyen. Then slowly as the light of day began to be scorching the fertile soil of Bengal was reddened with the hot blood of the many revolutionary heroes maddened with the joy of shedding blood. The Bengal, youths with great pains have not been able to forget up till now the offering of Jatin Mukherji and Nalini Bagchi of that age. Then, when the political sky of India became surcharged with the vilification of the anarchists consequent on the agitation of non-violent non-co-operation, and when Mohandas Gandhi, the inaugurator of non-co-operation, and who is confident in English co-operation himself, smelt nothing but blunder in this extraordinary self-sacrifice, the embracing of death by dreadful soldier Gopinath by breaking the stillness, explained to the confounded Rudra worshippers (anarchists) of Bengal which was the road to freedom. In search of that path many youths ran recklessly, and in their attempt to destroy the blood the blood-sucking of the covetous ruler, they, according to the custom of a dependent country, sacrificed themselves as a bloody offering in that fearful oblation with fire. But unfortunately, in spite of it the stillness of the country did not break. The inanimateness of the nation remained unmovingly fixed like a heavy chain and the helpless nation sank down in dolefulness. The matter of regret is that if anyone ever wants to draw a ray of light in this great night of New Moon, then there will rise from all quarters an uproar of incantation of "non-violence" or there will come out a false hoax of something very great. If any one ever giving out owing to mortal anguish and says "No, I shall never bear silently this

Well Known Mild Rule of Pardon, I am glad to say that they were disappointed".

Further they warned that they stake their lives if they come in our way. British officials should take long furloughs and go home. We hold humanity sacred but Government our enemy.

We thank the Principal, Agra College and the Warden, Medical School for the loyalty they have shown to the Government. The students should condemn the action of that boy who took the Manifesto to the Principal. A social boycott is sufficient for such a traitor.

Get youself enlisted soon. More you will find next week at this very place.

Long Live Revolution*[1]

BRANCH OFFICE
Naudab, Budaon

Kailash Singh
President

The Youths of Bengal

"From the seeming stillness of the sea of Indian humanity a veritable storm is about to break out".

The critical moment for the fire-worshipping youthful sons (anarchists) of Bengal to bring the truth into reality has come. It has become necessary to stem the tide of the hideous oppressions that are being practised on the men and women of this country by the power-puffed and oppressive foreign rulers in the name of law and order. Since the beginning of the 20th century and up till now many youths of the country sacrificed completely their youthful qualities in order to stop the tide,

* Copy of a leaflet in the Machuabazar Street, Search (December, 1929)

Make India another, Ireland and the reins of Government are in your hands. Without the least agitation you should meet the scaffold even as a yogi enters the samadhi. The appetite for revolution is apt to grow with what it feeds on.

Remember the words of an Englishman who says "we have the power of life in our hands and I assure you we spare not ....,,

Atrocities were committed in the burning of village and massacre of innocent inhabitants at which Mohammad Tughlak himself would have stood ashamed. They have sewed Mohammedans in pig skin and smeared them with pork fat before execution during the mutiny and then burning their bodies and they have forced Hindus to defile themselves. It is plain enough from Russels diary.

They did not deliberately hang Indians but burnt them in their villages. The Englishmen did not hesitate to boast that they had spared no one and that peppering away at niggers was pleasant past time enjoyed amazingly.

An Englishman is almost suffocated with indignation when he reads that Chambers or Miss Jernnings was hacked to death by a dusky ruffian but in native history or legends and tradition it may be recorded against our people that mothers, wives and children with less familiar names fell miserable victims to the first swoop of English vengeance.

Our C.I.D. friends must remember the report of Montgomery Martin:

> "All the city people were bayonated on the spot when our army entered Delhi, the number was considerable when I tell you that in some houses 40 or 50 persons were hiding, they were not mutineers but residents of city who trusted to our

paralysing effects of long lethargy. Yours is a noble Mission. Go out into every nook and corner of the country and prepare the ground for future Revolution which is sure to come. Respond to the clarion call of duty. Do not vegetate. Grow! Every minute of your life you must think of devising means so that this your ancient land may arise with flaming eyes and fierce yawn! Sow the seeds of disgust and hatred against British Imperialism in the fertile minds of your fellow youths. And the seeds shall sprout and there shall grow a jungle of sturdy trees, because you shall water the seeds with your warm blood. Then a grim and terrible earthquake having a universally destructive potentiality shall inevitably come along with portentous rumblings, and this edifice of Imperialism will crash and crumble to dust, and great shall be the fall thereof. And then and not till then, a new Indian Nation shall arise and surprise humanity with the splendour and glory all its own. The wise and the mighty shall be bewildered by the simpleand the weak.

Individual liberty shall be safe. The sovereignty of the proletariat shall be recognized. We court the advent of such Revolution. Long live Revolution!

Kartar Singh
President
Copy of the notice found pasted on the gate of John's College, Agra

Long live Revolution

WITHOUT LIBERTY LIFE IS NOT WORTH LIVING

Youth ye are the source of liberty, the hope of the country, nay the saviour of the motherland. Loyalty to this tyranny and exploitation makes you traitor to your country by summarily disposing off and launching many of your brothers to eternity.

aspect also. England's enemies, which are many, are drawn towards us by effective demonstration of our strength. That in itself is a great advantage.

India is writhing under the yoke of imperialism. Her teeming millions are today a helpless prey to poverty and ignorance. Foreign domination and economic exploitation have unmanned the vast majority of the people who constitute the workers and peasants of India. The position of the Indian Proletariat is, today, extremely critical. It has a double danger to face. It has to bear the onslaught of Foreign Capitalism on one hand and the treacherous attack of Indian Capital on the other. The latter is showing a progressive tendency to join forces with the former. The leaning of certain politicians in favour of Dominion Status shows clearly which way the wind blows. Indian Capital is preparing to betray the masses into the hands of Foreign Capitalism and receive as a price of this betrayal, a little share in the Government of the country. The hope of the proletariat is, therefore, now centred in Socialism which alone can lead to the establishment of Complete Independence and the removal of all social distinctions and privileges.

The future of India rests with the youths. They are the salt of the earth. Their promptness to suffer, their daring courage and their radiant sacrifice prove that India's future in their hands is perfectly safe. In a moment of realization the late Deshbandhu Dass said, "The youths are at once the hope and glory of the Motherland. Theirs is the inspiration behind the movement. Theirs is the sacrifice. Theirs is the victory. They are torch-bearers on the road to Freedom. They are the pilgrims on the road to Liberty"

Youths-ye-soldiers of the Indian Republic, fall in! Do not stand easy, do not let your knees tremble. Shake off the

situated as we are, never hope to win our freedom by mere non-violence. The world is armed to the very teeth. And the world is too much with us. All talk of peace may be sincere, but we, of the slave Nation, cannot, and must not, be led away by such false Idealogy. What Logic, we ask, is there in asking the country to traverse a non-violent path when the world atmosphere is surcharged with violence and exploitation of the weak? We declared with all the emphasis we can command that the youths of the Nation cannot be lured by such mid-summer-night's dream.

We believe in violence, not as an end in itself but as a means to a Noble End. And the votaries of non-violence, as also the advocates of Caution and circumspection will readily grant this much at least that we know how to suffer for, and to act upto, our convictions. Shall we here recount all those sacrifices, which our comrades have offered at the altar of our common Mother? Many a heart-rending and soul-stirring scene has been enacted inside the four walls of His Majesty's Prison: We have been taken to task for our Terroristic Policy. Our answer is that terrorism is never the object of revolutionaries, nor do they believe that terrorism alone can bring independence. No doubt the revolutionaries think, and rightly, that it is only by resorting to terrorism alone that they can find a most effective means of retaliation. The British Government exists, because the Britishers have been successful in terrorising the whole of India. How are we to meet this official terrorism? Only counter-terrorism on the part of revolutionaries can checkmate effectively this bureaucratic bullying. A feeling of utter helplessness pervades society. How can we overcome this fatal despondency? It is only by infusing a real spirit of sacrifice that that lost self-confidence can be restored. Terrorism has its Inter-national

desperadoes. Revolution may be anti-God but is certainly not anti-Man. It is a vital, living force which is indicative of eternal conflict between the Old and the New, between Life and Living Death, between Light and Darkness. There is no concord, no symphony, no rhythm without revolution. 'The music of the spheres of which poets have sung, would remain an unreality if a ceaseless Revolution were to be eliminated from the space. Revolution is Law. Revolution is Order and Revolution is the Truth.

The youths of our Nation have realized this Truth. They have learnt painfully the lesson that without Revolution there is no possibility of enthroning Order, Law and Love in place of chaos and Legal Vandalism and Hatred which are reigning supreme today. Let no one, in this blessed land of ours, run with the idea that the youths are irresponsible. They know where they stand. None knows better, than their own selves, that their path is not strewn with roses. From time to time they have paid a fairly decent price for their Ideals. It does not, therefore, lie in the mouth of anybody to say that youthful impetuosity has feasted upon platitudes. It is no good to hurl denunciatory epithets at our Idealogy. It is enough to know that our Ideas are sufficiently active and powerful to drive us on aye, even to gallows.

It has become a fashion these days to indulge in wild and meaningless talk of non-violence. Mahatma Gandhi is great and we mean no disrespect to him if we express our emphatic disapproval of the methods advocated by him for our country's emancipation. We would be ungrateful to him if we do not salute him for the immense awakening that has been brought about by his non-co-operation movement in the country. But to us the Mahatma is an impossible visionary. Non-violence may be a noble Ideal, but it is a thing of the morrow. We can,

*THE HINDUSTAN SOCIALIST REPUBLICAN ASSOCIATION

MANIFESTO

"THE FOOD ON WHICH THE TENDER PLANT OF LIBERTY THRIVES IS THE BLOOD OF THE MARYR"

For decades this life blood to the plant of India's liberty is being supplied by revolutionaries. There are few to question the magnanimity of the noble ideals they cherish and the grand sacrifices they have offered, but their normal activities being mostly secret the country is in dark as to their present policy and intentions. This has necessitated the Hindustan Socialist Republican Association to issue this manifesto.

This association stands for Revolution in India in order to liberate her from foreign domination by means of organized armed rebellion. Open rebellion by a subject people must always in the nature of things be preceded by secret propaganda and secret preparations. Once a country enters that phase the task of an alien Government becomes impossible. It might linger on for a number of years but its fate is sealed. Human nature, with all its prejudices and conservatism, has a sort of instinctive dread for Revolution. Upheavals have always been a terror to holders of power and privilege. Revolution is a phenomenon which nature loves and without which there can be no progress either in nature or in human affairs. Revolution is certainly not unthinking, brutal campaign of murder and incendiarism: it is not a few bombs thrown here and a few shots fired there: neither it is a movement meant to destroy all remnants of civilization and blow to pieces time-honoured principles of Justice and Equity. Revolution is not a philosophy of despair or a creed of

* Circulated at the Lahore Congress in December,1929

call upon every patriot to take up the fight in all seriousness. Let nobody toy with the nation's freedom, which is her very, life, by making psychological experiments in non-violence and such other novelties. Our slavery is our shame. When shall we have courage and wisdom enough to be able to shake ourselves free of it? What is our great heritage of civilization and culture worth if we have not enough self-respect left in us to prevent us from bowing surveillance to the commands of foreigners and paying homage to their flag and king?

Victory or death

There is no crime that Britain has not committed in India. Deliberate misrule has reduced us to paupers, has 'bled us white'. As a race and a people we stand dishonored and outraged. Do people still expect us to forget and to forgive? We shall have our revenge – a people's righteous revenge on the Tyrant. Let cowards fall back and cringe for compromise and peace. We ask not for merely and we give no quarter. Ours is a war to the end – to Victory or Death.

Long live revolution!

Kartar Singh
President
Hindustan Socialist Republican Association

not understand revolutionary psychology inspite of his life-long experience of public life. Life is a precious thing. It is dear to every one. If a man becomes a revolutionary, if he goes about with his life in the hollow of his hand ready to sacrifice it at any moment, he does not do so merely for the fun of it. He does not risk his life merely because sometimes, when the crowd is in a sympathetic mood, it cries 'Bravo' in appreciation. He does it because his reason forces him to take that course, because his conscience dictates it. A revolutionary believes in reason more than anything. It is to reason, and reason alone, that he bows. No amount of abuse and condemnation, even if it eminates from the highest of the high, can turn him from his set purpose. To think, that a revolutionary will give up his ideals if public support and appreciation is withdrawn from him, is the highest folly. Many a revolutionary has, stepped on to the scaffold and laid his life down for the cause, regardless of the curses that the constitutionalist agitators rained plentifully upon him. If you will have the revolutionaries suspend their activities, reason with them squarely. That is the one and the only way. For the rest let their be no doubt in anybody's mind. A revolutionary is the last person on earth to submit to bullying.

An Appeal

We take this opportunity to appeal to our countrymen – to the youth, to the workers and peasants, to the revolutionary intelligentsia – to come forward and join us in carrying aloft the banner of freedom. Let us establish a new order of society in which political and economic exploitation will be an impossibility. In the name of those gallant men and women, who willingly accepted death so that we, their descendants, may lead a happier life, who toiled ceaselessly and perished for the poor, the famished, and exploited millions of India, we

lay hanging in the balance till midnight of that date, and that the scales might have been turned at even the eleventh hour fifty-ninth minute had a message from the Viceroy or the Secretary of State come to the Congress granting Dominion Status, proves that Independence is not a heart hunger of the leaders but that the declaration of it is only like a petulant child's retort. It would have been a worthy action of the Indian National Congress if Independence was achieved first and declared afterwards". It is true that the congress orators will henceforth harangue the masses on Complete Independence instead of Dominion Status. They will call upon the people to prepare for a struggle in which one party is to deliver blows and the other is simply to receive them, till beaten and demoralized beyond hope of recovery! Can such a thing be named a struggle and can it ever lead the country to Complete Independence? It is all very well to hold fast to the highest ideal worthy of a nation, but it is none the less necessary to adopt the best, the most efficacious and tried means, to achieve it ere you become the laughing stock of the whole world.

No Bullying please

Gandhi has called upon all those who are not past reason to withdraw their support from the revolutionaries and condemn their actions so that 'our deluded patriots may, for want of nourishment to their violent spirit, realize the futility of violence and the great harm that violent activities have every time done'. How easy and convenient it is to call people deluded, to declare them to be past reason, to call upon the public to withdraw its support and condemn them so that they may get isolated and be forced to suspend their activities, specially when a man holds the confidence of an influential section of the public. It is a pity that Gandhi does not and will

national workers and one and a quarter crores of rupees. More recently, it failed to win for the Barodli peasants what the leaders of the Satyagraha movement had promised them – the famous irreducible minimum of Gandhi and Patel. We know of no other trials non-violence has had on a country-wide scale. Up to this time, non-violence has been blessed with one result – Failure. Little wonder then, that the country refuses to give it another trial. In fact Satyagraha as preached by Gandhi is a form of agitation – a protest, leading up invariably, as has already been seen, to a compromise. It can hardly be of any use to a nation striving for national independence which can never come as the result of a compromise. The sooner we recognize, that there can be no compromise between independence and slavery, the better.

Is it a new era?

'We are entering upon a new era' thinks Gandhi. The mere act of defining swaraj as Complete Independece, this technical change in the congress constitution, can hardly constitute a new era. It will be a great day indeed when the congress will decide upon a country-wide programme of Mass Action, based on well recognized revolutionary principles. Till then the unfurling of the flag of Independence is a mockery and we concur with the following remarks of Sarla Devi Chaudharani, which she recently made, in a press interview.

"The unfurling of the Flag of Independence", she says "at just one minute after midnight of the 31st December,1929 was too stagy for words – just as the G.O.C. and the assistant G.O.C. and others in gaudy uniforms were card board Grand Officers Commanding".

"The fact that the unfurling of the flag of Independence

The Way of Progress

As to Gandhi's contention that violence impedes the march of progress and thus directly postpones the day of freedom, we can refer him to so many contemporary instances where violence has led to the social progress and political freedom of the people who practised it. Take the case of Russia and Turkey for example. In both countries the party for progress took over the state organization through an armed revolution. Yet social progress and political freedom has not been impeded. Legislation, backed by force, has made the masses go 'double march' on the road of progress. The solitary example of Afghanistan cannot establish a political formula. It is rather the exception that proves the rule.

Failure of Non-co-operation

Gandhi is of opinion that the great awakening in the people, during the days of non-co-operation, was a result of the preaching of non-violence. It is wrong to assign to non-violence the widespread awakening of the masses which, in fact, is manifested where ever a programme of direct action is adopted. In Russia, for instance, there came about widespread awakening among the peasants and workers, when the communists launched forth their great programme of Militant Mass Action, though nobody preached non-violence to them. We will even go further and state that it was mainly the mania for non-violence and Gandhi's compromise mentality that brought about the disruption of the forces that had come together at the call of Mass Action. It is claimed that non-violence can be used as a weapon for righting political wrongs. To say the least, it is a novel idea, yet untried. It failed to achieve what were considered to be the just rights of Indians in South Africa. It failed to bring 'Swaraj within a year' to the Indian masses inspite of the untiring labours of an army of

accuracy of his statement and challenge him to prove his statement with facts and figures. If, on the other hand, he had the wars that have taken place in India since the British came here in mind, our reply is that even his modest experiment in Ahimsa and Satyagarh which had little to compare in it with the wars for independence, produced its effect on the finances of the Bureaucracy. Mass action, whether violent or non-violent, whether successful or unsuccessful, is bound to produce the same kind of repercussions on the finances of a state.

The Reforms

Why should Gandhi mix up the revolutionaries with the various constitutional reforms granted by the government? They never cared or worked for the Morley Minto Reforms, Montague Reforms and the like. These the British Government threw before the constitutionalist agitators to lure them away from the right path. This was the bribe paid to them for their support to the government in its policy of crushing and uprooting there revolutionaries. These toys – as Gandhi calls them – were sent to India for the benefit of those, who, from time to time, raised the cry of 'Home Rule', 'Self-Government', 'Responsible Government' 'Full Responsible Government','Dominion Status' and such other constitutional names for slavery. The revolutionaries never claim the Reforms as their achievements. They raised the standard of independence long ago. They have lived for it. They have ungrudgingly laid their lives down for the sake of this ideal. They claim that their sacrifices have produced a tremendous change in the mentality of the people. That their efforts have advanced the country a long way on the road to Independence, is granted by even those who do not see eye to eye with them in politics.

and his olive tongue, have we to thank for our grave misfortunes? And yet there exist people in our country who proclaim him a Friend of India.

The Future of the Congress

There might be those who have no regard for the congress and hope nothing from it. If Gandhi thinks the revolutionaries belong to that category, he wrongs them grievously. They fully realize the part played by the congress in awakening, among the ignorant masses, a keen desire for freedom. They expect great things of it in the future. Though they hold firmly to their opinion, that so long as persons like Sen Gupta, whose wonderful intelligence compels him to discern the hand of the C.I.D. in the late attempt to blow up the Viceroy's Special, and persons like Ansari, who think abuse the better part of argument and know so little of politics as to make the ridiculous and fallacious assertion that no nation had achieved freedom by the Bomb, have a determining voice in the affairs of the congress, the country can hope little from it, they are hopefully looking forward to the day, when the mania of non-violence would have passed away from the congress, and it would march arm in arm with the revolutionaries to their common goal of Complete Independence. This year it has accepted the ideal which the revolutionaries have preached and lived upto for more than a quarter of a century. Let us hope the next year will see it endorse their methods also.

Violence and Military Expenditure

Gandhi is of opinion that as often as violence has been practised in the country, it has resulted in an increase of military expenditure. If his reference is to revolutionary activities during the last twenty- five years we dispute the

his way of thinking. Now, he has devoted his whole life to the preaching of his wonderful gospel and has practised it with unwavering constance, as few others have done. Will he let the world know how many enemies of India he has been able to turn into friends? How many O'Dwyers, Dyers, Readings and Irwins has he been able to convert into friends of India? If none, how can India be expected to share his 'growing faith', that he will be able to persuade or compel England to agree to Indian Independence through the practice of non-violence.

What would have happened

If the bomb that burst under the Viceroy's special had exploded properly, one of the two things suggested by Gandhi would have surely happened. The Viceroy would have either been badly injured or killed. Under such circumstances there certainly would have been no meeting between the leaders of political parties and the Viceroy. The uncalled for and undignified attempt on the part of these individuals, to lower the national prestige by knocking at the gates of the Government House with the beggar's bowl in their hands and Dominion Status on their lips, inspite of the clear terms of the Calcutta Ultimatum, would have been checkmated and the nation would have been the better off for that. If, fortunately, the explosion had been powerful enough to kill the Viceroy, one more enemy of India would have met a well deserved doom. The author of the Meerut prosecutions and the Lahore and Bhusawal persecutions can appear a Friend of India only to the enemies of her Freedom. Inspite of Gandhi and the Nehru and their claims to political sagacity and statesmanship, Irwin has succeeded in shattering the unity between different political parties in the country, that had resulted from the boycott of the Simon Commission. Even the congress today is a house divided against itself. Who else, except the Viceroy

limit to where a motor car can take him, the practice, of staying only with the richest people in the places visited, of spending most of his time on being complimented by his devotees in private and public and of granting Darshan, now and then, to the illiterate masses, whom he claims to understand so well, disqualifies him from claiming to know the mind of the masses. No man can claim to know a people's mind by seeing them from the public platform and giving them Darshan and Updesh. He can at the most claim to have told the masses what he thinks about things. Has Gandhi, during recent years mixed in the social life of the masses? Has he sat with peasants round the evening fire and tried to know what he thinks? Has he passed a single evening in the company of a factory labourer and shared with him his vows? We have, and therefore we claim to know what the masses think. We assure Gandhi that the average Indian like the average human being, understands little of the fine theological matters about "Ahimsa' and 'loving one's enemy". The way of the world is like this. You have a friend; you love him, sometimes so much that you even die for him. You have an enemy, you shun him, you fight against him and if possible, kill him. The gospel of the revolutionaries is simple and straight. It is what it has been since the days of Adam and Eve and no man has any difficulty about understanding it. We affirm that the masses of India are solidly with us because we know it from personal experience. The day is not far off when they will flock in their thousands to work the will of the Revolution.

The Gospel of Love

Gandhi declares that his faith in the efficacy of non-violence has increased. That is to say, he believes more and more, that through his gospel of love and self-imposed suffering, he hopes somebody to convert the foreign rulers to

indulged in abuse, called the revolutionaries 'cowards' and described their actions as 'dastardly' – and one of them even threateningly remarked, that if they wanted to be led by Gandhi, they should pass this resolution without any opposition – inspite of all this, the resolution could only be adopted by a dangerously narrow majority. That demonstrates, beyond the shadow of a doubt, how solidly the country is backing the revolutionaries. In a way Gandhi deserved our thanks for having brought the question up for discussion and thus having shown to the world at large that even the congress – that stronghold of non-violence – is at least as much, if not more, with the revolutionaries than with him.

Gandhi on War Path

Having achieved a victory which cost him more than a defeat, Gandhi has returned to the attack in his article "The Cult of the Bomb". We will give it our closest attention before proceeding further. That article consists of three things, his faith, his opinion and his arguments. We will not discuss what is a matter of faith with him because reason has little in common with faith. Let us then take such of his opinions as are back by arguments and his arguments proper, against what he calls violence and discuss them one by one.

Do the masses believe in non-violence?

He thinks that on the basis of his experience during his latest tour in the country, he is right in believing that the large masses of Indian Humanity are yet untouched by the spirit of violence and that non-violence has come to stay as a political weapon. Let him not delude himself on the experiences of his latest tour in the country. Though it is true that the average leader confines his tours to places where only the mail train can conveniently land him, while Gandhi has extended his tour

experience of a country-long and world-wide struggle, between the masses and the governing class, is their guide to their goal and the methods they are following have never been known to have failed.

The Congress and the Revolutionaries

Meanwhile, what has the congress been doing? It has changed its creed from Swaraj to Complete Independence. As a logical sequence to this, one would expect it to declare a war on the British Government. Instead, we find, it has declared war against the Revolutionaries. The first offensive of the Congress came in the form of a resolution deploring the attempt made on the 23rd December 1929, to blow up the Viceroy's special. It was drafted by Gandhi and he fought tooth and nail for it, with the result, that it was passed by a trifling majority of 81 in a house of 1,713. Was even this bare majority a result of honest political convictions? Let us quote the opinion of Sarla Devi Chaudhrani, who has been a devotee of the Congress all her life, in reply. She says, "I discovered in the course of my conversations with a good many of the Mahatma's followers that it was only their senses of personal loyalty to him that was keeping them back from an expression of their independent views and preventing them from voting against any resolution whatsoever that was fathered by Mahatmaji". As to Gandhi's arguments in favour of his proposition, we will deal with them later, when we discuss his article, "The Cult of the Bomb" which is more or less, an amplification of his speech in the congress. There is one fact about this deplorable resolution which we must not lose sight of, and that is this. Inspite of the fact, that the congress is pledged to non-violence and has been actively engaged in carrying on propaganda in its favour for the last ten years, and, inspite of the fact also, that the supporters of the resolution

will give birth to a new State – a new social order. Above all, it will establish the Dictatorship of the Proletariat and will for ever banish social parasites from the seat of political power.

Terrorism

The revolutionaries already see the advent of the revolution in the restlessness of youth, in its desire to break free from the mental bondage and religious superstitions that hold them. As the youth will get more and more saturated with the psychology of revolution, it will come to have a clearer realisation of national bondage and a growing, intense, unquenchable thirst for freedom. It will grow, this feeling of bondage, this insatiable desire for freedom, till, in their righteous anger, the infuriated youth will begin to kill the oppressors. Thus has Terrorism been born in the country. It is phase, a necessary, an inevitable phase of the revolution. Terrorism is not the complete Revolution and the Revolution is not complete without Terrorism. This thesis can be supported by an analysis of any and every revolution in history. Terrorism instils fear in the hearts of the oppressors, it brings hopes of revenge and redemption to the oppressed masses, it gives courage and self-confidence to the wavering, it shatters the spell of the superiority of the ruling class and raises the status of the subject race in the eyes of the world, because it is the most convincing proof of a nation's hunger for Freedom. Here in India, as in other countries in the past, Terrorism will develop into the Revolution and the Revolution into Independence, social, political and economic.

Revolutionary Methods

This then is what the revolutionaries believe in, this is what they hope to accomplish for their country. They are doing it both openly and secretly and in their own way. The

goes by the name of non-violence is in reality the theory of soul-force, as applied to the attainment of personal and national rights through courting suffering and hoping thus to finally convert your opponent to your point of view. When a revolutionary believes certain things to be his right, he asks for them, pleads for them, argues for them, wills to attain them with all the soul-force at his command, stands the greatest amount of suffering for them, is always prepared to make the highest sacrifice for their attainment, and also backs his efforts with all the physical force he is capable of. You may coin what other word you like to describe his methods but you cannot call it violence, because that would constitute an outrage on the dictionary meaning of that word. Satyagraha is insistence upon Truth. Why press, for the acceptance of Truth, by soul force alone? Why not add physical force also to it? While the revolutionaries stand for winning independence by all the forces, physical as well as moral, at their command, the advocates of soul- force would like to ban the use of physical force. The question really, therefore, is not whether you will have violence or non-violence, but whether you will have soul-force plus physical force or soul-force alone.

Our Ideal

The revolutionaries believe that the deliverance of their country will come through Revolution. The Revolution, they are constantly working and hoping for, will not only express itself in the form of an armed conflict between the foreign government and its supporters and the people, it will also usher in a New Social Order. The revolution will ring the death knell of Capitalism and class distinctions and privileges. It will bring joy and prosperity to the starving millions who are seething today under the terrible yoke of both foreign and Indian exploitation. It will bring the nation into its own. It

THE HINDUSTAN SOCIALIST REPUBLICAN ASSOCIATION

MANIFESTO

The Philosophy of the Bomb

Introductory

Recent events particularly the congress resolution on the attempt to blow up the Viceregal Special on the 23rd December 1929, and Gandhi's subsequent writings in 'Young India' , clearly show that the Indian National Congress, in conjunction with Gandhi, has launched a crusade against the revolutionaries. A great amount of public criticism, both from the press and the platform, has been made against them. It is a pity that they have all along been, either deliberately or due to sheer ignorance, misrepresented and misunderstood. The revolutionaries do not shun criticism and public scrutiny of their ideals, or actions. They rather welcome these as chances of making those understand, who have a genuine desire to do so, the basic principles of the revolutionary movement and the high and noble ideals that are a perennial source of inspiration and strength to it. It is hopes that this article will help the general public to know the revolutionaries as they are and will prevent it from taking them for what interested and ignorant persons would have it believe them to be.

Violence or non-violence

Let us first of all, take up the question of violence and non-violence. We think that the use of these terms, in itself, is a grave injustice to either party for they express the ideals of neither of them correctly. Violence is physical force applied for committing injustice, and that is certainly not what the revolutionaries stand for. On the other hand, what generally

MEMBERSHIP

All members shall be recruited by organizers in charge of different districts every province. Every member must be ready to devote his whole time for the association and to risk his life if necessary.

He must obey the commands of the district organizer implicitly.

He should develop his own initiative and remember that the success of the association depends much on the resourcefulness, the initiative and the sense of duty of its individual members.

He must behave in a manner that may not prejudice the cause for which his association stands or may not do any harm directly or indirectly to this organization.

No member of this association shall belong to any other organization without the consent of the district organizer.

No member shall leave his station without informing the district organizer about it.

Every member must try to avoid being suspected of revolutionary connections by the police or public.

Every member must remember that his individual behaviour and mistakes might lead to the ruin of the whole organization.

No member shall conceal anything from the district organizer as far as his public life is concerned.

Members who will betray shall be punished either with expulsion or death.

The authority of punishment shall rest entirely with the"P.C."

***

4. To publish booklets and pamphlets with a view to enlighten the public as to the course of events and the current of thoughts as prevalent in the countries outside India.

5. To utilise and influence the Congress and other public activities as far as possible.

Private:-

(a) To establish a secret press and through it to publish such literature which cannot easily be published openly.

(b) To circulate such literature.

(c) To estalish branches of this association in every part of he country, district by district.

(d) To collect funds in as many ways as possible.

(e) To send suitable men to foreign countries where they may get military or scientific training so that they may become military or scientific experts to take charge of armies and ammunition factories at the time of open rebellion.

(f) To import arms and ammunitions and also to manufacture them as far as possible, in the country.

(g) To remain in close touch and to co-operate with the Indian revolutionaries outside India.

(h) To get the members of the association enlisted into the present army.

(i) To enlist the sympathy of the public to our cause by occasional retaliatory measures and propaganda and thus create a band of sympathisers.

3. He must be able to grasp the spirit of the history of India, with special reference to the particular civilization which India has evolved.
4. He must have faith in the mission and the destiny of a free India, which is to bring harmony in the different spheres of human activities both spiritual and material.
5. He must be courageous and self-sacrificing without which all his brilliant qualities will have no real value.

Provincial Council and Central Council –

P.C. and C.C. members must see that every member of this association gets full scope and ample opportunity to develop and use his individual abilities, without which the association will tend to disintegrate.

PROGRAMME

All the activities of the association shall be divided into two parts:- public and private.

Public:-

1. To start association in the forms of clubs, libraries, seva samitis and the like.
2. To start labour and peasant organizations. Suitable men must be engaged on behalf of the association to organize and control the labourers in the different factories, the railways and in the coalfields, and instill into their minds that they are not for the revolution but that the revolution is for them.

   Similarly the Kisans must also be organized.
3. To start weekly paper in every province to propagate the idea of an independent Indian Republic.

or used without the knowledge and the permission of the district organizer or the officer in-charge of this department.

5. *Foreign connection*:- This department shall carry on its work under the direct orders from the C.C.

District Organiser – His duties –

This district organizer shall be in sole charge of the members of his district.

He shall try to start branches of this association in every part of his district. In order to have efficient recruitment he should keep himself in touch with the different public bodies and institutions in his district.

The district organizers shall be subordinate in every way to the provincial committee who shall supervise and direct all their activities.

The district organizers must see that the members are divided into separate groups and the different groups do not know each other.

So far as possible the district organizer of any province must not know the activities of each other and if possible they must also not know each other by person or by name.

No district organizer shall leave his station without previously informing his superior.

Qualifications of a District Organiser –

1. He must have the tact and the ability to guide and handle men of different temperaments.

2. He must have the capacity to grasp political, social and economical problems of the present day with special reference to his Motherland.

All decisions of the committee shall be arrived at by unanimous consent.

Departments:-

Every provincial organization shall have the following departments:-

1 Propaganda

2 Collection of men

3 Collection of Funds and Terrorism

4 Collection and Storage of arms and ammunitions

5 Foreign connection

1. Propaganda shall be carried on :-

    (a) by an open and a secret press,

    (b) through private conversations,

    (c) through public platforms,

    (d) through a system of organized Kathas, and

    (e) through magic lantern slides

2. Collection of men shall be done by organizers in charge of different districts.

3. Funds shall be collected generally by means of voluntary subscriptions and occasionally by contributions exacted by force. In extreme cases of repressions by agent or agents of a foreign government it shall be the duty of the association to retaliate in whatever form it shall consider suitable.

4. Every effort shall be made to arm every member of the association; but all such arms shall be stored at different centres and be used according to the directions of the provincial committee only.

No arms shall be removed from any place in the district

THE HINDUSTAN REPUBLICAN ASSOCIATION

The name of the association shall be the *Hindustan Republican Association.*

Object:-

The object of the association shall be to establish a Federated Republic of the United States of India by an organized and armed revolution.

The final form of the constitution of the Republic shall be framed and declared by the representatives of people at the time when they will be in a position to enforce their decisions.

The basic principle of the republic shall be universal suffrage and the abolition of all systems which make any kind of exploitation of man by man possible.

The governing body of the association shall be the Central Council composed of the representatives of every province of India. All decisions of the Central Council shall be arrived at by unanimous consent. The Central Council shall be vested with absolute powers.

The principal function of the Central Council shall be to supervise, adjust and co-ordinate the activities in the different provinces of which it shall have full knowledge.

The Central Council shall be in direct charge of the work to be carried on in countries outside India.

Provincial Organisation:-

There shall be a committee ordinarily of five (5) men representing the five (5) different departments of the association in every province which shall regulate all the activities of the association in the province.

ضمیمہ نمبر ا

آزاد ہند حکومت اور فوج
کی
تاریخ قیام اور تشریح مقاصد
نیز
جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں آزادیٔ ہند کی تنظیمات و تحریکات
پر ایک سرسری نظر

مطبوعہ
سہ روزہ "زمزم" لاہور
۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء

آزاد ہند حکومت کا حلفِ وفاداری :

۲۱ر اکتوبر ۴۳ء کو شونان یعنی سنگاپور میں آزاد ہند حکومت بناتے وقت شری سبھاش چند بوس نے حسب ذیل حلف اٹھایا تھا :

''میں سبھاش چندر بوس پرماتما، آزاد ہند اور ۳۸ کروڑ ہندوستانیوں کے نام پر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں اس حلف کو مرتے دم تک اپنے سامنے رکھوں گا۔ اور میں اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہمیشہ کوشش کروں گا۔ آزادی کے بعد بھی مادرِ وطن کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہوں گا۔

(دستخط سبھاش چندر بوس)

برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ :

اسی مہینے کے دو دن بعد ۲۳ر اکتوبر کو آزاد ہند گورنمنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا عارضی دارالخلافہ سنگاپور میں تھا اور جو بعد میں انڈیمان چلا گیا تھا۔ اس آزاد گورنمنٹ نے ۲۳ر اکتوبر ۴۳ء کو ہی برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ اس اعلان پر سبھاش بوس کے دستخط ہیں اور اس میں لکھا ہے :

''خدا کے نام پر پچھلی نسلوں کے نام پر جنھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو ایک قوم بنایا۔ اور ان شہیدوں کے نام پر جنھوں نے بہادری اور قربانی کی روایت ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑی ہے۔ ہم ہندوستانی لوگوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔ اور ہندوستان کی آزادی کے لیے حملہ کریں۔ ہم ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ

انگریزوں اور ہندوستان میں ان کے تمام ساتھیوں کے خلاف آخری جدوجہد شروع کردیں اور بہادری اور ثابت قدمی سے قطعی فتح پر پورے اعتقاد کے ساتھ یہ جدوجہد جاری رکھیں۔ جب تک دشمن کو ہندوستان کی سرزمین سے نہ نکال دیا جائے اور پھر ایک بار ہندوستان آزاد قوم نہ ہو جائے''۔

آزاد ہند فوج کے سپاہی کا عہد :

سبھاش بوس کی فوج کے سپاہیوں کے لیے ذیل کا حلف نامہ تھا جو وہ اٹھاتے تھے :

''میں رضاکارانہ طور پر اور اپنی آزاد مرضی سے آزاد ہند فوج میں بھرتی ہوتا ہوں۔ میں حلیفہ اور صدق دلی سے خود کو ہندوستان کے لیے وقف کرتا ہوں، اور عہد کرتا ہوں کہ میری زندگی ہندوستان کی آزادی کے لیے نچھاور ہے۔ میں اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر بھی اپنی پوری طاقت سے ہندوستان کی تحریک آزادی کے لیے کام کروں گا۔ اپنے دیش کی سیوا کرنے میں مئیں اپنے لیے کوئی ذاتی فائدہ نہیں چاہوں گا۔ میں تمام ہندوستانیوں کو بلا لحاظ مذہب، زبان یا علاقہ اپنی بہن بھائی سمجھوں گا''۔

راش بہاری بوس اور انڈیا انڈی پینڈنس لیگ :

''آزاد ہند فوج جاپانیوں کی کٹھ پتلی نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کی فوج تھی جس کا مقصد ہندوستان کی آزادی کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ دراصل آزاد ہند فوج ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا محض ایک جزو تھی۔ تحریک کو چلانے والی جماعت انڈیا انڈی پینڈنس لیگ تھی جو ابتدا میں جلاوطن شری راش بہاری بوس کی سرکردگی میں قائم ہوئی تھی مگر شری سبھاش چندر بوس کے ہاتھوں میں اس کی رہنمائی کی باگ ڈور آگئی۔ بوس بابو کی سرکردگی میں آزاد ہند کی عارضی حکومت بھی وجود میں آئی۔

مشرقی ایشیاء میں آباد ہندوستانیوں نے ہندوستان کی آزادی کا بیڑا اٹھایا۔ آزاد ہند لیگ، آزاد ہند فوج اور آزاد ہند حکومت اسی تحریک کی علمبردار تھیں۔ سبھاش بابو اس تحریک کے مسلمہ لیڈر تھے اور ان تینوں جماعتوں کے ہیڈ تھے۔ تین برس کی مختصر مدت میں ہندوستان کی آزادی کے علمبرداروں نے جو مصیبتیں جھیلیں اور قربانیاں کیں وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھیں گمراہ کہا جاسکتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ مگر آزادی کی تاریخ میں ان کے کارنامے زرّیں حروف میں لکھے جائیں گے۔ ذیل کے مضمون میں آزاد ہند فوج کے قیام کا پس منظر اور اس کی تنظیم کے مفصل حالات درج کیے جاتے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا میں آزادی ہند کی تحریکیں :

جاپان سے لڑائی چھڑنے سے بہت پہلے جاپان چین اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک کے ہندوستانیوں نے ہندوستانی باشندوں کی قومی انجمنیں قائم کی تھیں۔ جو ان ممالک میں ہندوستان کی آزادی کا پروپیگنڈہ کرتی تھیں جاپان میں راش بہاری بوس کے تحت میں "آزاد ہند لیگ" بہت سے کام کر رہی تھی۔ اور جاپان کے ہندوستانی باشندوں کو اس نے منظم کیا تھا۔ ایک وطن دوست ہندوستانی نے چین میں انڈین نیشنل ایسوسی ایشن اور جاپان میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔ سیام میں سوامی ستیانندپوری نے انڈین نیشنل آرگنائزیشن کی ایک شاخ قائم کی۔ اور یہ تمام انجمنیں ان ممالک میں ہندوستان کی آزادی کا پروپیگنڈا کرتی رہیں۔ اس لیے جس وقت جاپان سے لڑائی شروع ہوئی مشرق بعید کے ہر ملک میں ہندوستانیوں کی مضبوط قومی انجمنیں پہلے سے موجود تھیں۔

سنگاپور کا سقوط :

۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے حملہ کیا۔ ملایا پر دھاوا ہوا، اور جن ہندوستانی فوجوں نے جاپان کا مقابلہ کیا۔ وہ تعداد میں بہت کم تھیں۔ اور ان کو

سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ بڑی بہادری سے لڑیں، لیکن ان کی ہار یقینی تھی۔ اور بہت سے دستوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب سنگاپور کا سقوط ہوا تو ہندوستانی فوج کے تقریباً ۷۰۰۰ آدمیوں کو جنگی قیدی بنالیا گیا۔ یہی وہ جنگی قیدی تھے جو ملایا کی انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے ایک کپتان کی سرکردگی میں خود کو آزاد ہند فوج کی شکل میں منظم کرلیا۔

آزاد ہند لیگ کا قیام :

۱۰ ارجون ۴۲ء کو بنکاک میں ایک کانفرنس بنائی گئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں مختلف ہندوستانی نیشنلسٹ انجمنیں ایک دوسرے سے ملادی گئیں، اور آزاد ہند لیگ قائم کی گئی، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی پالیسی اور پروگرام بھی وہی ہونا چاہیے، جو وطن کی انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی اور پروگرام ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ہندوستان میں ایک آزاد اور متحدہ جمہوری حکومت غیر فرقہ وارانہ اصول پر قائم کی جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک انڈین نیشنل آرمی بنائی جائے۔

بنکاک کانفرنس نے آزاد ہند لیگ کا ایک آئین بھی بنایا اور لیگ کی مقامی شاخیں ملایا، برما، سیام، جاپان، سماٹرا، انڈیمان وغیرہ میں قائم کرنے کا اور راش بہاری بوس کی صدارت میں نمایندوں کی ایک کمیٹی اور ایک کونسل آف ایکشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

انڈین نیشنل آرمی :

اسی کونسل آف ایکشن نے انڈین نیشنل آرمی کو منظم کیا۔ اور اس کے لیے تمام طبقوں سے رنگروٹ بھرتی کیے گئے۔ ہندوستان کے ہزاروں شہری باشندے اور ہندوستانی جنگی قیدی اس میں شریک ہوئے۔ یہ فوج اچھی طرح منظم کی گئی اور اس کے لیے اچھا سامان مہیا کیا گیا۔ یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ یہ فوج ایک خالص ہندوستانی فوج تھی۔ اور اس کے تمام افسر بھی ہندوستانی تھے۔ یہ وہ چیز ہے جو برطانوی ہندوستانی فوج میں

کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس میں ایک زنانہ دستہ بھی تھا جن کی عورتیں ہندوستانی شہری آبادیوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ زنانہ دستہ کا نام "رانی جھانسی رجمنٹ" تھا۔ اس کی کمان ایک دلیر مدراسی مہیلا لکشمی بائی کے ہاتھوں میں تھی۔

سبھاش بوس کی حکومت :

مسٹر سبھاش چندر بوس جون ۱۹۴۳ء میں ٹوکیو پہنچے۔ ان کے آتے ہی تمام چیزوں کی نوعیت بدل گئی۔ ان کا پہلا کام یہ تھا کہ انھوں نے کونسل آف ایکشن کو آزاد ہند کی خاصی حکومت میں تبدیل کر دیا اور سبھاش بابو کے تحت میں ایک کیبنٹ بنائی گئی۔ اس گورنمنٹ نے ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۳ء کو برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کیا اور خیال کیا گیا ہے کہ جب جاپانیوں نے ۱۹۴۴ء کی ابتدا میں ریاست منی پور پر حملہ کیا تو انھوں نے بھی تین بریگیڈ پیش کیے۔

وعدہ خلافی :

پچھلے دنوں برما کی لڑائی میں انڈین نیشنل آرمی کے چند دستوں نے برطانوی فوجوں کے خلاف جنگ کی۔ رنگون سے جاپانی فوجوں کے ہٹنے کے بعد اور انگریزوں کے داخلہ سے پہلے انڈین نیشنل آرمی والوں نے رنگون کی حفاظت کی اور رنگون میں آزاد ہند فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے بچاؤ کا معقول انتظام نہیں تھا۔ ان سب باتوں سے ہندوستانی سپاہیوں کو اور ہندوستانی شہریوں کو نیز آبادی کے دوسرے غیر یورپین طبقوں میں بھی برطانیہ کے خلاف جذبہ زور پکڑ گیا۔ ہندوستانی سپاہیوں اور شہریوں کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ انگریزوں کا پلہ ہلکا ہے۔ اگر انھیں ہندوستان سے ہٹنا پڑا تو وطن کی حفاظت کا سوال بھی سامنے آئے گا۔ وطن دوست ہندوستانی سپاہی اور شہری ہندوستان کے بچاؤ کے لیے جاپانیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جاپانیوں کو ہندوستان کی آزادی کے دشمن سمجھتے تھے۔

اب رہا یہ سوال کہ اپنے ملک کو بدیشی غلبہ سے آزاد کرانے کے لیے کسی دوسرے ملک سے فوجی نوعیت کی امداد لینا کہاں تک جائز ہے اس سلسلہ میں ان کے سامنے امریکہ کی مثال تھی جس نے انگلینڈ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے فرانس سے مدد لی تھی۔

جاپان سے کشیدہ تعلقات :

وطن دوست جاپان سے بد ظن تھے۔ مگر صورت کچھ ایسی تھی کہ وہ جاپان سے دشمنی مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے برخلاف وہ جاپان سے ہمدردی کا رشتہ قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ آزاد ہند تحریک کے بارے میں جاپانی حکومت کا رویہ کچھ صاف نہ تھا۔ چنانچہ ابتدائی مرحلہ پر ہی کونسل آف ایکشن اور ٹوکیو کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ جاپانی آزاد ہند فوج کی ترقی اور توسیع کے خلاف تھے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ کونسل آف ایکشن نے (اس کی جگہ بعد میں آزاد ہند فوج بن گئی) اعلان کر دیا کہ جب تک جاپانی حکومت اپنا رویہ واضح نہ کرے، آزاد ہند فوج برما نہیں بھیجی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے کونسل آف ایکشن کے ایک ممبر کو گرفتار کر لیا تھا۔

اعلان جنگ :

۲۱/اکتوبر ۴۳ء کو آزاد ہند حکومت قائم ہوئی، جس کے ہیڈ سبھاش بابو تھے۔ ان تمام ملکوں نے جو برطانیہ کے خلاف لڑ رہے تھے حکومت تسلیم کر لی۔ ۲۳/اکتوبر ۴۳ء کو آزاد ہند حکومت نے برطانیہ اور امریکہ سے لڑائی کا اعلان کر دیا۔ ۷/جنوری ۴۴ء کو آزاد ہند فوج نے سرگرمی شروع کر دی۔ ۱۸/مارچ ۴۴ء کو وہ برما سے ملی ہوئی ہندوستانی سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل ہو گئی۔ امپھال کے محاصرہ میں بھی آزاد ہند فوج نے حصہ لیا۔ آزاد ہند فوج کے نعرے تھے۔ "انقلاب زندہ باد"، "آزاد ہند زندہ باد"، "چلو دہلی" وغیرہ۔ اپنے مقصد میں ناکامیاب ہونے کے بعد ۴۵ء کے

شروع میں آزاد ہند فوج نے حفاظتی سرگرمی شروع کی۔ ۲۴/اپریل ۴۵ء کو بوس بابو مع اپنی حکومت کے رنگون سے بنکاک چلے گئے۔ جاپانی اس سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ مگر برما میں ہندوستانیوں کی جان مال کی حفاظت کے لیے آزاد ہند فوج کے چھ ہزار کے قریب سپاہی اور افسر رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ آزاد ہند حکومت نے برما میں اپنی تمام مالی ذمہ داریاں چکا دیں اور آزاد ہند فوج والوں نے رنگون میں جان و مال کی مؤثر طریق پر حفاظت کی۔ جب انگریزوں نے ۱۹۴۲ء کے شروع میں رنگون خالی کیا تھا تو وہاں بد نظمی اور غارت گری کا بازار گرم تھا مگر جاپانیوں کے جانے کے بعد آزاد ہند فوج نے یہ نوبت نہ آنے دی۔

ناکامیابی کے بعد :

۲۸/ مئی ۴۵ء کو آزاد ہند لیگ ختم ہو گئی۔ آزاد ہند حکومت کی طرف سے برما میں جو بنک کھولا گیا تھا، انگریزی حکومت نے اس پر قبضہ کر لیا اور آزاد ہند تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ آزاد ہند کے آرمیوں کو پہلے یہ کہہ کر نہتا کیا گیا کہ ان پر کوئی آنچ نہ آئے گی مگر بعد میں انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں آزاد ہند فوج کے سپاہی اور افسر ہیں یہ معلوم نہیں۔ سیام اور دوسرے علاقوں میں آزاد ہند فوج کے جو سپاہی تھے ان کا کیا حشر ہوا۔ خود سبھاش بوس کے متعلق خبر ہے کہ وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۲

یادگار اشفاق

مرتب

بنارسی داس چترویدی

فہیم فیروز آبادی

پروانۂ وطن ـــ اشفاق	ظہیر الحسن ظہیر صمدنی فرخ آبادی
زندۂ جاوید اشفاق	اجمل حسین اجمل فیروز آبادی
آہ! اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی	ڈاکٹر دیوان چند کھورانہ
تختۂ دار پر	قاضی یعقوب علی خاں
شہید وطن اشفاق	فہیم فیروز آبادی
مجاہد حریت	مختار احمد مختار فیروز آبادی

تخلیقات :

اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی کا مختصر و متفرق کلام

حصّہ دوم

خودنوشت

باب اوّل

خاندان

میں شاہجہاں پور میں پٹھانوں کے اس خاندان میں پیدا ہوا تھا جو "قدن خیل" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میری نانہال "حافظ خلیل خیل" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں خاندان اپنی شرافت اور کھرے پن میں مشہور ہیں۔ ان دونوں میں باہم شادی بیاہ ہوا کرتا ہے۔ میری دادھیال یعنی "قدن خیل" گورنمنٹ کی نظر میں اب باوقعت نہیں ہے، خواہ پہلے کبھی رہی ہو۔ مگر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ان کا کوئی رسوخ نہیں رہا۔

میں نے سنٹرل جیل لکھنؤ میں ایک کتاب جو اتفاقاً مل گئی تھی، پڑھی۔ اس کا شروع تھا، نہ آخر کہ میں اس کا نام لکھتا۔ مگر ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ میری نانہال اور دادھیال کے کیا کیا کارنامے ہیں۔ اب میں پہلے دادھیال کا ذکر کروں گا۔

دادھیال :

ابتدا میں جب میرا خاندان شاہ جہاں پور میں آباد ہوا تو یہاں کی اصلی بستی گوجروں سے آباد تھی جو مسلمانوں کے تحت و تصرف میں آئی۔ تمام قرب و جوار کے مواضعات پر افغانان کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح ہمارے خاندان کے لوگوں کو بھی مواضعات مل گئے اور وہ یہاں چین سے رہنے سہنے لگے۔ لیکن انھوں نے نہ تو ترقی ہی کی کوشش کی اور نہ نام و نمود کی خواہش کی۔ بے فکر اور آرام طلب بنے رہے۔ غرضے کہ آج یہ حال ہے کہ ایک بھی گریجویٹ نہ پیدا کر سکے۔ انھوں نے نہ تو مالی حالت سدھاری اور نہ علم میں ترقی کی۔ علم سے ان کو نفرت اور ہاتھ پیر ہلانے سے ان کو دشمنی تھی جب کہ انگریزی پڑھنے کو وہ بہت بڑا کفر سمجھتے تھے۔

خدا خدا کر کے چند ایسے افراد پیدا ہوئے (خدا ان کو جنت میں جگہ دے) جنھوں نے

اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا۔ مگر ابھی وہ بڑے جراثیم خاندان کے چند افراد میں موجود تھے جو بچوں کو انگریزی سے محروم رکھنے کو جنت کی کنجی سمجھتے تھے۔ وہ ان کے پیچھے اس بری طرح پڑے کہ خدا کی پناہ۔ غرضے کہ کثرت کی فتح اور قلت کو شکست ہوئی۔ یہ غریب بھی ان کا نشانہ بن گئے اور انٹرنس بھی پاس نہ کر سکے۔

چنانچہ اسی دور سے مجھے بھی گزرنا پڑا۔ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے جب میں اپنی تعلیم کی طرف غور کرتا ہوں۔ اس میں مَیں ہی خطاوار ہوں۔ میرے سرپرست بالکل نہیں کیوں کہ وہ غریب طریقۂ تعلیم سے قطعی ناآشنا تھے۔ جب میں بڑا اور ہٹا کٹا پہلوان ہو گیا، اس وقت انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ اردو، فارسی پڑھادی گئی تھی جس کی بدولت آج میں اردو ہی میں اپنی مختصر روداد زندگی لکھ رہا ہوں۔

اگر سچ پوچھیے تو وہی پرانا رویہ تعلیم کا ہمارے ہاں چلا آرہا تھا۔ مولوی صاحب بیس[۲۰] تیس[۳۰] لڑکوں کو لیے اردو، فارسی کی تعلیم دے رہے ہیں اور ڈنڈا برسا رہے ہیں۔ مگر اب یہ طریقہ بھی زمانے کے ساتھ بدلتا جارہا ہے اور اب مولوی صاحب بیچارے عنقا ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ مدرس صاحب یا ماسٹر صاحب لیتے جارہے ہیں۔ لوگوں کو انگریزی تعلیم کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ "اندھوں میں کانا راجہ"۔ خاندان بھر کے تار وغیرہ مجھ سے پڑھوائے جاتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی نسل بھی اپنے اسی قدیم رویے پر چل رہی ہے جس کا مجھے غم ہے۔ مگر ہاں اس کے بعد کی نسل امید افزا حالت میں پرورش پارہی ہے جو امیدوں کا ماوا و ملجا ہے۔ پرانے لوگ جس طرح اپنی مالی حالت اور خاندانی امتیازات دریابُرد کر چکے ہیں، اسی طرح اپنی طاقت و قوت اور جوش و خروش کو بھی الوداع کہہ چکے ہیں۔ ان لوگوں کا محض تقدیر پر شاکر رہنا اور گزشتہ افسانے دہرانا ہی بس ایک کام رہ گیا ہے۔

مجھے پھر اسی کتاب کا حوالہ دینا پڑتا ہے کہ جس طرح غدر سے پہلے اور بعد کو میرے خاندان میں اجنۃ (۱) کے بارے میں قصہ گوئی ہوا کرتی تھی، ویسی ہی میرے زمانے تک تھی اور اب بھی ویسی ہی ہے۔ یہ لوگ قسمت پر اتنا بھروسا کیے ہوئے ہیں کہ دنیاوی امور میں کوشش کرنا بھی گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ اس کا مجھے اتنا دکھ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

میں قوی امید رکھتا ہوں کہ جب موجودہ نسل اور آنے والی نسل اپنے آپ کو فخر

خاندان بنائے گی اور ترقی کی اعلیٰ معراج پر پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ اگر میں زندہ رہوں گا تو مجھے، ورنے میری روح کو خوشی ہو گی۔

مگر ہاں، جہاں سب برائیاں ان میں ہیں، وہاں ان کی اسپرٹ قابلِ تعریف ہے۔ گو کہ بعض گھروں میں پست ہمتی اور اپنے آپ کو ناکارہ سمجھنا ان کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ میری رگوں میں وہ خون تھا جو آج مجھے پھانسی کی کوٹھری میں بند کرائے ہوئے ہے اور میں اس پر خوش ہوں۔ بعض اوقات مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں ایسے خاندان سے تعلق رکھنے والا کیسے نکلا؟

یہ تو میرے باپ کے خاندان کے حالات ہیں جن پر مجھ کو کہنا پڑتا ہے کہ خدایا ان کو دیدۂ بینا دے اور اولادوں کو جب تک ان کے بزرگ عیش و عشرت اور سُستی و کاہلی کے دیوتا کو پوجتے رہیں، نافرمان بنائے رکھے تاکہ وہ کچھ اپنا اور کچھ وطن اور کچھ قوم کا بھلا کر سکیں۔

نانہال :

میری نانہال یعنی میری ماں کے خاندان کے حالات اچھے ہیں۔ غدر کے قبل سے اس وقت تک سرکاری عہدوں پر چلے آتے ہیں اور غدر کے بعد سے تو سرکار کی ناک کا بال ہو گئے ہیں۔ میری ماں کے دادا اور ان کے بھائی سب جج اور کلکٹر تھے۔ جب غدر شروع ہوا تو انھوں نے ملک کا ساتھ نہیں دیا اور نہ نواب صاحب کا ساتھ دیا بلکہ جاسوسی کا کام کیا اور جیسا کہ مجھے کتاب سے معلوم ہوا اور جو کچھ بھی میں نے سنا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے اب شرم نہیں آتی۔ ہاں اس کیس سے قبل اگر مجھے ضرورت محسوس ہوتی تو ہرگز بھی نہ لکھتا۔ کیوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس کو باعثِ صد ننگ سمجھتا ہوں کہ جب ملک کے لوگوں کو احساسِ آزادی پیدا ہو اور وہ اپنا خون مثل پانی کے بہائیں، اپنے بچوں کی قربانی، قربان گاہ وطن پر چڑھائیں، اپنی دولت، آبرو، مکان، غرضے کہ ہر شے خوشی کے ساتھ آزادی اور محض آزادئ مذہب کے لیے نثار کر دیں۔ ان کے ساتھ فریب کرنا، ان کے خلاف سازش کرنا، انکی اسکیموں کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرنا اور وطن دشمنوں کی امداد کرنا اگر شرم اور ہزار شرم کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟

مجھے بہ زمانہ طالب علمی اپنے چند دوستوں سے ہمیشہ ذلت اٹھانی پڑی۔ جب وہ کہتے

تھے کہ تم خائنین وطن کی اولاد ہو۔ میں اپنے ان احباب کا نام نہیں لکھنا چاہتا کیوں کہ اب انھیں شرم آئے گی۔ اس لیے کہ وہ اس وقت اپنے گلے میں غلامی کا پٹا ڈالے ہوئے ہیں یا سرکاری کچہریوں میں کنجرانیوں کی طرح بار روم میں دوکان لگائے بیٹھے ہیں۔ اس وقت ان کو فخر تھا کہ ان کے آباواجداد اس گروہ کے بڑے کارکن تھے جس نے آزادی کا علم بلند کیا تھا۔ خیر میں نے اپنی قربانی سے ان دھبّوں کو، جو ۱۸۵۷ء میں میرے ننھیال کے بزرگوں نے عصمتِ وطن پر لگائے تھے، اپنے نوجوان معصوم خون سے دھو ڈالا۔ کیا اس خاندان کے قومی گناہ کا میری اس قربانی کو کفارہ سمجھا جاسکتا ہے؛ خواہ یہ ہو خواہ نہ ہو۔ میری آنے والی نسل پر یہ اعتراض نہ ہوگا کہ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو خائن تھا۔ بلکہ میری قربانی پر لوگ رحم فرمائیں گے اور ان کو اشفاق کے خاندان کا ایک ممبر خیال کرکے بزرگوں کی غلطیاں پھر از سرنو یاد نہ کریں گے۔ مجھے ننھیال کے خاندان کے بارے میں بس اتنا ہی لکھنا ہے۔

اب مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ خاندان ترقی کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا کیوں کہ آج کل کے نوجوان ترقی کرنے کی بجائے اپنے بزرگوں ہی پر ناز کرنے کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، اور یہی سمِ قاتل ہے کہ بزرگوں کی تعریف میں لگے رہیں یا ان پر فخر کرتے رہیں۔ انسان کو بذاتِ خود امتیازی حیثیت حاصل کرنی چاہیے۔ بزرگوں پر فخر و مباہات کی ضرورت نہیں۔

یوں میں دادا کی طرف سے قوم پرست اور ننھیال کی طرف سے انگریز پرست ہوں۔ لیکن میرے قلب میں وطنی آزادی اور قوم پرستی ہی کا جذبہ طاقتور رہا، اور میں اپنے وطن، پیارے وطن کی آزادی کے لیے آج موت کے تختہ پر کھڑا ہوں۔

حاشیہ :

(۱) اجنہ یا جنات ــ جن کی جمع۔ مسلمانوں کا قرآنی عقیدہ ہے کہ جنات خدا کی ایک مخلوق ہیں ان کی تخلیق آگ یا نار سے ہوئی ہے وہ ہمیں نظر نہیں آتی۔

دنیا کی بہت سی چیزیں، حقیقت میں ایسی ہیں جنھیں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ اور ہاتھوں سے چھو نہیں سکتے۔ لیکن عقل انھیں تسلیم کرتی ہے۔ ہم ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔

باب دوم

تعلیم و تربیت

میری ماں خاندان حافظ خلیل خیل کی ایک ممبر تھیں۔ ان کے والد کورٹ انسپکٹر پولیس تھے۔ اور ان کے دادا سب جج تھے جو ایامِ غدر میں آزادی کے پجاریوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میری ماں کی تعلیمی حالت اچھی خاصی تھی۔ وہ نہایت عاقل وزیرک ہیں۔ انھوں نے ہم لوگوں کو اچھی تربیت بہم پہنچائی۔ آج ہم جوان ہونے پر بھی چاروں بھائی ان سے اتنا ڈرتے ہیں کہ ان کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے۔

میرے والد صاحب انسپکٹر پولیس تھے مگر خدا کے فضل سے میرے پیدا ہونے سے قبل ہی مستعفی ہوچکے تھے۔ اور گو کہ وہ میری کم عمری ہی میں اس دنیا سے گزر گئے (خدا انھیں غریق رحمت کرے اور ان کے کارناموں کو، جو ایامِ ملازمت میں کیے تھے، فراموش اور نظرانداز کردے جن کے وہ ہمیشہ معافی خواہ رہے) مجھے پولیس کے کارنامے بطور قصہ سنایا کرتے تھے جو اکثر مجھے ابھی تک یاد ہیں، اور پھر ان کا سامنا بھی کیا، اور وہ سبق جو محض سماعت پر موقوف تھا، عملی صورت میں ملنے لگا۔ قبلہ والد صاحب بھی والدہ کی مرضی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

ہم چار بھائی اور ایک بہن ان کی اولاد میں ہیں۔ میں اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اور آخری اولاد ہوں۔ میرے سوا سب بھائی بہن شادی شدہ ہیں۔ والد صاحب نے ایامِ ملازمت میں بہت روپیہ کمایا اور بڑے نیز منجھلے بھائی کی تعلیم و تربیت پر بہت کچھ خرچ کیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بس وہ شہروں کے صرف نام انگریزی میں لکھ لیتے ہیں اور پڑھ بھی لیتے ہیں اور وہ ویسے ہی ہیں جیسے خاندانِ قدن خیل کے اور لوگ۔ میرے منجھلے بھائی اردو مڈل پاس ہیں اور انگریزی انھوں نے ساتویں درجہ پاس کرکے چھوڑ دی۔ ان پر ہمارے خاندانی بزرگوں کی کرم فرمائی زیادہ رہی۔ ان کی حالت واقعی ایسی تھی کہ وہ کسی قابل ہوجاتے۔ مگر بھلا ہو انگریزی

زبان کے ان دشمنوں کا جو انگریزی کتاب کو ہاتھ لگانا، ہاتھ نجس ہو جانا سمجھتے تھے۔

ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ ہمارے ایک عزیز اپنی انگریزی کتاب اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے یہاں اتفاقاً بھول آئے۔ جب انھوں نے وہ کتاب وہاں رکھی ہوئی دیکھی تو انھوں نے ایک ملازم سے وہ کتاب چمٹے سے پکڑوا کر ایک طرف علیٰحدہ رکھوادی۔ اگر وہ سائنس سے واقف ہوتے تو یہ جان کر کہ وہ دھات (Conductor) ہے، ہرگز چمٹے سے نہ پکڑواتے بلکہ اسے لکڑی سے علیٰحدہ کراتے۔

جب میں بچہ تھا، ایک مولوی صاحب قبلہ (خدا انھیں غریق رحمت کرے) میرے بھائیوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا۔ میں ذہین تھا اس لیے رسم بسم اللہ کی باقاعدہ تقریب سے پیشتر ہی میں نے تین ابتدائی کتابیں پڑھ لیں اور پھر اس طرح رسمِ بسم اللہ منائے جانے کی نوبت ہی پیش نہ آئی۔ مولوی صاحب نے پُرانے طریقے پر تعلیم شروع کی تھی اور رفتہ رفتہ اردو کتابوں کے ساتھ ساتھ مجھے فارسی کی ''اخلاقِ محسنی'' اور ''انوارِ سہیلی'' پڑھادیں۔

میرے گھر میں والدہ کی اردو کتابوں کا ذخیرہ بہت زیادہ تھا۔ مولوی صاحب، لاہور کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ فاضل اوقات میں مَیں نے قصے کہانیوں کی بہت سی کتابیں جیسے ''شاہنامہ''، ''طلسم ہوش رُبا'' وغیرہ پڑھ ڈالیں۔ البتہ جنگ کے حالات پڑھنے سے مجھے بہت دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی جب عملی شکل اختیار کرلیتی تھی تو مولوی صاحب مجھے کان پکڑوا کر اٹھایا بٹھایا کرتے تھے۔ یہ تھی تو سزا، مگر کسرت کا کام دیتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں خاندانی بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو زمین جھنکادیتا تھا۔ محلے میں بھی جنگ آزمائی ہوتی رہتی تھی کیوں کہ میں ایک جنگجو لڑکا تھا۔ مار پیٹ کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔ جب یہاں نوبت پہنچتی تو میرے لیے یہ سزا تجویز کی جاتی کہ فرصت نہ ہی دی جائے جو شرارت کرے۔ چنانچہ مولوی صاحب کے ساتھ دوپہر کو جانا اور پھر شام کو مغرب کے وقت تک ساتھ رہنا۔ جب مغرب کی نماز پڑھ کر مولوی صاحب گھر جائیں اس وقت مجھے چھٹی ملے۔ جیسا کہ آج کا عالم ہے کہ پھانسی کی کوٹھری ہے اور ہم اس میں بند ہیں۔ باہر خواہ کیسا ہی تماشا ہو، ہم نہ باہر نکل سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال اس وقت تھا کہ باہر لڑکوں کے کھیلنے کی آوازیں سنا کرتے اور دل مسوس کر رہ جاتے۔

سبق پڑھاتے وقت مولوی صاحب مجھ سے خوش رہتے تھے مگر شرارت کے وقت اور زیادہ خوش کہ سیکڑوں بیٹھکیں لگواتے تھے۔ گویا مولوی صاحب مجھے پہلوان بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ ہمارے مولوی صاحب کا طریقۂ تعلیم نرالا تھا۔ ان کی لیاقت ذاتی میں کوئی شک نہیں۔ علم ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے مگر ہم ایسے بد قسمت کہ ریاضی میں ہمیشہ کمزور رہے۔ وہ سبق کم دیتے تھے، انگریزی تعلیم کا خاکہ زیادہ اڑاتے تھے اور انگریزوں کی دوستی کو جہنم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انگریزی پوشاک سے سخت نفرت تھی اور ایسے ایسے قصے بنا بنا کر سنایا کرتے تھے کہ جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ کوٹ پینٹ پہنتے ہوئے آج بھی جھجکتے ہیں۔ گو کہ اب اس وقت کے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنستے ہیں۔ مگر اب پتا چلتا ہے کہ جب پیارے مہاتما گاندھی جی نے بھی وہی تعلیم دی کہ دیسی وضع رکھو اور دیسی کپڑا پہنو، پیارے مولوی صاحب کی باتیں یاد آئیں۔ انٹی برٹش اسپرٹ ان میں انتہا سے زیادہ تھی۔ چنانچہ اس وقت کے گروپ میں ہم صرف دو موجود ہیں، جو امیدوں کے موافق نکلے۔ گو کہ ایک بہت زیادہ آگے نکل گیا۔ وہ اگر آج زندہ ہوتے تو خوش ہوتے۔ میں ان کی مرضی کے مطابق ان کو ملتا۔ کیوں کہ بدیسی خیالات مجھ میں کچھ نہیں۔ اور انگریزوں کے خلاف اسپرٹ بھی ہے۔ مگر سید حبیب احمد انٹی برٹش تو ہیں مگر کوٹ پتلون کے دلدادہ بھی ہیں اور یہ ان کی پرانی عادت ہو چکی ہے اور وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ خیر! ان کو ان کے مقاصد میں خدا کامیاب کرے۔ ایک اور بھی ان کے شاگرد تھے۔ مسٹر ایوب احمد صبر، جنھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور اسی طرح ہم تینوں ان کی روح کو خوش کرتے رہتے ہیں۔ غرضے کہ نہ اب وہ مولوی صاحب ہیں اور نہ وہ زمانہ۔ پھانسی کی کوٹھری ہے اور ہم ہیں۔

جب میں جوان ہوا تو بد قسمتی سے ۱۴ برس کا خاصا جوان معلوم ہوتا تھا اور پھانسی بھی مجھے موٹا تازہ ہونے کے باعث دی جائے گی اور یہ بات پراسیکیوٹرس کی بحث میں آئی ہے۔

خیر، انگریزی زبان پڑھ کر، جب کہ ریاضی بالکل صفر تھی، اسکول میں جا داخل ہوا۔ اب جیسے ہی انگریزی شروع کی تو خاندانی لوگوں میں عجیب قسم کے جراثیم موجود تھے۔ اور کم عمر لڑکوں میں کیوں کہ عقل کی کمی ہوتی ہے، ان سے جو بھی پیار، محبت سے بولا، اسی کے دوست ہو گئے۔ میرا بھی یہی حال ہوا کہ جب کبھی ماسٹر صاحب نے ڈانٹا تو میں بھی اینٹھ گیا۔

جس کا نتیجہ آپس کا خلفشار اور میری بد بختی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ میں خود بھی ایسا تھا کہ بزرگوں پر ناز کرتا اور اپنی قسمت پر شاد رہتا تھا۔ گنڈے تعویذ کی مدد سے پاس ہونے کی امید رکھتا، وقت کو لہو ولعب اور قصہ کہانی سننے میں صرف کرنا، میرا کام ہو گیا۔

پھر ایک زمانہ جلد وہ آگیا کہ ترکوں اور عیسائیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا، لوگوں کو پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آگیا(۱)۔ ادھر میری بھی دبی ہوئی آگ دہکنے لگی اور تعلیم کی طرف سے لاپروائی۔ کیوں کہ انگریزی ہمارے دشمنوں کی زبان تھی، اخبار بینی اپنا شعار ہو گیا۔ کتابیں لے کر اسکول تو چلے جاتے تھے مگر بے توجہی کے ساتھ جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن تربیت والدہ کے ہاتھ میں تھی جو کامیابی کے ساتھ جاری رہی۔ تعلیم میرے ذوق وشوق پر منحصر تھی، وہ چوپٹ ہو گئی۔ چوں کہ میں بچپن سے شریر اور غضب ناک تھا، لڑکے تو پھر لڑکے تھے، ماسٹروں سے بھی نہ دبتا تھا۔ ہمارے ماسٹر پرتھی سنگھ آنجہانی کہا کرتے تھے کہ خان صاحب، اپریل کا بھی کچھ خیال ہے:(اس مہینے میں امتحان ہوتے تھے) وہ بیچارے ہمیشہ میرا خیال رکھتے تھے، اور میں تھا کہ — پروانہ باشد!

اب میں جب کبھی یہ خیال کرتا ہوں تو میرا دل دکھ میں ڈوب جاتا ہے کہ میں کسی سے کچھ کم نہ تھا لیکن افسوس کہ تعلیم میں پیچھے رہ گیا۔ میں جب چھٹے درجے میں تھا تو جومیٹری کو صرف چھ گھنٹے میں پورا یاد کر کے صبح کو چھ میں سے پانچ سوال حل کیے تھے جب کہ ایک دن قبل جومیٹری کی ایک لائن بھی یاد نہ تھی۔ آج میں یہ تمام حالات آنے والے بچوں کے لیے چھوڑے جاتا ہوں کہ کن کن واقعات کا مجھے سامنا کرنا پڑا اور تکمیل تعلیم میں کون کون سی باتیں حارج ہوئیں۔ اس پر وہ غور کریں اور ان سے گریز کریں، میرا غم کرنا اب فضول ہے۔

مجھے جب اپنے بچپن کی یاد آتی ہے اور اس زمانے کے واقعات جب ذہن میں آتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے۔ کیوں کہ بچپن ہی سے میں مارشل اسپرٹ لیے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ مجھے اگر میلے سے کسی چیز کے لانے کا شوق ہوتا تھا تو وہ ٹین کی تلوار ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میاں! مجھے آپ ایک تلوار لادیں! انھوں نے جواب دیا کہ بیٹا، تم سے کوئی چھین لے گا۔ اس پر میں نے کہا کہ آپ چاندی کی تلوار نہ لائیں، لوہے کی تلوار لادیں، اسے کوئی نہ چھینے گا۔ اس بات پر میری والدہ اور والد بے تحاشا ہنسنے لگے اور کہا، اچھا! وہ جب تک زندہ رہے، میرا یہ تقاضا ان سے ہوتا رہا۔ اس زمانے میں تلوار پر لائسنس تھا۔ مجھے اپنی زندگی کا یہ

واقعہ ہمیشہ یادر ہے گااور اس سوال وجواب سے لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کتنا بڑا تھا!

چنانچہ یہی اسپرٹ میں اپنے بھتیجے، بھتیجی میں بھی پاتا ہوں کہ وہ میلے سے بجائے گیند وغیرہ کے طمنچہ اور چاقو خریدتے ہیں۔ خدا ان میں یہ اسپرٹ قائم رکھے اور انھیں اعلیٰ تعلیم سے ہم کنار کرے۔ یہ بچپن کے حالات میری ماں اور بھائیوں سے معلوم ہو سکتے ہیں اور وہ اس میں کچھ اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ میں جیسا لڑاکو تھا ویسا ہی فیاض بھی تھا کہ اپنی ماں کا دودھ دوسرے بچوں کو بھی پلوا دیتا تھا۔ یہ بات میری ماں بھی بتادیں گی۔

میں اسکول جاتا تھا، وہاں میرے دوست تھے اور میں بھی دوسروں کا دوست تھا۔ مگر یہ اسکول انگریزی تھا۔ وہاں میری مارشل اسپرٹ کا نتیجہ مسٹر منوہر لال جوتشی تھے۔ خدا نے دو ایک واقعات سے صاف بچایا۔ پھر میں بھی پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ مگر اس زمانہ طالب علمی کا مجھے سب سے زیادہ شکوہ آج اس پھانسی کی کوٹھری میں بند ہونے پر ایک اور صرف ایک دوست سے ہے، جس سے میں دل وجان سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ جس کے لیے میں دنیا ومافیہا سے بھی قطعی بے خبر تھا، جو کہ میرا دین وایمان تھا بلکہ سب کچھ تھا۔ بھائی کی طرح پیار، دوستوں کے دائرے میں سب سے افضل، مگر اس نے ہمیشہ مجھے دکھ پر دکھ اور تکلیف پر تکلیف دی۔ میں ان کا نام نہ لکھوں گا۔ جاننے والے جانتے ہوں گے، پڑھنے والے سمجھ جائیں گے اور وہ خود جان جائیں گے، خود سمجھ جائیں گے۔

میں یہ قصہ نظر انداز کر جاتا مگر مجھے اس ضمن میں آگے لکھنا ہے۔ اس لیے اتنا لکھنا ضروری سمجھا۔ خدا ان کا بھلا کرے، انھیں پروان چڑھائے، بال بچوں میں خوش رکھے۔ مجھے جو بھی مایوسیاں اٹھانی پڑیں اور میری تعلیم میں نقصان پہنچانے کا باعث ہوئیں، وہ میرے ان کرم فرما کی کرم فرمائیاں تھیں اور مجھے ان تمام باتوں نے کسی قابل نہ رکھا۔ گو کہ وہ خود بھی میری ہی طرح رہے، مگر پھر بھی وہ مزے میں ہیں کیوں کہ وہ صرف اپنی خدمت کرنا جانتے ہیں اور میں دوسروں کے لیے کچھ کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ریولیوشنری ان تمام باتوں ہی نے بنایا۔ اور میں نے جہاں تک تجربہ کیا، میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسے ہی واقعات اور حادثات انسان کو موت سے بے خوف بنادیتے ہیں، جس کے دل میں محبت کا مادہ ہوگا، وہی دیش کے لیے اور وطنی بھائیوں کے لیے بھی سب کچھ کر گزرے گا۔ تصوف میں عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے۔ میں نے تو ایسا ہی پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت

کا یہ وہی مادہ ہے جو وطن کی خدمت اور اس کے لیے قربانی کی طرف رجوع ہو گیا اور اب میں خدمتِ وطن کی راہ میں موت کا انتظار کر رہا ہوں (۲)۔

میں فخریہ کہوں گا کہ میں اور وہ دوست مثل بھائی کے تھے۔ میں اس سے حقیقی بھائی جیسا پیار کرتا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے سوتیلے بھائی کی طرح پیش آتا تھا (اگر اس سلسلہ میں کسی کو کچھ لکھنا ہو، تو عنایت اللہ، ارشاد حسین اور مسرور حسین امداد کر سکتے ہیں اور اگر ضرورت نہ ہو تو نہ لکھا جائے)۔

مجھے بچوں کو نصیحت مقصود ہے کہ ان کو کس دور میں زندگی گزارنا ہے اور کن کن مصائب کا مقابلہ کرنا ہے۔ طالب علمی کی زندگی نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ اس میں احتیاط کرنا ضروری اور لابدی ہے۔

حواشی :

(۱) جنگ بلقان ۱۳-۱۹۱۲ء کی طرف اشارہ ہے جس کے چھڑنے سے پورے ہندوستان میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ ترکوں کی امداد کی زبردست تحریک اٹھی۔ دارالعلوم دیوبند بند کر دیا گیا۔ اساتذہ اور طلبہ میدان میں نکل آئے۔ علی گڑھ کالج تک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سربراہی میں ہندوستان میڈیکل مشن بھیجا گیا۔ عوام نے چندے دیے، شعراء نے نظمیں لکھیں، اہل قلم نے مضامین لکھے، صحافیوں نے تازہ بہ تازہ خبریں چھاپیں۔ شبلی و ظفر علی کی نظموں نے عوام کے دلو میں جوش اور ایثار کی سرگرمی پیدا کی اور الہلال، زمیندار، کامریڈ، ہمدرد نے ہندوستان میں آگ لگا دی۔

ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ انھیں مسئلے کے اسلامی پہلو اور خلافت کے عقیدے سے تعلق نہ تھا۔ لیکن ایک قوم کے آئینی اور تاریخی اقتدار، اس کے ملکی حدود میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مداخلت، اس کی سرحدوں کے لیے خطرہ، اس کی رعایا کو بھڑ کانے، سازشوں کا جال بچھانے، ملک کے امن و امان کو تہہ و بالا کرنے اس کے ملک محروسہ کو بغاوت پر اُکسانے اور انھیں اسلحہ مہیا کرنے کے غیر آئینی، غیر انسانی اور غیر اخلاقی مسائل تو تھے اور کوئی آئین پسند انسان نواز منصف سرشت مدبر وقت کے ایسے عالمی مسائل اور کسی استعمار پسندی سے کیسے آنکھیں بند کر لے سکتا تھا؟

(۲) مجھے شاہ جہاں پور ہی میں خاندان کے بزرگوں کی باتوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ایوب احمد صبر شاہ جہاں پوری، ان کے دوست تھے۔ اس زمانے میں دہلی میں کوئی ملازمت کرتے تھے۔ اشفاق اللہ خاں کی گرفتاری کا موجب ہوئے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے تھے۔ کراچی میں اورنگ آباد کوارٹرز (پاپوش نگر) کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میں نے انھیں دیکھا تھا، اور ان سے ملا بھی تھا۔ یہ ۶۳-۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ۱۶/مارچ ۱۹۷۳ء کو صبؔر شاہ جہاں پوری کا انتقال ہو گیا۔

باب سوم

عہدِ انقلاب

جب یورپ کی فضا پر ہلال کے ارد گرد عیسائیت کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ جب خلافت کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے کے لیے یورپ کے تثلیث پرست جمع ہو رہے تھے۔ جب آلِ عثمان کے کمزور و نحیف جسم کے چاروں طرف عیسائی زاغ وزغن مجتمع ہو رہے تھے۔ جب یوروپی چودھری کبھی آرمینیا کو اور کبھی بلغاریا اور سرویا والوں کو اٹلی کے ذریعے سامانِ حرب پہنچا پہنچا کر اشتعال دلا رہا تھا کہ جو پاؤ لے لو، جو ملے اسے نہ چھوڑو، معصوم ترکوں کا خون تمھارے لیے حلال ہے۔ اٹلی طرابلس کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے، وہاں روزانہ نت نئے مظالم ڈھائے جانے لگے ہیں۔ اس وقت ایک درد بھرے دل کی پکار ساحلِ مغرب سے بلند ہوتی ہے اور جب وہ ہمالیہ کی بلند دیواروں سے ٹکراتی ہے تو اس کی آواز کی بازگشت ہندوستان میں سنائی دیتی ہے۔ محض وادی نیل کے مسلمان ہی اس سے بے چین نہیں ہوتے، بلکہ گنگ و جمن کے دو آبہ کے کلمہ گو مسلمان بھی اور بلادِ ہند کے کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے والے بھی متحیر رہ جاتے ہیں کہ یہ آواز تو ہم جیسی ہے صرف لہجہ دوسرا ہے، غرضے کہ وہ بھی لبیک کہتے ہیں اور خدا کے شیر یہاں بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہاں انور بے اور شکری پاشا دستِ حق پرست میں تلوار لے کر میدان میں کود پڑتے ہیں تو ادھر بھی اہل دل گردن میں جھولیاں ڈال کر بھیک مانگنے کے لیے نکل پڑتے ہیں، در در پھرتے ہیں اور روپیہ سے ان کا خزانہ پُر کر دیتے ہیں۔ یوں باہمی اخوت اور اتحاد اسلامی کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور بھولا ہوا وعدہ یاد آ جاتا ہے، کھوئی ہوئی منزل دکھائی دینے لگتی ہے، بھائی بھائی ملتے ہیں، پروپیگنڈا ہوتا ہے، جس کا اثر نوجوان مسلمانوں پر پڑتا ہے اور وہ یہ عزم لے کر اٹھتے ہیں کہ اٹلی، جو اس وقت مسلمانوں کا سخت ترین دشمن تھا، کا مال جلا دیا جائے۔

ترکی خواتین کی حب الوطنی، نوجوان ترکوں کی سرفروشیوں اور طلبہ کی قربانیوں کی

ولولہ انگیز داستانیں میرے اندر ایک نئی اسپرٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ میری والدہ جو باقاعدہ تعلیم یافتہ ہیں، اخبار کی مستقل خریدار بن گئیں اور اس طرح میں بھی اخبار پڑھنے لگا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ مسلمان اور بھی کہیں ہیں۔ کیوں کہ اس وقت میں جغرافیہ سے ناواقف تھا اور ہندوستان ہی کو مکمل دنیا سمجھتا تھا جیسے مینڈک کوئیں ہی کو ساری دنیا سمجھتا ہے۔

میں چوں کہ پٹھان تھا اور یہ قوم عام طور پر جاہل خیال کی جاتی ہے گو میں (بحمد اللہ) اب ایسا نہیں ہوں، ان خیالات میں ڈوب گیا اور روز و شب یہی دعا کرتا کہ ترک ہندوستان کو فتح کرلیں اور یہاں بادشاہ بن جائیں۔ ہم خلیفۂ وقت کی رعایا بن جائیں گے اور اگر افغانستان نے حکومت قائم کرلی تو بھی کیا ہے، ہم پھر بھی حقدار ہیں، انگریزوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ یہی بانی فساد ہیں اور ان کی حکومت نیست و نابود ہو جانی چاہیے۔ اور یہ اس طرح ہو کہ افغانستان یا ترکی کے لوگ حملہ کر دیں اور ہم بغاوت کریں۔ انگریزوں کی سلطنت درہم برہم ہو جائے۔ ہم بجائے عیسائیوں کی رعایا کے مسلمانوں ہی کی رعایا بن جائیں۔ ممکن ہے بعض ہندوؤں کے خیالات بھی ایسے ہی ہوں کہ چین یا جاپان میں سے کوئی ایک یہاں آجائے تو بہت اچھا ہو۔ اگرچہ بنگال میں قربان گاہِ وطن پر قربانیاں چڑھائی جانی شروع ہو گئی تھیں، جس کے قصے میں سنا کرتا تھا۔ مگر ویسی ہی رنگ آمیزی کے ساتھ جیسے کہ ہمارے قصے اور ہمارے کیس کے واقعات دوسروں کی زبانوں پر آج ہیں۔

بہر حال میرا اس وقت کا یہ خیال آج مجھے بہت ذلیل معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک کا حلقۂ غلامی اتار کر دوسرے کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں پر رکھنے میں مسرت سی محسوس کرتے تھے۔ خیر وہ میری ناسمجھی کا زمانہ تھا۔ ہاں میرا خیال اس زمانے میں ہندوؤں کے بہت خلاف تھا اور بعد کو اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیوں کہ ہمارے کرم فرما ایک ماسٹر صاحب تھے جن کا اگر میں نام لوں گا تو ان کو مفت میں شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ وہ میرے اس وقت ماسٹر تھے جب میں گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ ہندو مسلم میں بہت امتیاز کرتے تھے۔ اب میں کہوں کہ استاد کا یہ طریقۂ کار کمینہ پن ہے اور فی الحقیقت اسی قسم کے لوگ ملک و وطن کے دشمن ہیں۔ مگر آج میرا دل ایک ہندو کے لیے بھی ایسا ہی کشادہ ہے جیسا کہ ایک مسلمان کے لیے۔ خیر اس وقت کے لیڈر آج بھی اتحاد اسلامی پر عمل کرتے ہیں گو کہ ایک حد تک میں بھی ان سے اتفاق کرتا ہوں، بھائی سمجھنے میں کوئی نقصان نہیں، مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ کیوں کہ

ہم فیاض ملک کے فیاض باشندے ہیں لیکن کسی کی حکومت اپنے اوپر مسلط کر لینا پست ہمتی اور بد بختی کی بات ہے۔ یہ کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں!

دنیا میں انقلاب و تغیرات کتنی تیزی سے ہوا کرتے ہیں، کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں؛ کل میں ترکوں کی حکومت اپنے اوپر باعثِ صد ناز و افتخار اور ذریعہ بخشش سمجھتا تھا اور آج بدترین ذلّت۔ آج میں ہر بدیسی حکومت کو بُرا سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی ہندوستان کی ایسی غیر جمہوری حکومت کو بھی جس میں کمزوروں کا حق حق نہ سمجھا جائے یا جو حکومت سرمایہ داروں اور زمینداروں کے دماغوں کا نتیجہ ہو، یا جس میں مزدوروں اور کسانوں کا مساوی حصہ نہ ہو، یا باہم امتیاز و تفریق رکھ کر حکومت کے قوانین بنائے جائیں۔ میں تو کہوں گا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوا اور ہمارے گورے آقاؤں کی بجائے ہمارے وطنی بھائی حکومت کی باگ ہاتھ میں لیں اور امیر و غریب اور زمیندار و کاشتکار میں تفریق و تمیز باقی رہے۔ تو اے خدا! مجھے ایسی آزادی اس وقت تک نہ دینا جب تک تیری مخلوق میں مساوات قائم نہ ہو جائے۔ میرے ان خیالات سے اگر مجھے اشتراکی یا کمیونسٹ سمجھا جائے تو مجھے اس کی فکر نہیں۔

میرا خدا پر ایمان ہے اور میں اسے مانتا ہوں۔ وہ سب کو ایک ہی صورت میں پیدا کرتا ہے اور ایک ہی صورت پر مارتا ہے۔ اس کے خوانِ کرم سے سب کو کھانے کے لیے ملتا ہے۔ بدمعاش بدمعاشی سے، لٹیرا لوٹ سے اور ظالم ظلم سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وکیل مؤکلوں سے، زمیندار کسانوں سے اور سرمایہ دار مزدوروں سے جونک کی طرح چمٹ کر ان کا خون چوستے ہیں۔ کیوں کہ وہ کمزور اور مریل ہیں اس لیے لُٹ جاتے ہیں۔ یہ سب قانونِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے خلاف جنگ فرض ہے۔ یہاں میرا مقصد مختصراً نوٹ لکھنا ہے۔ دیکھیے کل کیا ہو؟ اپنی رائے، اگر موقع ملا تو تفصیل کے ساتھ بعد میں لکھوں گا۔

بہر حال میں ایک عرصہ تک اتحاد اسلامی کا مؤید رہا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے زندگی کا شعور حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ زمانہ اس زمانے کے قریب کا ہے، جب خودی رام بوس اور کنہائی لال دت نے اپنی قربانی سے بنگال کو ہلا ڈالا تھا اور جس سے تمام ہندوستان کانپ اٹھا تھا۔ کبھی کبھی کہانیاں سننے میں آتی تھیں اور بنگالی بموں کا حال سنتے تھے تو دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن ہم بھی خودی رام بوس اور

کنہائی لال دت کی طرح پھانسی کی کوٹھری میں بند ہوں گے اور ہمارا تذکرہ بھی طلبہ میں اسی طرح ہوگا جس طرح کبھی ہم لوگ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اور پھر کیا معلوم کہ ہمارا ذکر کرنے والے بھی اسی طرح اس کوٹھری کو آباد کریں۔

ایک دن میں اسکول جارہا تھا کہ یکایک سنا کہ دہلی میں وائسرائے بہادر پر کسی نے بم مار دیا اور اسکول بند ہوگیا۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی، چلو ایک پنتھ دو کاج، چھٹی ملی اور ایک نیا واقعہ بھی ظہور میں آگیا۔ اس کے بعد بازاروں میں خوب گپیں سنیں جیسی کہ اب ہم پر باہر ہوتی ہیں۔ آپ مہاتما شری داس بہاری بوس کی کیفیت سے تو بخوبی واقف ہوں گے۔ میں بھی واقعات سمجھنے کے قابل تھا اور وہ جگہ بھی دیکھی جہاں وہ ایامِ فراری میں رہتے تھے۔ خیر وہ کامیاب ہوکر باہر نکل گئے اور ہم کوٹھری میں بند ہیں۔

باب چہارم

مین پوری سازش کیس

۱۹۱۸ء میں جب میں مشن اسکول کے ساتویں درجے میں پڑھ رہا تھا۔ ایک دن اسکول میں یکایک پولیس آگئی۔ ہمارے اسکول میں اس کیس کا اپرووَر (سرکاری گواہ) شناخت کی غرض سے لایا گیا تھا اور اس نے دسویں درجے سے راجہ رام بھارتی کو گرفتار کرایا۔ اور بھی دو ایک لڑکوں پر شبہ ظاہر کیا، وہ بھی حراست میں لے لیے گئے۔ غرض کہ وہ دن بھی عجیب دن تھا۔ پولیس کی پگڑیاں اسکول کے چاروں طرف نظر آتی تھیں۔ یہ ایک بالکل نئی بات تھی کہ ایک اسکول کا طالب علم اس صورت میں گرفتار ہوا تھا۔ گو کہ بنگال میں یہ ایک معمولی بات اور آئے دن کا معاملہ تھا مگر یوپی میں یہ بات کہاں تھی۔ غرض کہ اسکول پر عجیب دہشت اور خوف چھایا ہوا تھا اور ہر لڑکا اپنی جان کی خیر منا رہا تھا۔

میں اس روز ذرا دیر سے گیا تھا۔ کوئی لڑکا اندر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ہر درجے میں شناخت ہو رہی تھی۔ میں بھی اپنے درجے میں خاموشی سے جا بیٹھا مگر نفسِ معاملہ معلوم کرنے کو بے چین تھا، جو میری نیچر میں تھا۔ کیوں کہ میں اسکول کا ہاکی کھیلنے والا اور آزاد طالب علم تھا۔ ماسٹر صاحب سے پوچھنے کو جھکا۔ مگر ماسٹر صاحب بتانے سے ڈرے۔ یکایک ایک لڑکے نے کہا "راجہ رام نے کہیں ڈاکا مارا ہے اور وہ گرفتار کیے گئے ہیں، اور بھی لڑکے گرفتار ہوئے ہیں"۔ اب مجھے راجہ رام کی فکر ہوئی۔ یہ لڑکا کون ہے؟ کیوں کہ راجہ رام ایک سیدھا سادا اور خاموش سا لڑکا تھا۔ اسکول کے اکثر طلبہ اس سے واقف بھی نہ تھے۔

میری اس کی ملاقات جب اس کی رِہائی کے بعد ہوئی تو مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا بھولا بھالا لڑکا بھی ریولیوشنری ہو سکتا ہے۔ خیر! اسی روز شاہ جہاں پور شہر میں بھی تلاشیاں شروع ہو گئیں۔

میرے درجے کے ایک ساتھی نے مجھ کو علیحدہ لے جا کر کہا "راجہ رام ایک خفیہ

سوسائٹی کا ممبر تھا۔ وہ نہ ڈاکو ہے نہ قاتل"۔ میں نے ہنس کر کہا، تم بھی ایسے ہی معلوم ہوتے ہو۔ تمھیں بھی گرفتار کرادوں گا۔ اس پر اس نے نہایت بہادری سے کہا کہ میں دیش کے لیے مرنے کو تیار ہوں۔ اس نے یہ کچھ ایسی شان اور طرز سے کہا کہ میں اس کو کبھی نہ بھولا۔ اب شہر میں چنڈوخانے کی خبریں اُڑنے لگیں جس کا اندازہ میں اس وقت تو نہ کرسکا، مگر اب جب کہ اپنے اوپر پڑی تو سمجھ میں آیا کہ صحیح گپاسٹک کے سامنے رائی پہاڑ بن جاتی ہے۔

اب سنا کہ رام پرشاد مفرور ہوگئے اور بھی چند لڑکے مفرور ہیں۔ ہماری ٹیم کا ایک پلییَر (کھلاڑی) مسٹر کالی چرن بھی پنڈت کالی چرن کے دھوکے میں بلائے گئے۔ غرض کہ عجیب لطف اور خوف کے دن تھے۔ لطف تو ایسی طبیعتوں کے لیے تھا جو ہمیشہ نئی چیز چاہتی ہیں اور خوف کے دن ان کے لیے جو ذرا سی بات پر اختلاجِ قلب محسوس کرتے ہیں اور اسی پرانے رویّے کو پسند کرتے ہیں خواہ ترقی میں ہوں خواہ تنزل کی حالت میں۔

گرفتاریوں کے بعد کیس مین پوری ڈسٹرکٹ میں چلایا گیا اور اخبار والوں کی قسمت جاگ گئی۔ اس سے ملک والوں کو معلوم ہوا کہ لڑکے بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گو کہ یہ لڑکوں ہی کا ایک کھیل تھا کیوں کہ بے سلسلہ وبے تعلق اسکول اور کالج کے طلبہ حکومتِ برطانیہ کو ٹوپی دار بندوق اور بم کے گولوں سے ہٹا نہ سکتے تھے۔ مگر نوجوان خون چوں کہ گرم ہوتا ہے، اسے ہر مشکل کام آسان معلوم ہوتا ہے۔ یوں ان لوگوں کا دماغ بھی چکرا گیا تھا۔ میں ان کے جذبات، ان کی حب الوطنی، ان کے ایثار کا دل سے قائل ہوں۔ مگر ان پاک جذبات کا خون کسی عاقبت نااندیش کے ہاتھ سے ہو گیا تھا۔ اگر ایسے نوجوان کسی آزاد ملک میں پیدا ہوتے تو میں بغیر کسی رکاوٹ کے کہوں گا کہ ان کا نام نیشنل بلڈرس کی فہرست میں لکھا جاتا۔ یہ آسان کام نہیں ہے کہ موت کا مقابلہ کرنے اور مذبح میں اپنے آپ کو کاٹے جانے کے لیے انسان اپنے تئیں خوشی سے پیش کردے۔

اے وطن کی محبت! تری ادائیں بھی انوکھی اور نرالی ہیں۔ اگر ایک طرف تو نپولین بوناپارٹ کو فرانس کا ایک چہیتا فرزند بنادیتی ہے تو دوسری طرف دوسرے کو دشمنِ جاں اور خونخوار بنا کر سینٹ ہنا میں بند کرادیتی ہے۔ غرض کہ ایک کے لیے شہد ہے تو دوسرے کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ ایک کے لیے نوید حیات ہے تو دوسرے کے لیے پیغامِ موت!

اے وطن کی محبت! تو پیاری سے پیاری چیز ہے اور ظالم سے ظالم! تیرے قدموں پر

کتنے ہی نوجوانوں کے سر ہوں گے جو کاٹ کاٹ کے چڑھا دیئے گئے ہوں گے۔ اور کتنے ہی منچلے جوان تیری ایک ادا پر ہنستے ہوئے ختم ہو گئے۔ اس پارٹی کا ہیرو تیرے نام پر قربان ہو گیا، جاپان کے طلبہ نے تیری مسکراہٹ پر اپنے آپ کو دریا بُرد کر دیا۔ ہوریشر دشمن فوج کے مقابلے میں لڑنے کے لیے تنہا کھڑا ہوا، لڑا اور خون میں لت پت ہو گیا۔

غرض کہ ان نا تجربہ کار نوجوانوں کے کارنامے پبلک کے سامنے آئے۔ اور یہ عام مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اور اسکول کے لڑکوں کا یہ عام طریقہ ہے کہ جب اسکول میں داخل ہونے کو آئیں گے، غریب، سیدھے سادے، دیہاتی پوشاک میں ہوں گے۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اندر گلے میں ٹائی ہو گی اور پاؤں میں بوٹ جوتا، خواہ وہ تیلیا چمڑے ہی کا کیوں نہ ہو۔ ایک کوٹ پتلون کا ہونا بھی ضروری سمجھا جائے گا۔ غرض کہ اسی قسم کی باتیں خوب کلیاں اور پھندنے لگا لگا کر، جو باتونی تھے، کیا کرتے تھے۔ چوں کہ میں بھی نوجوان تھا اور خوب موٹا تازہ تھا، اس لیے کہ بچپن ہی سے کسرت وغیرہ کیا کرتا تھا اور اب بھی وہی بد قسمتی سے میری پھانسی کا باعث ہوا۔ ہمارے مکرم جناب خیرات نبی سے پبلک پراسیکیوٹر نے اپنی بحث میں میرا موٹا تازہ ہونا ظاہر کیا تھا اور اسی لیے مجھے اپنے گروہ میں سب سے زیادہ اور سخت سزا ملی۔

غرض کہ مین پوری سازش کیس کے بعد میری حالت بدل گئی۔ اور جب میں آٹھویں کلاس میں پاس ہو کر آیا تو انگلش کے کورس کی کتاب میں دو سبق تھے جن سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ایک تو "وطن کی محبت" سر والٹر اسکاٹ کی لکھی ہوئی نظم تھی اور دوسرا سبق جس میں ہوریشر کا قصہ تھا۔ جس میں اس نے اسپیچ دی تھی جب کہ غنیم نے ملک پر چڑھائی کی تھی۔ اس نے کہا تھا، اگر پل توڑ دیا جائے تو ٹائیور ندی کو پار کر کے فوج نہیں آسکتی اور نہ کوئی دوسرا راستہ ہے۔ میں جاتا ہوں اور اس تنگ راستے میں مع اپنے تین ساتھیوں کے کھڑا ہو کر لڑوں گا اور ادھر پل توڑ کر ندی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور روم بچ گیا۔

میرے ماسٹر صاحب نے کچھ ایسی طرز سے اس سبق کو پڑھایا کہ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس سبق کا مندرجہ بالا واقعہ اب تک یاد ہے۔ میری وطنی محبت کی بنیاد صرف اسی سبق سے پڑی۔ اس کے بعد سیکڑوں کتابیں پڑھ لیں اور ہزاروں لیکچر سن ڈالے۔ مگر نہ معلوم وہ کون سی ساعت تھی، جب اسکول میں یہ سبق ماسٹر صاحب نے پڑھایا تھا۔ میں اپنے آپ کو

روک نہ سکا اور خوب رویا۔ غرضے کہ مجھے حب الوطنی کے پلیٹ فارم پر لانے اور وطن کی محبت کی آگ بھڑکانے والی سب سے اوّل یہی نظم اور یہی سبق تھا۔

اس کے بعد میرے ایک اور ماسٹر صاحب نے، جن کا نام میں مصلحتاً نہیں لے رہا ہوں، ممکن ہے اس سے انھیں کچھ پریشانی محسوس ہو، مجھے ایک کتاب دی اور کہا کہ ''میں تم کو یہ بالکل دیتا ہوں کیوں کہ تم اس کے اہل ثابت ہوتے ہو۔ اس کتاب کا نام تھا "Patriots of the world" (دنیا کے محبانِ وطن) میں نے اس کو پڑھا اور یہ تاثر قائم ہوا کہ جو وطن پر مرمٹا اس نے زندگی جاوید پائی۔

اب مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور اپنی غفلتوں پر افسوس شروع ہوا کہ اتنی عمر فضول کھیل کود میں گنوائی اور تعلیم میں کمی کا باعث ہوا۔ چوں کہ حب الوطنی کے لیے تعلیم ایک لازمی امر ہے۔ اگر حب الوطنی کے جذبات بچوں میں شروع سے پیدا کیے جائیں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی زندگیاں انھیں پڑھائی جائیں تو بچہ پڑھنے کا ہمیشہ شوقین رہے گا اور بڑا ہو کر بگڑے گا نہیں۔ وہ سمجھ دار بنے گا اور عقلمندی سے راستے پر چلے گا۔ غرضے کہ میں اسی تگ و دو میں رہا، اور کئی برس گزر گئے۔

چوں کہ میں کافی جوان ہو گیا تھا اور تعلیم میں کم تھا (خوفِ طوالت سے مختصر لکھ رہا ہوں) میرا ارادہ آگے چل کر بچوں کو نصیحت کرنا ہے۔ بنارسی لال اپرووَر اکثر مجھ کو ملا کرتے تھے۔ مجھے اس وقت تو کیا، کئی برس تک یہ پتا نہ چلا کہ یہ کون ہیں اور ان کی گزشتہ زندگی کیا ہے۔ ان حضرت نے رام پرشاد بسمؔل کا ذکر چھیڑا۔ راجہ رام بھارتی انھی کے گھر پر رہتے تھے۔ مجھے یکا یک یہ شک پیدا ہوا کہ یہ بھی مین پوری سازش کا ممبر ہے لہٰذا اپنے سے زیادہ ملک کا بہی خواہ سمجھ کر میں اس کی عزت کرنے لگا۔ اور اس زمانے میں زیادہ بیٹھک اس کے گھر ہوئی۔ میں جلسوں میں برابر شریک ہوتا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے۔ میں نے گاڑھا پہننا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے مین پوری سازش کیس کے بارے میں جو کچھ راجہ رام سے سنا تھا، سنانا شروع کیا اور اپنے آپ کو پکا دیش بھگت ثابت کر دیا۔ اور یہ آج کا فیشن ہے کہ اپنے آپ کو ریولیوشنری بتایا جائے جیسے کہ ایامِ فراری میں ایک صاحب نے اپنے آپ کو مجھ پر ثابت کیا، جسے میں موقع پر حوالۂ قلم کروں گا۔

ایک دن بنارسی لال نے مجھے ایک کتاب ''آنند مت'' جو ہندی میں تھی، سنائی۔ میں اس وقت ہندی بہت کم جانتا تھا۔ پھر بنارسی لال نے مجھ سے کہا کہ خفیہ سوسائٹی ایسی ہوتی

ہے۔ بہ نسبت اس ہاہاکار (چیخ پکار) کے سازش کا قائل تو میں ان کے ملنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا جب کہ میں ہجرت کرنے والا تھا۔ لیکن ایک صاحب نے مجھے روک دیا اور کہا کہ ہم ہندوستان میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں، تم خفیہ سوسائٹی میں شامل ہو جاؤ اور میں بھی راضی ہو گیا۔ اس طرح میرے ریولیوشنری بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ مگر مجھے مسلم طبقے سے ہمیشہ ناامیدی ہی ہاتھ آئی اور راہِ عمل پر کوئی نہ آیا۔ میں ہی اُلو تھا کہ اسی دُھن میں تھا۔

بنارسی لال مجھے اکثر غمگین نظر آتے تھے اور یہ اثر دوستوں سے چھوٹ جانے کا تھا۔ علاوہ اس کے کانگریس والے، جو کل مدد کا وعدہ کر چکے تھے، اپنے اپنے رستے لگ گئے تھے بلکہ بے وقوف بناتے تھے۔ ان باتوں کا اثر میرے دل پر یہ پڑا کہ میں ہر دم بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مگر کس سے کہوں، نہ کوئی ہم نشیں تھا نہ کوئی رازدار و غم گسار تھا کہ جس کے سامنے اپنے غم کی کہانی بیان کروں۔ پھر میں نے بنارسی لال سے کہا کہ رام پرشاد کے پاس چلو اور مجھے ان سے انٹروڈیوس (متعارف) کرادو۔ گو کہ رام پرشاد میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو اردو اسکول میں رہ چکے تھے اور آپس میں دوست تھے اور میرے بھی اسکول فیلو رہ چکے تھے، مگر میرے ان سے تعلقات نہ تھے۔ چوں کہ رام پرشاد شروع سے خاصی شخصیت رکھنے والے انسان تھے اور کسرتی اور ہوشیار طالب علم تھے اور عام طور پر مشہور بھی تھے، میں نے خیال کیا کہ رام پرشاد سے ملوں، شاید وہاں دوا مل جائے اور تسکینِ قلب کی کوئی صورت نکل آئے۔ غرض کہ ایک دن کھنوت (دریا) کے کنارے ایک جلسہ ہوا۔ رام پرشاد نے اس میں ایک مختصر سا لیکچر دیا۔ اور شروع میں یہ شعر پڑھا۔

ہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیر قاتل کی

یہ شعر مجھے اب بھی یاد ہے اور میں نے کنڈ منڈ سیل میں ملاقات کے وقت پڑھا تھا۔ میں نے بھی کچھ کہا تھا(۱)۔ غرض کہ بنارسی لال نے ہم دونوں کا انٹروڈکشن کرایا۔ گو کہ اس سے قبل بھی ایک دن رام پرشاد سے ملا تھا مگر وہ اتنی سرد مہری سے ملے تھے کہ مجھے بہت دُکھ ہوا تھا۔ جس کی وہ معافی مانگ لیا کرتے تھے۔ غرض کہ اب ہماری ملاقات رام پرشاد بسمل سے ہو گئی۔

---

(۱) یعنی مذکورۃ الصدر جلسے میں تقریر کی تھی یا اظہار خیال کیا تھا۔

باب پنجم

مکاتیب

(۱)

بنارسی لال کے نام

ازبھوپال

اس(۱) مرتبہ میں تم سے کچھ اہم معاملات پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے مجھے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ میں تمھیں اردو میں خط لکھوں۔ لینن کا پتا(۲) مجھے تمھارے خط سے معلوم ہو گیا۔ میں آج ہی اسے بھی خط لکھ رہا ہوں۔

رام کا کیا حال ہے؟ تمھاری اس سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں؟ رام کے نام عاشق(۳) کا پرچہ جو تمھیں ملا ہے، براہ کرم اسے بلا تاخیر رام کو پہنچا دو اور اس سے کہہ دو کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ مجھے خط لکھے۔

تمھیں معلوم ہے کہ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے جس سے میں کام چلا

---

(۱) اشفاق شہید کا یہ خط ان کے دوست بنارسی لال کے نام ہے۔ یہ خط انھوں نے بھوپال سے لکھا تھا۔ اصل خط اردو میں تھا۔ یہاں جو خط پیش کیا جارہا ہے اسے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ خط کاکوری کیس میں عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ جوگیش چند چٹرجی کی کوششوں سے عدالت کے ریکارڈ سے انگریزی ترجمہ دستیاب ہو گیا ہے۔ اصل خط عدالت کے ریکارڈ میں بھی نہیں۔ ہم جناب چٹرجی کے شکریے کے ساتھ اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ انگریزی خط کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔

(۲) معلوم نہیں ہو سکا یہ کس دوست کی طرف اشارہ ہے؟

(۳) رام سے مراد رام پرشاد اور عاشق کے لفظ سے اپنی طرف اشارہ ہے۔

سکوں۔ ملازمت کے معنی ہیں اپنے ضمیر کا خون کر دینا۔ اور یہ بات تمھیں اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں آزادی کا پجاری ہوں اور اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ غلامی کا طوق میں اپنے گلے میں ہر گز نہیں ڈالنا چاہتا خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ میں اس کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں اور جب اس کا خیال مجھے آجاتا ہے تو گھنٹوں روتا رہتا ہوں۔ لیکن میرے عزیزوں کی خواہش ہے کہ میں کوئی ملازمت ضرور اختیار کر لوں اور اس طرح مجھے اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرنی چاہیے۔ بلاشبہ یہ بات درست ہے اور ہمارے مذہب کی تعلیم بھی یہی ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اس کے بعد مجھے مادرِ وطن کی خدمت کا موقع نہ مل سکے گا۔

اگر میں بھوپال میں ملازمت کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو سر اسرار حسن خاں مجھے فوراً کوئی نہ کوئی ملازمت دلادیں گے۔ میرے بھائی نے ان سے ملنے کے لیے مجھے تاکید کی ہے اور مجھے امید ہے کہ ان کی سفارش سے مجھے فوج میں صوبیدار کا عہدہ مل جائے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ کہ میرے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ مجھے صرف اس لیے تو اپنی زندگی عزیز نہیں کہ روپیہ کماؤں اور عیش کروں۔ میں تو وطن کی آزادی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے لیے بڑے سے بڑے خطرے کی بھی پروا نہیں کرتا۔ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ دنیا مجھے دیوانہ یا پاگل کہہ کر پکارے گی۔ آزادی میرا عقیدہ ہے، میں اسی کے لیے جیوں گا اور اسی کے لیے مروں گا۔

یہ ہے میرا احساس — شاہ جہاں پور کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتے گھومتے میں تھک گیا ہوں۔

تمھیں معلوم ہے کہ میں ایک گاؤں کا مالک ہوں! نہیں، بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میری ماں زمیندار ہے۔ اور بغیر کسی دقت کے جتنی زمین چاہوں، مجھے مل سکتی ہے۔ میں کھیتی باڑی کرنا چاہتا ہوں، لیکن کام شروع کرنے کے لیے میرے پاس روپیہ بالکل نہیں ہے۔

اگر تم اسے منظور کرو اور تمھیں اس کام سے دلچسپی بھی ہو تو اس میں روپیہ لگانے کو تیار ہو جاؤ، وہیں چل کر رہیں گے۔ اپنے کسان بھائیوں کے ساتھ زندگی گزاریں گے اور اپنی اسکیم کو کامیاب بنائیں گے اور اس طرح چند ہی سال میں ایک معقول رقم جمع ہو جائے گی جس سے ہم وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کر سکیں گے اور دوستوں کو اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی

دعوت دیں گے۔

مختصر یہ کہ ہمارے لیے دنیا میں اگر کوئی مقدس اور مفید کام ہے تو وہ کھیتی باڑی ہے۔ بشرطے کہ تم میری مانو۔ اگر تم نے انکار کیا تو اس سے مجھے دُکھ ہوگا۔ آخر تمھیں اپنے بچوں اور بیوی کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ پھر آؤ، ہم کاشتکاری ہی کیوں نہ کریں! سرمایہ تمھارا ہوگا، زمین میری اور محنت ہم دونوں کی۔ ہم دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح گاؤں میں رہیں گے اور حالات کا مقابلہ کر کے دنیا کو دکھادیں گے کہ دو نوجوانوں کے لیے کوئی ناممکن کام بھی ناممکن نہیں ہے جب کہ دونوں کا خیال ایک ہو اور دونوں ایک ہی راستہ اختیار کریں۔

نندیا اور سال پور کی زمینیں ہمارے لیے آغوش کھولے ہوئے ہیں۔ ان کی محبت بھری نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ اور وہاں کے غریب اور ہمدرد کسان ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے میں تم سے کہوں گا کہ بھائی، ان زمینوں کو مایوس نہ کرو اور ان کسانوں کا دل نہ توڑو۔ اب مجھے بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟

اگر میرے پاس سرمایہ ہوتا تو میں تمھیں یہ کچھ نہ لکھتا، بلکہ کام شروع کر دیتا اور تمھیں اپنا حصہ دار بنالیتا۔ مگر افسوس! میرے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے اور میرے رشتہ دار اس کام میں کسی طرح کی امداد کرنے کی بجائے غلامی کے قعرِ مذلّت میں ڈھکیلنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ کھیتی کی اہمیت اور اس بات کو قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ ہندوستان کی آزادی کا انحصار کسانوں پر ہے۔ اس لیے آؤ ہم اکٹھے کھیتی باڑی کریں۔

دیکھو، دیو نرائن اور گنگا سنگھ کاشت کاری سے کتنا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ صرف دو ہی سال کے بعد بہت سے دوست ہم سے آملیں گے اور ہم اپنے اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لانے کے قابل ہو جائیں گے

وارثی

(۲)

ریاست اللہ خاں کے نام

ڈسٹرکٹ جیل، لکھنؤ

۱۹؍جون ۱۹۲۷ء

بھائی صاحب قبلہ!

بعد آداب کے عرض ہے کہ اس اتوار کو حسبِ وعدہ آں جناب کا سخت انتظار رہا۔ آپ کی اس اتوار کو سخت ضرورت تھی۔ اگلی اتوار کو ضرور بالضرور مع والدہ صاحبہ وغیرہ کے آیئے گا!اب صرف تین اتوار درمیان میں ہیں کیوں کہ ۱۳؍جولائی کو فیصلہ ہو جائے گا۔ میں نے جو لفافہ والدہ صاحبہ کو لکھا تھا جس کی بابت آپ سے کہا تھا کہ لیتے آیئے گا۔ بخشی کے والد کانپور جانے والے تھے، آپ کا انتظار کرتے رہے۔ اب وہ غالباً آج کل میں چلے جائیں گے۔ آپ ابھی ٹھیک کرا لیجیے۔ میری غزل بھی ہمراہ بھیج دیجیے گا۔ جس کو آپ نے دریافت کیا تھا

ع

بہار آئی ہے شورش ہے جنونِ فتنہ ساماں کا

مگر مجھ سے مل کر جایئے گا۔ علی گڑھ جانے کا ارادہ ہی ہے یا جایئے گا بھی؟ فیض آباد بھی ضرور جایئے گا۔ وقت اب کم ہے، لمبے چوڑے خط لکھنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یوں کارڈ لکھ دیا۔ آپ خود عقلمند ہیں، جو مناسب سمجھیں کریں، دوا تو ہو چکی اب دعا باقی ہے۔

بنّن اور عاشق سے سلام کہہ دیجیے اور ملاقات کے بارے میں بھی لکھ دیجیے گا۔ فوٹو کی ایک کاپی بخشی کے والد کو دے دیجیے گا۔ بخشی صاحب کی خواہش ہے۔ مگر اپنے ہمراہ لایئے گا تاکہ ہم بھی دیکھ لیں۔ زیادہ کیا لکھوں!

اشفاق وارثیؔ

(۳)

ریاست اللہ خاں کے نام

اززندانِ فیض آباد
۲۹/نومبر ۱۹۲۷ء

پیارے بھائی صاحب!

کارڈ مرسلہ آں جناب ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ قضاو قدر میں چارہ ہی کیا ہے۔ رنج و مصیبت میں ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُوْن'' پڑھ کر صبر کرنا چاہیے۔ اس سے قبل کے خط میں صاف لکھ دیا ہے کہ خدا ہر صورت سے، اولاد سے، جان سے، جانوروں سے، امتحان لیتا ہے۔ پس جس نے صبر کیا، اس نے اسے راضی کر لیا۔ کیوں کہ وہ صابر اور شاکر کا ساتھی ہے۔ خدا ہی دیتا ہے اور خدا ہی لیتا ہے اور وہ پھر دے گا۔ ہر حال میں شکر کیجیے۔ بھابھی کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خیریت سے مطلع فرمایئے گا۔

امید ہے کہ اس مرتبہ بھائی صاحب مجھ سے ملاقات کرنے آئیں گے۔ کیوں کہ اس مرتبہ ان سے ملاقات کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثنوی شریف مل گئی، خوب ہے۔ بھابھی کی طرف سے فکر ہے، جلد مطلع فرمایئے!

والدہ صاحبہ اور بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب دست بستہ قبول ہو۔

اشفاق اللہ خاں وارثی

(۴)

صفی اللہ خاں کے نام

زندانِ فیض آباد
۲۲/ جولائی ۱۹۲۷ء

مکرم جناب بھائی صاحب قبلہ

آپ یہ چند سطور پڑھ کر زیادہ پریشان ہوں گے اور حقیقتاً پریشان ہونا بھی چاہیے۔

آج جناب ڈپٹی صاحب بہادر یعنی خان صاحب عین الدین کا حکم آیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ تمھاری جائیداد ضبط نہ کی جائے۔ اگر تم جواب دہی کرنا چاہو تو ۲۹/ جولائی مقرر کی گئی ہے۔ اس حکم کے الفاظ حسب ذیل ہیں :

"مقدمہ مندرجہ عنوان میں بنا بر سماعت رپورٹ سی آئی ڈی بابت ضبطی جائیداد ملزم تاریخ پیشی اجلاس ہذا میں ۲۹/ جولائی مقرر ہوئی ہے اور اشفاق اللہ قیدی ڈکیتی کیس کاکوری ضلع لکھنؤ کا ہے جو جیل فیض آباد میں ہے، لہٰذا حکم ہوا کہ

بخدمت سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر جیل التماس ہووے کہ اشفاق اللہ خاں مذکور کو تاریخ پیشی سے اطلاع دی جائے کہ وہ مناسب جواب دہی کرے بعد اطلاع دہی حکم ہٰذا اندر تاریخ مقررہ واپس اجلاس ہٰذا فرمایا جائے"۔

یہ حکم کی نقل ہے، آپ کو اطلاع کی غرض سے لکھ دیا۔ میں خود کوشش کروں گا کہ بذاتِ خود جواب دہی کروں، اگر مجھ کو موقع مل گیا۔ میری جائیداد ہی کیا ہے جو ضبط ہو گی۔ میرے خیالات، میری کتابیں، میری جان، میری آزادی، میری جائیداد جو گورنمنٹ نے ضبط کرلی ہے، اب دیکھیے کیا نیت ہے؟

خیر! خدا کا شکر ہے۔ آپ لوگ جانیں، آپ کا کام جانے۔ میری وجہ سے جو بھی آپ لوگوں کو دُکھ پریشانیاں اُٹھانی پڑیں، انھیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیجیے اور خدا سے

دعا کیجیے اور مجھے معاف فرمائیے۔ ایک شعر لکھے دیتا ہوں ؎

وہ آمادہ ہیں بعدِ دفن بھی تُربت مٹانے پر
کرم فرما کی باقی ہیں کرم فرمائیاں اب تک

---

(۵)

صفی اللہ خاں کے نام

کنڈ منڈ سیل۔ فیض آباد جیل
۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء

مکرم معظم جناب بھائی صاحب قبلہ، دام ظلکم!

بصد ادب گذارش خدمت عالی میں یہ ہے کہ میں بخیریت ہوں۔ اور خیر و عافیت آپ کی مع دیگر متعلقین کے نیک مطلوب۔ للّو بھیا کے خط سے معلوم ہوا کہ اپیل داخل ہو گئی ہے۔ ۶/ تاریخ کو بابو موہن لال سکسینہ کے پاس دریافت حال کے لیے خط لکھ دیا ہے۔ آپ لوگوں میں سے جو آئے وہ ملتا ہوا آئے تا کہ تازہ واقعات و حالات کی خبر ملے۔

بھائی صاحب! دنیاوی طاقتیں مضمحل اور مجہول ثابت ہوئیں۔ اب اسی کا در کھٹکھٹایئے جس کے دروازے سے سب کو ملتا ہے۔ اور جہاں سے حکم صادر ہو کر صورتِ عملی اختیار کرتا ہے۔ اس کا ذرا سا اشارۂ کرم کافی ہے۔ وہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے، تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جائے پس وہ ہو جاتا ہے۔ ہو گا تو وہیں سے اور نہ ہو گا تو اسی کے حکم سے۔ پس اسی سے لو لگایئے اور اسی سے التجا کیجیے۔ اور میرے لیے دعا فرمایئے کہ توبہ قبول فرمائے اور رحم کرے۔ اسی کی درگاہ میں التجا کیجیے اور بس اسی کا دامن تھامیے، یہی اب کشودِ کار کا باعثِ ہو سکتا ہے۔

میں اپنی قلبی کیفیت لکھ نہیں سکتا۔ اور یونہی میں نے اگلے خط میں آپ کو بھی لکھ دیا تھا کہ زبانی کہہ کر صلاح لوں گا اور اپنے درد کی دوا ڈھونڈنے کے لیے آپ سے عرض کروں گا۔ للّو بھیا نے دنیاوی کوششوں میں خاک چھان ڈالی۔ اب آپ میری دینی مشکلات میں میری

مدد فرمائیے۔ خدا معلوم میں نے کس صورت سے انتظار کے یہ دن گزارے ہیں۔ اس اتوار کو خط دیکھتے ہی تشریف لائیے —!

اشفاق اللہ خاں وارثیؔ

---

(۶)

اہلِ خاندان کے لیے

کنڈمنڈ سیل، فیض آباد جیل

...۱۹۲۷ء

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے

میری سوگوار ماں، بھائیوں، بہن اور عزیزو!

یہ خط (۱) جب کہ تمھارے ہاتھ میں پہنچے گا، تب نہ معلوم تمھارا کیا حال ہوگا۔ نہ معلوم اس وقت میں زندہ رہوں گا یا راہیِ عدم ہو چکا ہوں گا۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ جیل کے حکام یہ خط ضرور روانہ کر دیں گے، جب کہ مرنے والے کی یہ آخری خواہش ہے۔ بہر حال میں لکھ رہا ہوں، اب خدا عالم ہے کہ کیا ہو؟ خیر، اخیر حکم آگیا ہے اور اب دو ایک روز کے مہمان اور ہیں۔ انسانی کوشش حکمِ خداوندی کو نہیں ٹال سکتی جس نے بساطِ عالم پر مہرے

---

(۱) اس خط پر اشفاق اللہ خاں کے بڑے بھائی ریاست اللہ خاں کا یہ نوٹ ہے کہ "یہ خط انھوں نے کنڈمنڈ سیل جیل، فیض آباد سے اس وقت لکھا تھا جب چیف کورٹ لکھنؤ سے اپیل خارج ہوئی تھی اور سزائے موت کی تاریخ مقرر ہوئی تھی"۔ چونکہ چیف کورٹ سے اپیل خارج ہونے کے بعد ۱۶ را کتوبر پھانسی کے لیے تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خط اس تاریخ سے دو ایک روز قبل لکھا گیا تھا۔

بچائے وہ موت کے ہاتھوں ضرور مات کھائے گا۔ از آدم تا ایں دم کون رہا ہے یا کون باقی رہے گا۔ ایک خاندان کے اندر دس پانچ آدمی ہوتے ہیں، جس کا وقت پورا ہو جاتا ہے وہ کوچ کر جاتا ہے۔ بقیہ روتے دھوتے ہیں جو تقاضائے محبت ہے۔ مگر ان میں سے جانا ہر ایک کو ہے، کوئی جلد جائے گا کوئی بدیر۔ جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ قبل از وقت مر گیا وہ عمر ہی اتنی لے کر آیا تھا۔ اور باقی مصلحت خدا جانتا ہے۔ جس کو حکم اس کی جانب سے ہوتا ہے وہ لبیک کہتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ تمھارے دلوں کو رنج ہوگا، غم کروگے، مگر خدا کے ناشکرے نہ بننا، صبر کرنا اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا کہ خدا میرے اوپر رحم کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ میں تمھارے لیے صبر کی دعا کرتا ہوں۔ موت اسی بہانے تھی، سو آئے گی اور جو جو بھی لکھا ہے وہ پورا ہوگا۔ اس کے حکم میں مجالِ دم زدن نہیں۔ اسی کی امانت تھی، اسی کی طرف واپس جا رہی ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ اتنا تعلق اس نے پیدا کر دیا تھا، وہ اب رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

تم لوگوں کو کیا کیا لکھ کر سمجھاؤں۔ مجھ میں اتنی قابلیت ہے اور نہ میں عالم دین ہوں کہ مذہبی باتیں لکھوں یا احادیث و آیات لکھوں۔ بس اتنا جانتا ہوں اور اتنا ہی لکھنا چاہتا ہوں کہ سب فانی ہیں اور سب کو فنا ہے۔ سب مریں گے، نہ کوئی رہا ہے نہ رہے گا۔ اگر رہے گا تو وہ، اور بس! وہی خداوندِ قدوس رہے گا جس نے دنیا رچی ہے۔ ہم لوگ خدا کو مانتے ہیں متبع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو بس!

ہیں رضاکار تو ہم پر ہے بہر حال یہ فرض
شکر حق لب پہ رہے شکوۂ اعدا نہ کریں

مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا
فکر امروز ہی رکھیں، غم فردا نہ کریں

پس حکمِ خداوندی کے سامنے سر نیاز خم کردیں، اپنے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ روزِ جزا کا وہ مالک ہے، اس کا بھی غم نہ کریں کیوں کہ غلام ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

اے ماتم کنندگانِ اشفاق! صبر کرو اور دعا کرو کہ وہاں کی مصیبت آسان ہو۔ میرا تو یہ حال ہے ؎

بن کر میں رضاکار مہیائے قضا ہوں
آوازۂ حق بانگِ درا میرے لیے ہے
خوشنودی فجار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلید شہ کرب و بلا میرے لیے ہے

میری زندگی اتنی ہی تھی اب وہ نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ نہ تمھارا نالہ و بُکا ہی کام آسکتا ہے نہ آہ وزاری زندگی کا ایک لمحہ بڑھا سکتی ہے۔ ہاں تمھاری دعائیں میرے لیے وہاں کام آسکتی ہیں۔ پس صبر کرو اور دعا سے یاد کرو۔

میں نہیں جان سکتا کہ میری نعش تم لوگوں کو دی جائے گی یا نہیں؟ یوں تو جب جان نکل گئی، مٹی کا ڈھیر ہے، مگر پھر بھی مجھے تشویش ہے۔ خیر مردہ بدست زندہ کا مضمون ہے۔ زبردست جو چاہے سو کرے۔ اس کا ہر فعل درست ہے۔ خیر، میں اپنے دماغ کو اس خیال سے پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ جو بھی ہو، ہو! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تختہ دار پر کھڑا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں مگر میں مطمئن اور خوش ہوں کہ مالک کی مرضی ہی اس میں تھی۔

بڑا خوش قسمت ہے وہ انسان جو قربان گاہِ وطن پر قربان ہو جائے۔ گو کہ یہ فقرہ جس اسپرٹ کے ساتھ میں لکھ رہا ہوں وہ آپ لوگوں میں نہیں ہے۔ یوں آپ لوگوں کو تکلیف محسوس ہوگی۔ میری غزلیات جو مکان پر موجود ہوں گی وہ آج سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کو پیشین گوئی سمجھئے گا اور ویسا ہی ہونا تھا جو قلم سے نکلا۔ میرے سکون کی وجہ میری بے گناہی ہے۔ یقین رکھیے کہ اشفاق کا دامن انسانی خون کے دھبوں سے پاک وصاف ہے۔

اے میرے گھر میں آنے والے بچو! اور موجودہ چھوٹو! تم جب دنیا میں آو گے، میری کہانی سنو گے اور تصویر دیکھو گے، میری اس تحریر کو میرے دماغ کا اثر نہ سمجھنا۔ میں بالکل صحیح دماغ کا ہوں اور عقل ٹھیک کام کر رہی ہے۔ میرا مقصد آنے والے بچوں کے لیے لکھنا محض یوں ہے کہ وہ اپنے فرائض کو محسوس کریں اور میری یاد تازہ رکھیں۔

پیارے رضی وطفیل (۱) تمھارا چچا چند روز کے بعد اس دنیا میں نہیں رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے تم سب کو چھوڑ جائے گا۔ تم سے وہ کچھ نہیں چاہتا اور نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ خدا

---

(۱) رضی اللہ خاں ریاست اللہ خاں کے خورد سال صاحبزادے اور خلیل اللہ خاں، صفی اللہ خاں کے خورد سال صاحبزادے تھے جو اپنے چچا اشفاق اللہ خاں کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔

تمھارا مددگار رہے، تمھیں پروان چڑھائے۔ اعلیٰ تعلیم عطا فرمائے اور تمھیں کسی قابل بنائے، فخر خاندان کرے۔

کیے تھے کام ہم نے بھی جو کچھ بھی ہم سے بن آئے
یہ باتیں جب کی ہیں، آزاد تھے اور تھا شباب اپنا
مگر اب تو جو کچھ بھی ہیں امیدیں بس وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم، لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

تم کو بزرگوں کی رائے پر چلنا چاہیے اور تعلیم میں تن من دھن لگا دینا اور اپنے کو بہترین انسان ثابت کرنا۔ تم سے بس اتنی ہی خواہش ہے اور میری موت کا خیال رکھنا۔ مجھ پر وطن کی محبت کا الزام لگایا گیا ہے اور اسی لیے مجھے سزائے موت ملی۔ جب تم اس قابل ہو، میرے مقدمے کی کل کارروائی پڑھنا۔ زیادہ تم کو کیا لکھوں، میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔

تمام ہمدردان کو سلام علیک پہنچے۔ اور اس کے بعد عرض ہے کہ آپ لوگوں کا شکریہ جو ہمدردی اور مدد آپ لوگوں نے فرمائی۔ آپ لوگوں کو خدا جزائے خیر دے۔ جہاں تک آپ کی طاقت تھی آپ نے کیا۔ موت و زیست کا مسئلہ خدا کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں مجبوری تھی۔ ان لوگوں کو بھی سلام پہنچے جنھوں نے اپنی کمزوری سے یا خوف سے شرکت نہیں کی۔ خدا ان کا بھی بھلا کرے۔

اشفاق وارثی حسرتؔ

---

(۷)

کرپا شنکر ہجیلا ایڈوکیٹ کے نام

فیض آباد جیل، کال کوٹھری
۱۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء

جناب ہجیلا صاحب، تسلیمات!

آج ہی صبح مجھے گورنمنٹ کی طرف سے تار ملا ہے کہ پریوی کونسل نے میری اپیل

خارج کردی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اطلاع آپ کو بھی مل گئی ہو۔ میں مطمئن اور خوش و خرم ہوں۔ کیوں کہ میرے خالق کی خواہش یہی ہے کہ اب میرا رول ختم ہو۔ اب آپ جلد مجھ سے ملیے۔ آپ سے کچھ کہنا ہے۔

آپ کا اور بھارت ماں کا خادم

اشفاق

---

(۸)

والدہ ماجدہ کے نام

اشفاق اللہ خاں

زندانِ فیض آباد

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۷ء

مادرِ محترم کی خدمت میں اس کے مرنے والے بیٹے کا سلام پہنچے!

میری پیاری ماں!

میں بہت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ موت کو لبیک کہہ رہا ہوں ماں! تو یہ نہیں کہنا کہ جس کا جوان بیٹا مر رہا ہے وہ کیسے صبر کرے؟ ماں! تمھیں یاد ہو گا کہ تم بچپن میں کہا کرتی تھیں: ''اولاد خدا کی امانت ہے، وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے''۔

ایک میں ہی نہیں ہوں۔ ہزاروں نوجوان بیٹے اپنی مادرِ وطن پر قربان ہو چکے ہیں، ان کی بھی مائیں تھیں۔ انھوں نے صبر کیا، تم بھی صبر کا دامن تھام لینا۔ میری ماں! میری خطائیں معاف کرنا۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو صبر دے۔

آپ کا شہید ہونے والا بیٹا

اچھو

(۹)

والدہ ماجدہ کے نام

اززندانِ فیض آباد
پھانسی کی کوٹھری
۱۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء

دُکھیااور بوڑھی ماں کی خدمت میں اس کے مرتے ہوئے فرزند کا سلام پہنچے جو اسی ہفتے میں اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر اس ملکِ جاودانی کو جائے گا، جہاں اس سے پہلے بھی سب جا چکے ہیں اور ہر ذی روح اس کے بعد بھی جائے گا۔

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے

اس حقیقت سے آپ بھی بخوبی واقف ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ بوڑھی، سن رسیدہ، دُکھیا ماں کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے کہ اس کا جوان بیٹا نامراد دنیا سے اُٹھ جائے اور وہ اس کی نعش پر دو آنسو بھی نہ ڈال سکے یا اس کی مری ہوئی صورت دیکھ سکے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ حکم کس کا ہے؟ کیا دنیا کے کسی انسان کا حکم ہے؟ کیا کوئی مجھے اس کے حکم کے بغیر مار سکتا ہے؟ اس نے روزِ ازل سے ایسا ہی لکھا تھا کہ اشفاق تجھ کو پھانسی پر مرنا ہے اور جب تو مرے گا تو کوئی تیرے اعزہ واقرباء اور احباب میں سے نہ ہو گا۔ پس حکم خداوندی پورا ہو کر رہے گا اور ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

میں یہ لکھ دینا چاہتا ہوں کہ میں بہ اطمینان اور پُر سکون موت مر رہا ہوں۔ حکم خدا ایسا ہی تھا اور وہ اُٹل ہے اور وہ ہو کر رہے گا۔ موت سب کے لیے ہے اور سب مریں گے۔ دنیاوی تکالیف، مادی بندشیں اور انسانی قیود سب پیر کے روز ختم ہو جائیں گی۔ اور میری روح اس قفسِ عنصری سے آزاد ہو جائے گی اور اب دوسری منزل سامنے ہے، دیکھیے وہاں کیسی گزرے۔ یہ اس کی بخشش و کرم پر منحصر ہے۔ سفر در پیش ہے، زادِ راہ پاس نہیں۔ بس اسی کے

کرم کی امید پر خوش خوش جارہا ہوں۔

میں آپ سب کو الوداع کہتا ہوا اور خصوصاً آپ کو بقیہ زندگی میں وقف نوحہ وبکا کر کے اس طرف جارہا ہوں جہاں سے آیا تھا اور پھر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ وعدہ پورا کرنا ہے۔

آپ سب کے سامنے راہِ عمل کیا ہے؟ میں نے برا کیا یا اچھا؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری زندگی کی اتنی برسیں گمراہی، مصیبت، سیاہ کاری اور گناہوں میں گزریں۔ اس کے لیے میرے دوست، میرے عزیز و قریب، میرے بھائی اور مختصر یہ کہ ہر ہمدرد مسلمان دعائے مغفرت کرے اور آپ سب لوگ صبر کیجیے۔ صبر تلخ است ولیکن بَر شیریں دارد!

مجھے ڈر ہے کہ آپ گھبرا نہ جائیں اور یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ جس کی جوان اولاد مر جائے وہ کیسے صبر کرلے؟ تو سنیے، میری پیاری ماں! خدا نے مجھے آپ کے شکم سے پیدا کیا تھا۔ میری پیدائش پر خوشیاں منائی گئی تھیں، شکرانے ادا کیے گئے تھے اور قصہ مختصر یہ کہ مجھ کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے اس صلے میں خدا کو کیا دیا؟ اس نے آپ کو ایک انسان کی شکل میں اولاد دی۔ آپ سے جو بھی پوچھتا تھا، آپ یہی کہتی تھیں کہ خدا کا بندہ ہے، خدا نے دیا ہے، اسی کی امانت ہے اور میں امانت دار ہوں۔ پس اب مالک اپنے غلام کو طلب کرتا ہے۔ امانت رکھنے والا اپنی امانت طلب کرتا ہے، آپ خیانت نہ کریں۔ نہ آپ کی چیز تھی نہ آپ سے چھینی گئی۔ اتنے دن کے واسطے آپ کو دی گئی تھی کہ رکھو، بعد کو ہم واپس لیں گے۔ اب واپس لیے جارہا ہوں۔ پھر آپ کو کیا حق ہے کہ ردوقدح کریں؟

کیا آپ نے یہ سوچا تھا کہ مجھے موت کبھی نہ آئے گی؟ تم بھی جانتی تھیں اور مجھے بھی معلوم تھا کہ ہم تم سب مریں گے، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ یا تو مجھ کو رونا پڑتا تمہارے لیے یا تمھیں میرے لیے۔ لیکن اس کا منشا یہ ہے کہ بوڑھی ماں جوان اولاد کے لیے روئے گی اور بقیہ تین بھائی اپنے چھوٹے بھائی کا ماتم کریں گے۔ تو کیا آج اس دنیا میں کوئی اتنا طاقت والا ہے کہ اس خداوند قدوس کے احکام کو پلٹ دے؟ کوئی نہیں! اپنے خاندان ہی میں کتنی ایسی مائیں ہیں جو بڑھاپے میں جوان اولاد کا داغ کھائے بیٹھی ہیں۔ اور کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جو اپنی آنکھیں اپنے بھائی کے لیے سرخ کر چکے ہیں اور کتنی ہی بھاوجیں، بھتیجیاں، بھتیجے، بھانجیاں، بھانجے ہیں جو کہ اپنے بھائی، دیور، چچا اور ماموں کے لیے سینہ کوبی کر چکے ہیں۔

دنیا کا یہی دھندا ہے، دنیا نام ہی اس کا ہے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو زندگی کا فائدہ ہی کیا تھا۔

اگر رات نہ ہوتی تو دن میں لذت ہی کیا ہوتی؟ اگر غم نہ ہو تو شادی بمنزلہ غم ہے۔ غرض کہ دنیا ایک معجون مرکب ہے، جس میں سب ذائقے ہیں۔ عیش و مسرت، غم و اندوہ، آرام و تکلیف، غفلت و بیداری، نیکی و بدی، موت و زیست، غرض ہر چیز یہاں ملے گی۔ پس خوش قسمت ہے وہ جس نے اچھی باتیں قبول کیں اور برائیوں سے پرہیز کیا، غفلت پر ہوشیاری کو ترجیح دی اور معبودِ حقیقی کی یاد میں دل لگایا اور ہوشیار رہا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں نیکی کو قبول کیا اور بدی کو ٹھکرا دیا۔ ابدی آرام کی خاطر نفس پر تکلف برداشت کی اور عبادت میں مصروف رہا، موت کو پیش نظر رکھا اور زیست ہی میں سامانِ آخرت کو جمع کر لیا۔ عیش و مسرت میں پڑ کر غفلت نہیں کی اور پیش آنے والے غم و اندوہ کا کھٹکا محسوس کرتا رہا۔

پس جس نے ان باتوں کو اختیار کیا اور مصیبت و آرام کو من جانب اللہ تصور کیا اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا، مصائب و تکالیف پر صبر کیا اور کہا کہ یہ سب من جانب اللہ ہیں اور ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکو است

دوست کا دیا ہوا زہر ہلاہل بھی شہد مصفیٰ خیال کیا، اور صبر کیا، شکر کیا، پس اسے راضی کر لیا جو کونین کا مالک اور مشرق و مغرب کا رب ہے۔ کیا تم اس کی خواہش مند نہیں ہو کہ خدا جو تمھارا پیدا کرنے والا ہے اور جس کے سامنے تمھیں جانا ہے، اپنا دوست کہہ کر پکارے؟ دنیا اس کی متمنی ہے کہ وہ اپنا دوست کہے۔

آج موت کے سامنے بیٹھا ہوا اشفاق کچھ خواہش نہیں رکھتا۔ مگر ہاں! وہ کہہ دیں کہ "اشفاق میں تجھ سے راضی ہوں، تو میرا بندہ ہے اور میں نے تیری بندگی کو قبول کر لیا ہے"۔

وہ کہتا ہے:

"اے ایمان والو! مدد مانگو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے!" (سورۂ بقرہ : ۱۵۳)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

"(خوشخبری سنا دو، ان صبر کرنے والوں کو)، جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔ (ایضاً ۵۶-۵۵)

پھر فرماتا ہے :

"یہی ہیں جن پر برکات ہیں ان کے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ یہی لوگ ہدایت والے ہیں، ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

یہ قول آپ کو جناب باری تعالیٰ کے لکھ دیتے تھے۔اب سمجھنا آپ کا کام ہے۔

آپ کا صبر و شکر آپ کو اس کے دربار میں مقبول و مقرب کرے گا۔اور خدانخواستہ اگر آپ حد سے آگے بڑھ گئیں تو آپ خود سمجھ دار اور پڑھی لکھی ہیں۔ آپ کا نالہ و شیون، آہ وزاری، سینہ کوبی مجھ کو زندہ نہیں کر سکتی۔نہ موت سے بچا سکتی ہے۔ہاں صبر کرنا، کلمہ ودرود پڑھنا، اور بخشنا میرے لیے کچھ سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

پس میری اچھی ماں میری خطائیں معاف فرما کر مشغول بہ یادِ خدا ہو جاؤ۔ اس کی مرضی یہی تھی۔ اور کون ہے جو اس کے حکم کو ٹال سکے۔ میں نے آپ کو دکھ پہنچایا، آپ کا بڑھاپا برباد کیا، آپ کی زندگی ضیق میں ہوگئی۔ ہاں! ظاہراً اسباب میں سے ایک میں ہوں۔ مگر مولا کی مرضی اور اس کا حکم ہر بات میں پوشیدہ رہتا ہے۔ سمجھ دار ہر بات کو من جانب اللہ سمجھتے ہیں اور نا سمجھ انسانوں کی طرف خیال دوڑاتے ہیں۔

اس سے قبل ایک کارڈ فیصلے کے متعلق ملا ہوگا۔ کیسے مزے کی بات ہے کہ میں اپنے قلم سے اپنی موت کی خبر آپ کو بھیج رہا ہوں۔

میں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی اور وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ خیر مالک کی مرضی ہی نہ تھی۔ جس میں میرا مقصد بچوں کے لیے نصیحت کرنا تھا۔ خیر! ان کے لیے جو میدانِ عمل ہے اور جو سامنے آئے اس پر گامزن ہوں۔ مجھے جو لکھنا ہے تھوڑا تھوڑا سب کو لکھ دوں گا۔ سب اپنا اپنا مطلب نکال لیں۔ مجھے تو سب سے ضروری آپ کو لکھنا تھا اور یوں تو یہ مضمون واحد تصور کیا جائے۔ سبھوں سے صبر کی گزارش ہے۔ صبر ہی خوشی کی کنجی ہے۔ مجھے بوبو کی پریشانیوں کا بھی علم ہے اور آپ سب کی کوفت میں ایسے وقت میں اضافہ غم کا ہے۔ مگر مولیٰ کی مرضی ٹالی جا سکتی ہے؟ نہیں! وہ ہر صورت سے آزمائش کر رہا ہے۔ تم صبر کو ہاتھ سے نہ دو۔ جو دوست کی طرف سے خوشی و غم ملے، مسکراتے ہوئے چہرے اور مطمئن دل کے ساتھ قبول کرو کہ فلاح دینی و دنیوی حاصل کر سکو، میں کوشش کروں گا کہ یہ خط تم کو میری

موت سے پہلے ہی مل جائے تاکہ تمھارے دکھ میں کمی ہو جائے اور تم سوچ سکو کہ مرنے والا، کیا بات ہے کہ مرتے ہوئے بھی مطمئن اور خوش ہے۔

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے

آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک کون ایسا ہے جو مرا نہ ہو، جس نے بساطِ عالم پر زندگی کے مہرے بچھائے، موت کے ہاتھوں ضرور مات کھائی۔ پس اس کا غم بیکار ہے اور آنے والی اور ضرور آنے والی بات کے لیے پریشان ہونا سراسر غلطی ہے۔ اب رہی محبت، ڈاہ، موہ، پریم، یہ سب دنیاوی دھندے ہیں۔ خدا سے محبت کرو، اس کو پوجو، جو ہمیشہ زندہ و قائم رہے گا۔ تمھیں اپنی بقیہ زندگی میں کبھی بھی اس کے لیے رونا نہیں پڑے گا۔ بس اسی سے محبت کرو اور اسی کو سمجھو۔ عقلی دلایل، مذہبی مسائل، فلسفیانہ بحث دُکھے ہوئے دل پر نمک مرچ کا کام کرتے ہیں۔

میں خوب جانتا ہوں کہ آپ سوچیں گی کہ میں نے اپنی کرتوتوں سے آپ کا بڑھاپا خراب کیا اور بھائیوں اور دیگر اعزہ کی زندگی دُکھ کی زندگی بنادی۔ میں نے کیا کیا؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا حکم روزِ ازل سے ایسا ہی تھا سو ہو کر رہا۔ جو بات ہونے والی ہوتی ہے، اس کے اسباب پیشتر سے ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور جب اسباب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، بات پوری ہو جاتی ہے۔ پس میرے لیے یہ موت اور دن تھا سو مجھے ملا۔ اور تمھارے لیے دُکھ، بڑھاپے کا دھکّا اور سینہ کوبی لکھی تھی، وہ تمھیں مل رہی ہے۔ جو جس کے لیے اس نے مناسب سمجھا، وہ اسے تقسیم کر دیا۔ پس کون ہے جو شکوہ کرے اور لب شکایت کے واسطے کھولے۔

ہم رضا کار ہیں ہم پر ہے بہر حال یہ فرض
شکرِ حق لب پہ رہے شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا
فکرِ امروز ہی رکھیں، غمِ فردا نہ کریں

اس نے تم سب کو غم اٹھانے کے لیے منتخب کیا اور مجھے منصورِ وقت بنانے کے لیے چُن لیا۔ اگر تم کو گریۂ یعقوب عطا کیا تو مجھ کو سنتِ یوسفی ادا کرنے کے لیے پُکارا۔ اگر تم کو ماتم کناں مثلِ خاندانِ نبوی بنانا چاہا، بنادیا، تو مجھے متبع حسین شہید تیغ جفا کے خطاب سے نوازا۔ اس کی

شان نرالی، اس کی ادا انوکھی۔ وہ ہر جگہ نئے رنگ میں، ہر طرف نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ جو کچھ ہوا، جو ہو گا اور جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے اور ہو گا۔ کون ہے جو سر تابی کرے اور کون ہے جو اس کے حکم سے باہر جا سکے۔ بس اسی پر نظر رکھو اور صبر و قرار ہاتھ سے نہ دو۔ شکر کرو کہ اس کی امانت اسی کی طرف جا رہی ہے۔ صانع اپنے مصنوع کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ پھر تم کون تڑپنے والی ہو۔ اس کی چیز تھی، اسی کو اختیار ہے۔

صبر کرو، صبر اور بقیہ زندگی کا بیش بہا وقت میرے لیے رونے میں صرف نہ کرو بلکہ اس سفر کی تیاری میں لگاؤ جو ایک دن درپیش ہے۔ عبادت میں مغفرت ہے۔ گناہوں میں وقت نہ گزارو۔ یہی کام آئے گا، غفلت چھوڑو۔ اب اس کو پکڑو۔ دنیا فنا ہونے والی ہے اور تمھارا ابھی بڑھاپا ہے۔

اچھا، میری خطائیں معاف کرو اور مجھے اپنے حقوق سے سبک دوش کرو، تم کو خدا کی دین میں دیتا ہوں۔ وہ تمھیں نیک بی بی اور صابرہ بی بی بنائے۔ آمین!

بھاوجو اور بھائیو! الفراق بني وبينكم! تم آپس میں مل جل کر رہنا اور دُکھیا اور بد قسمت ماں کی خدمت میں لگی رہنا اور انھیں بقیہ زندگی کو سکون سے گزارنے کا موقع دینا۔ اگر تم لوگ ایسے ہی آپ میں شکوہ شکایت کرتے رہے اور شکر رنجی تمھارے دلوں میں رہی تو پھر کچھ لطف نہیں۔ آپس میں شیر و شکر بن کر رہنا اور جدا نہ ہونا۔ میری تو یہی خواہش ہے اور مجھے معافی دینا، خدا کی مرضی یہی تھی!

بھائیو، تم نے انتہائی کوشش کی لیکن موت اور خدا کا حکم ٹالے نہیں ٹلتا اور پورا ہو کر رہے گا۔ تم بھی مجبور ہو، صبر شکر کرنا۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ میں بتائے دیتا ہوں کہ میں ایک پُر سکون موت مر رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کون سا خیال مجھے مست اور خوش بنائے ہوئے ہے۔ دل اندر سے پھولا چلا آتا ہے۔ مجھے قطعی خیال نہیں گزرتا کہ مجھے پھانسی دی جائے گی۔ مریں گے تو سب ہی، کچھ میں ہی نہیں مر رہا ہوں۔ تم خدا پر نظر رکھو اور بجائے رونے دھونے کے میرے لیے ایصال ثواب میں لگے رہنا۔

زیادہ کیا لکھوں، خدا تم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مجھ گنہگار بندے کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ فقط!

اشفاق اللہ خاں وارثی

(۱۰)
نلنی دیدی[1] کے نام

پھانسی گھر
فیض آباد جیل
۱۶/دسمبر ۱۹۲۷ء

میری پیاری دیدی!

میں اب دوسری دنیا میں جارہا ہوں، جہاں دنیاوی مصیبتیں نہیں رہیں گی اور نہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے سنگرام (۲) کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جہاں نہ موت ہوگی نہ مرنے کا سوال ـــ دیدی! میں مرنے جارہا ہوں۔

جب کبھی میرے ساتھی بخشی رہاہوں، انھیں بتایئے گا کہ میں نے اطمینان اور خوشی سے زندگی کی آخری سانسیں پوری کی ہیں۔ اگلا سوموار میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ آپ کو موقع ملے تو آخری بار اپنے بھائی سے ملاقات کر جایئے گا۔ اگر موافق حالات نہ ہوں تو میں آپ سب لوگوں سے ہمیشہ کے لیے یہیں سے وداع ہوتا ہوں۔ میرا آخری پرنام قبول کیجیے اور رُخصتی کی اجازت دیجیے۔ آپ کو بعد میں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے موت کو کس طرح اپنایا ہے۔

خدا آپ سب کے ساتھ رہے۔ بابا (۳) کو آخری پرنام کہہ دیجیے۔ ساوتری، گور، کانو وغیرہ سب بچوں کو پیار۔ نیپال (۴) کو میرا نمسکار، سب بڑوں کو پرنام! میری یہ تمنا ہے کہ آپ سب کو ایک بار پھر دیکھوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ سب لوگ آجایئے!

---

(۱) نلنی دیدی سچیندر ناتھ بخشی کی بہن اور اشفاق اللہ خاں بخشی جی کے ساتھی تھے۔ اس لیے نلنی دیدی کو وہ بھی دیدی کہتے تھے اور انھیں اپنی بہن کی طرح مانتے تھے۔ اس وقت بخشی جیل میں تھے اور انھیں عمر قید بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ہو چکی تھی۔

(۲) سنگرام یعنی جہاد (۳) بابا بخشی جی کے والد محترم (۴) نیپال، بخشی جی کے چھوٹے بھائی

خدا کا خیال کیجیے اور میرے لیے دُکھی نہ ہوجیے۔ میرے بارے میں بخشی جی کو خبر کر دیجیے۔ میں آپ کو اپنی دیدی مانتا ہوں۔ آپ مجھے بھولیں گی نہیں، خوش رہیے! یہ بھی معلوم ہو کہ میں ویرگت پراپت کر رہا ہوں۔ سب کو پرنام!

آپ کا

اشفاق اللہ خاں وارثی

مہر

لیفٹننٹ کرنل آئی۔ ایم۔ ایس

سپرنٹنڈنٹ جیل، فیض آباد

باب ششم

پیغامات

(۱)
اپنے بھتیجوں کے نام

۱- آزادی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔
۲- وہ انسان جس کے دل میں آزادی کی لگن اور وطن کی محبت نہیں، وہ کنکر، پتھر سے بھی بدتر ہے۔
۳- سب سے بدبخت انسان وہ ہے جس نے غلام ملک میں پیدا ہو کر بھی آزادی کے لیے کبھی نہ سوچا۔ غلام پیدا ہوا، غلام پلا بڑھا اور غلام ہی مر گیا۔
۴- خدا کی اطاعت اور وطن کی محبت انسانیت کے اعلیٰ جوہر ہیں۔
۵- غلام ملک کا باشندہ خواہ کتنا ہی معزز، تعلیم یافتہ، خاندانی اور سرمایہ دار کیوں نہ ہو، اس کی عزت کہیں نہیں۔
۶- عزت آزادی میں ہے نہ کہ سرکاری خطابات اور مال و دولت میں۔
۷- آزادی کے لیے جیو اور آزادی کے لیے مرو۔
۸- ہمیشہ ارادوں پر قائم رہو۔ دوستوں کے ساتھ سچے بنے رہو، راز کو پوشیدہ رکھو۔ خوف و پریشانی سے نہ ڈرو، بہادر بن کر زندہ رہو اور بہادری کی موت مرو۔
۹- بہادر کو موت ایک بار آتی ہے مگر بزدل دن میں سو بار مرتا ہے (۱)۔

(اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی)

---

(۱) یہ اشفاق اللہ خاں شہید کا اپنے خورد سال بھتیجوں رضی اللہ خاں اور خلیل اللہ خاں کے نام آخری پیغام و نصیحت ہے۔ یہ ایک سچے مسلمان اور کھرے پٹھان کے حقیقی اسلامی جذبات (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس پیغام پر پنڈت بنارسی داس چترویدی نے یہ نوٹ تحریر کیا ہے :

"مثل مشہور ہے کہ فنکار کی تخلیق پر فنکار کی چھاپ ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا پیغام کے آئینے میں شہید وطن اشفاق اللہ خاں کی زندگی کے بھرپور گوشے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ وہ واقعی آزادی ہی کی خاطر جئے اور آزادی ہی کی خاطر مرے، ارادوں کو قائم رکھنے کا جہاں تک سوال ہے وہ ایک اٹل ارادے کے انسان تھے۔ انھوں نے راز کو ہمیشہ راز ہی رکھا۔ حالانکہ مسلم آفیسروں کے ذریعہ انھیں ہر قسم کا لالچ دیا گیا لیکن وہ ہمالہ کی طرح اَٹل رہے اور مرتے دم تک اپنی تحریک کے راز کو سینے سے لگائے رکھا اور اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ خوف، پریشانی، ناامیدی اور ہراس سے وہ کوسوں دور رہے۔ کیا مجال کہ پھانسی کے تختے پر پہنچنے کے بعد بھی ان کی ابرو پر بل آیا ہو۔ انھوں نے نہایت بے باکی، اعلیٰ حوصلگی اور ہمت مردانہ کے ساتھ اپنی جانِ شیریں کو جان آفریں کے سپرد کردیا اور ان کا مندرجہ ذیل آخری پیغام تو سنہری حرفوں میں لکھوا کر اپنی نشست گاہوں میں لگایا لیا جائے تو بڑی توانائی محسوس ہوگی :

'بہادر کو موت ایک بار آتی ہے مگر بزدل دن میں سو بار مرتا ہے'۔

بنارسی داس چترویدی

فیروز آباد"

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور قوم پرستانہ خیالات ہیں۔ یہ ایک محبِ وطن کے سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل افکار ہیں اور اگرچہ اس میں ان کے مخاطب ان کے بھتیجے ہیں۔ لیکن یہ ایسے بصائر و حکم ہیں جنھیں ہر نوجوان کو حق بین نظروں سے دیکھنا، گوشِ حقیقت نیوش سے سننا اور دل سے ان کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نیز ہر شخص کو انھیں اپنی زندگی کا شعار اور اپنی قومی سیرت کا کلاہِ افتخار بنالینا چاہیے۔ افسوس کہ دونوں بھتیجے چچا کی شہادت کے تھوڑے عرصہ بعد انتقال کرگئے۔

(۲)

پیغام گورکنارے[۱] سے

(برادرانِ وطن کے نام)

برادرانِ وطن کی خدمت میں ان کے اس بھائی کا سلام پہنچے جو ان کی اور عزت و ناموس وطن کی خاطر فیض آباد جیل میں قربان ہو گیا۔

آج جب کہ یہ پیغام میں برادرانِ وطن کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھ کو تین دن، چار راتیں اور گزارنے ہیں۔ اور پھر میں ہوں گا اور آغوشِ مادرِ وطن۔

ہم لوگوں پر جو چارج لگائے گئے تھے وہ اس صورت میں پبلک کے سامنے لائے گئے کہ بہت سے لوگ جو غیر تعلیم یافتہ یا حکومت کے دستر خوان کی ہڈیاں چچوڑنے والے تھے، ہمیں ڈاکو، خونی اور قاتل کے لقب سے پکارا کیے۔ میں آج اس پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا بھی خوش ہوں اور اپنے ان بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ البتہ کہوں گا۔

مر مٹا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سنا
آپ کی جان سے دور، آپسے شکوہ ہے مجھے

خیر یہ تمھارا فعل ہے کہ ہماری قربانیوں کو قبول نہ کرو اور یہ ہمارا فرض ہے کہ تم بار بار ٹھکراؤ اور ہم تمھارا ہی دم بھرتے جائیں۔

برادرانِ وطن! میں اس پاک اور مقدس وطن ہی کی قسم کھا کر کہوں گا کہ ہم ننگ و ناموس وطن پر قربان ہو گئے۔ کیا یہ شرم کی بات نہ تھی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ نت نئے مظالم ہو رہے ہیں اور غریب ہندوستانی ہر حصۂ ملک اور خطۂ دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے نہ کہیں ٹھکانا ہے اور نہ کوئی سہارا۔ قصہ مختصر یہ کہ ہمارا وطن بھی ہمارا نہیں ہے۔ ہم پر ٹیکسوں کی بھرمار، ہماری حالت کا روز بروز گرتے چلے جانا، تینتیس کروڑ بہادر ہندوستانی غیر مسلح، بھیڑ بکریوں کی مانند بنا دیئے گئے۔ ہمارے گورے آقا ہمیں ٹھوکریں

---

(۲) برادرانِ وطن کے نام اس پیغام کا عنوان انگریزی میں ان الفاظ میں تھا:

" A Massage from the srinks of grave".

ماریں تو ان سے باز پُرس نہ ہو۔ جنرل ڈائر اگر جلیانوالہ باغ کو نمونۂ حشر بنادیں، ہماری ماؤں کی بے عزتی کریں، ہمارے بوڑھے بزرگوں اور معصوم بچوں پر بم کے گولے اور مشین گنوں کی گولیاں برسائیں اور ہر نیا دن ہمارے لیے نئی مصیبت لے کر آئے اور پھر بھی ہم بادۂ غفلت میں مدہوش اور عیش و عشرت میں مست رہ کر ایامِ نوجوانی اور عہد شباب کو گزار دیں۔ اس لیے ہم نے یہ خیال کر کے کہ ؎

جنونِ حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے، نہ رہے

جو بھی کیا بھلا کیا، آج ہم ناکام رہے تو ڈاکو ہیں۔ اگر کامیاب ہوتے تو "محبِ وطن" کے پاک لقب سے پکارے جاتے۔ اور جو آج ہم پر جھوٹی گواہیاں دے گئے ہیں، ہمارے نام کے جیکارے لگاتے ؎

بہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسملؔ کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل کی

آہ! کیا ایسے دور میں زندگی پیاری خیال کی جاسکتی ہے جب کہ ہمارے ہی سیاسی گروہوں میں خلفشار مچا ہوا ہے؟ کوئی تبلیغ کا دلدادہ ہے تو کوئی شدھی کو باعث نجات سمجھ رہا ہے۔ مجھے تو رہ رہ کے غم و غصہ ان دماغوں اور عقلوں پر آرہا ہے جو کہ بہترین دماغ ہیں اور ماہرینِ سیاست ہیں۔ کاش کہ وہ آزادیٔ مصر کی جدوجہد، احرارِ مصر کے کارنامے اور برطانوی سیاسی چالیں اسٹڈی کرلیں اور پھر ہمارے ہندوستان کی موجودہ حالت سے مقابلہ و موازنہ کریں۔ کیا ہندوستان کی ٹھیک وہی حالت اس وقت نہیں ہے؟ گورنمنٹ کے خفیہ ایجنٹ مذہبی بنیادوں پر پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد کسی کے بھی مذہب کی حفاظت یا ترقی نہیں ہے بلکہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے اور نہ موقع کہ سب کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا جو ایامِ فراری میں اور اس کے بعد معلوم ہوا ہے۔ یہاں تک کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ مولوی نعمت اللہ قادیانی کوئی تھا جو کابل میں سنگسار کیا گیا۔ وہ برٹش ایجنٹ تھا جس کے پاس ہمارے کرم فرما تصدق حسین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی گورنمنٹ آف انڈیا بحکم گورنمنٹ ایک مرتبہ ایک پیغام لے کر گئے تھے۔ مگر بیدار مغز حکومت کابل نے جلد علاج کر دیا اور مرض کو پھیلنے نہ دیا۔ میں اپنے ہندو اور مسلمان بھائیوں کو

بتادینا چاہتا ہوں کہ یہ سب ڈھونگ ہے جو سی آئی ڈی کے خفیہ خزانے کے روپے سے رَچایا گیا ہے۔

میں مر رہا ہوں۔ اور وطن پر مر رہا ہوں۔ میرا فرض ہے کہ ہر نیک و بد بات اپنے بھائیوں تک پہنچادوں۔ ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے۔ ملک کے بڑے بڑے لوگ اس سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ پس عوام کو آنکھیں کھول کر ان کا اتباع کرنا چاہیے۔

بھائیو! تمھاری خانہ جنگی تمھاری آپس کی پھوٹ، تم دونوں میں سے کسی کے لیے بھی سود مند ثابت نہ ہو گی۔ یہ غیر ممکن ہے کہ سات کروڑ مسلمان شدھ کر لیے جائیں اور اسی طرح یہ بھی مہمل سی بات ہے کہ بائیس کروڑ ہندو مسلمان بنا لیے جائیں۔ مگر ہاں! یہ آسان ہے اور بالکل آسان ہے کہ یہ سب مل کر غلامی کا طوق گلے میں ڈالے رہیں۔

اے وہ قوم جس کا کوئی جھنڈا نہیں! اے وہ کہ تیرا وطن، تیرا وطن نہیں! اے وہ کہ تو دوسروں کی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے رحم کی درخواست پر نظر رکھنے والی بے کس قوم! یہ تیری اپنی غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج تو غلام ہے، اور پھر بھی وہی غلطیاں کر رہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تو غلامی کا دھبا چھوڑ جائے گی۔ اور تیرے بعد جو بھی سرزمین ہند پر قدم رکھے گا، غلامی میں رکھے گا اور غلام مرے گا۔

اے خداوندِ قدوس! کیا کوئی ایسا سویرا نہیں آئے گا کہ تیرا آفتاب آزاد ہندوستان میں چمکے اور فضائے ہند آزادی کے نعروں سے گونج اٹھے!

کانگریس والے ہوں کہ سوراجسٹ، تبلیغ والے ہوں کہ شدھی والے، کمیونسٹ ہوں یا ریولیوشنری، اکالی ہوں کہ بنگالی، میرا پیغام ہر فرزند وطن کو پہنچے۔ میں ہر اس شخص کو اس کی عزت و مذہب کا واسطہ دیتا ہوں اور اگر وہ مذہب کا قائل نہیں ہے تو اس کے ضمیر سے یا جس عقیدے کو بھی وہ جانتا ہو، اس کے واسطے سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم کاکوری کیس کے مر جانے والے نوجوانوں پر ترس کھاؤ اور پھر ہندوستان ۲۰ء، ۲۱ء والا ہندوستان بنادو! پھر احمد آباد کانگریس کا سا اتحاد و اتفاق سامنے ہو۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو اور مکمل آزادی کا جلد از جلد اعلان کر کے ان گورے آقاؤں کو بتادو کہ یہ کالے اب کینچلی اتار چکے، اب یہ کسی منتر سے رام نہ ہوں گے۔

تبلیغ اور شدھی والو! خدارا آنکھیں کھولو! دیکھو تم کہاں تھے اور کہاں پہنچ گئے؟ اپنی

اپنی شان ختم کرو، سوچو تو! مذہب میں زبردستی اور اختلاف رائے پر جنگ۔ ایک کام نامکمل چھوڑ کر دوسری جانب رجوع ہو گئے۔ آج کون ایسا ہندو اور مسلمان ہے جو مذہبی آزادی اتنی رکھتا ہوں، جتنا اسے حق ہے! کیا غلام قوم کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟ تم اپنے مذہب کا سدھار کیا کر سکتے ہو؟ تم خدا کی عبادت پر سکون طریقے پر کرو، ایشور کا دھیان خاموشی سے کرو اور دونوں مل کر اس سفید بھوت کو منتر تنتر سے، جنتر سے اتار بھگاؤ۔ اسی کی یہ ساری کارروائی ہے۔ جب یہ بھوت اُتر جائے گا، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ آؤ، ہماری بھی سنو! پہلے ہندوستان کو آزاد کرالو، پھر کچھ اور سوچنا۔ خدا نے جس کے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے وہ اسی پر رہے گا۔ تم کسی کو ہٹا نہیں سکتے۔ آپس میں مل جل کر رہو اور متحد ہو جاؤ! سارے ہندوستان کی بدبختی کا بار تمھاری گردن پر ہے۔ غلامی کا باعث تم ہو۔

کمیونسٹ گروپ سے اشفاق کی گزارش ہے کہ تم ایک غیر ملکی تحریک کو لے کر ہندوستان آئے ہو۔ اس لیے اپنے آپ کو غیر ملکی ہی تصور کرتے ہو۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اپنے اپنے اصل اور ہندوستانی رنگ میں آجاؤ! دیس کے لیے جیو، دیس کے لیے مرو! میں تم سے کافی طور پر متفق ہوں اور کہوں گا کہ میرا دل ہمیشہ غریب کسانوں اور دکھیا مزدوروں کے لیے دکھی رہا ہے۔ اپنے ایام فراری میں بھی اکثر ان کی حالت دیکھ کر میں رویا ہوں۔ کیوں کہ مجھے ان کے ساتھ دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔

مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ میرا بس چلے تو میں دنیا کی ہر ممکن چیز ان کے لیے وقف کر دوں۔ ہمارے شہروں کی رونق، ان کے دم سے ہے۔ ہمارے کارخانے ان کے دم سے آباد اور کام کر رہے ہیں۔ ہمارے پمپوں سے ان کے ہاتھ پانی نکالتے ہیں۔ غرضے کہ دنیا کا ہر کام انھیں کے دم سے ہوا کرتا ہے۔ غریب کسان برسات کی موسلا دھار بارش میں اور جیٹھ بیساکھ کی تپتی ہوئی دوپہر میں کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں اور جنگلوں میں منڈلاتے ہوئے ہماری خوراک اور عیش و راحت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ بالکل سچ ہے کہ وہ خود دکھ اور تکلیف میں اور مفلوک الحال رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ پیدا کرتے ہیں، اس میں ان کا حصہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ دُکھی اور مفلوک الحال رہتے ہیں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ ان تمام باتوں کے ذمہ دار ہمارے گورے آقا اور ان کا نظام ہے۔ مگر اس کا علاج کیا ہے کہ وہ اس حالت میں آجائیں کہ وہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ کیا ہیں۔ اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تم ان جیسی وضع

قطع اختیار کرو اور جنٹلمینی چھوڑ کر دیہات کے چکر لگاؤ، کارخانوں میں ڈیرے ڈالو اور ان کی حالت کی اسٹڈی کرو اور پھر ان میں احساس پیدا کرو کہ ان کی اہمیت کیا ہے؟

تم ''کیتھرائن — گرانڈ مدر آف رشا'' کی سوانح عمری پڑھو اور وہاں کے نوجوانوں کی قربانیاں دیکھو۔ تم کالر، ٹائی اور عمدہ سوٹ پہن کر لیڈر ضرور بن سکتے ہو، مگر کسانوں اور مزدوروں کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ تم دیگر پولٹیکل پارٹیوں سے متحد ہو کر کام کرو اور مادہ پرستی سے کنارہ کشی اختیار کر لو کہ یہ فضول ہے اور تمھیں دوسری جماعتوں سے الگ کیے ہوئے ہے۔ میرے دل میں تمھاری عزت ہے اور میں مرتے ہوئے بھی تمھارے سیاسی مقاصد سے بالکل متفق ہوں۔ میں ہندوستان کی ایسی آزادی کا خواہش مند تھا، جس میں غریب خوشی اور آرام سے رہتے اور سب برابر ہوتے۔ خدا میرے بعد وہ دن جلد لائے جب کہ چھتہ منزل لکھنؤ میں عبداللہ لوکو ورکشاپ کے مستری، دھنیا چمار اور کسان بھی مسٹر خلیق الزماں، جگت نرائن اور نواب صاحب محمود آباد کے برابر کرسی پر بیٹھے نظر آئیں!

میرے کامریڈو، میرے ریولیوشنری بھائیو! تم سے میں کیا کہوں اور تم کو میں کیا لکھوں۔ کیا تمھارے لیے یہ کچھ کم مسرت کی بات ہوگی، جب تم سنو گے کہ تمھارا ایک بھائی ہنستا ہوا پھانسی پر چڑھ گیا اور وہ مرتے مرتے خوش تھا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ جو اسپرٹ تمھارا طبقہ رکھتا ہے، مجھ کو بھی اس پر فخر ہے اور اب بہت زیادہ فخر ہے کہ ایک سچا ریوولیوشنری ہوتے ہوئے جان دے رہا ہوں۔ اپنا پیغام تم تک پہنچانا فرض تھا۔ میں خوش ہوں، مسرور ہوں اور اس سپاہی کی طرح جو فائرنگ لائن پر ہنستا ہوا جا رہا ہو اور خندقوں میں بیٹھا ہوا گا رہا ہو''۔

جان کو محو غم تیاری کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر
اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

ہزار دکھ کیوں نہ آئیں، بحر ذخار درمیان میں موجیں ماریں، آتشیں پہاڑ درمیان میں کیوں نہ حائل ہو جائیں۔ مگر اے آزادی کے شیرو! اپنے گرم گرم خون کو ماتر بھومی پر چھڑکتے ہوئے اور اپنی جانوں کو ماتر ویدی پر قربان کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلو جاؤ۔ آگے

بڑھتے چلے جاؤ! کیا تم خوش نہ ہو گے، جب تم کو معلوم ہو گا کہ تم ہنستے ہوئے مر گئے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرا وزن کم ہو گیا ہے اور بہت کم ہو گیا ہے اور وہ میرے کم اور خراب کھانے کی وجہ سے ہو گیا ہے، کسی ڈر یا دہشت سے نہیں ہوا۔ اور میں کہنائی لال دت کی طرح وزن نہیں بڑھا سکا۔ میں بہت خوش ہوں اور بہت خوش ہوں۔ کیا میرے لیے اس سے بڑھ کر بھی کوئی عزت ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلا اور اوّل مسلمان میں ہوں جو آزادیٔ وطن کی خاطر پھانسی پر چڑھ رہا ہے۔

میرے بھائیو! میرا سلام لو اور اب اس نامکمل کام کو جو ہم سے باقی رہ گیا ہے، تم پورا کرنا۔

اٹھو اٹھو! سو رہے ہو ناحق پیامِ بانگِ جرس تو سن لو
بڑھو کہ کوئی بلا رہا ہے، نشانِ منزل دکھا دکھا کر!

زیادہ کیا لکھوں، سلام لو۔ کمر ہمت باندھ لو اور میدانِ عمل میں آن پہنچو۔ خدا تمھارے ساتھ ہو۔

میری ملکی جماعت سیاسی اور اس کے لیڈر میرا سلام قبول کریں۔ تم ہم لوگوں کو اس نظر سے نہ دیکھنا جس نظر سے دشمنانِ وطن اور خائنینِ قوم دیکھتے تھے۔ نہ ہم ڈاکو تھے نہ قاتل۔

کہاں گیا کوہِ نور ہیرا! کدھر گئی ہائے میری دولت
وہ سب کا سب لوٹ کر بھی الٹا ہمیں کو ڈاکو بنا رہے ہیں

ہمیں کو دن دہاڑے لوٹا، پھر بھی ہمیں ڈاکو ہیں۔ ہمارے ہی بھائی بہنوں، بچوں کو جلیانوالہ باغ میں بھون ڈالا۔ "Couns Bruts" فیصلے میں لکھا جاتا ہے، اگر ہم ایسے ہیں تو وہ کیسے ہیں اور کس خطاب سے پکارے جانے کے قابل ہیں جنھوں نے ہندوستان کا سہاگ لوٹ لیا؟ جنھوں نے لاکھوں بہادروں کو اپنی غرض کے لیے میسوپوٹامیہ اور فرانس کے میدان میں سلوادیا۔ خونخوار ظالم درندے وہ ہیں یا ہم؟ ہم بے بس تھے، کمزور تھے، سب کچھ سن لیا اور یہ اے وطنی بھائیو! تم نے سنوایا۔ آؤ! پھر متحد ہو جاؤ، پھر میدانِ عمل میں کود پڑو اور مکمل آزادی کا اعلان کر دو!

اچھا! اب میں رُخصت ہوتا ہوں اور ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتا ہوں۔ خدا تمھارے ساتھ ہو اور فضائے ہند پر آزادی کا جھنڈا لہرائے۔ میرے پاس نہ وہ طاقت ہے کہ ہمالہ کی

چوٹی پر پہنچ کر ایک ایسی آواز نکالوں جو ہر شخص کو بیدار کر دے اور نہ وہ اسباب ہیں کہ جس سے میں تمھارے دل پھر مشتعل کر دوں کہ تم اسی جوش سے آگے بڑھ کر کھڑے ہو جاؤ جیسے ۲۰ء، ۲۱ء میں تھے۔ میں چند سطور کے بعد رخصت ہوتا ہوں۔

"To every man upon this earth death cometh soon or late but how can a man die better than facing fearful odds for the Ashes of his fathers and the Tamples of his God".

بعد کو میں اپنے ان بھائیوں سے شکریے کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں جنھوں نے ہماری مدد ظاہر طور پر کی یا پوشیدہ طور پر۔ اور انھیں یقین دلاؤں گا کہ اشفاق آخر دم تک سچا رہا، اور خوش خوش مر گیا، خیانتِ وطنی کا اس پر کوئی جرم نہیں لگایا جا سکتا۔

وطنی بھائیوں سے گزارش ہے کہ وہ میرے بھائیوں کو میرے بعد وقتِ ضرورت نہ بھولیں اور ان کی مدد کریں اور ان کا خیال رکھیں۔

وطن پر مرمٹنے والا
اشفاق وارثی حسرت
فیض آباد جیل

میری تحریر میرے وطنی بھائیوں تک پہنچ جائے خواہ ودیار تھی جی اسے اخبار کے ذریعے سے یا انگریزی، ہندی اور اردو میں چھپوا کر کانگریس کے سیشن کے ایام میں تقسیم کرادیں، مشکور ہوں گا۔ میرا اسلام قبول کریں۔ اور میرے بھائیوں کو نہ وہ کبھی بھولیں اور نہ میرے وطنی بھائی فراموش کریں۔ الوداع!

اشفاق وارثی حسرت
فیض آباد جیل
۱۶؍ دسمبر ۱۹۲۷ء

---

(۳)

چند یادگار جملے

اشفاق اللہ خاں شہید کے افکار کی یہ چند سطریں ان کے جیل کے افکار و کلام کی یادگار ہیں جو انھوں نے ایک پرچے پر تحریر فرمائی تھیں۔ اس میں بظاہر ان کا کوئی خاص مخاطب نہیں ہے۔

۱- وہ غریب اور مفلس شخص خداوند کریم اور قوم کی نگاہ میں ہزار تاجداروں سے زیادہ مقبول و باعزت ہے جو خدمتِ وطن کے لیے زندہ رہا اور اس نے آزادی کے لیے سانس لی۔

۲- وطن پرستی کا جذبہ جس قدر ترقی کرتا ہے اسی قدر آزمائش اور مصیبت کی پکار اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اغیار کی جانب سے تخویف و تہدید اور ترغیب و تحریص کے صدہا جال تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن سچا محبّ وطن بروقت امتحان پر کامیاب ہی اترتا ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اپنا مقصد زندگی آزادیٔ وطن قرار دے لیا اور قابل پرستش ہیں وہ مائیں جنھوں نے ایسے بچے پیدا کیے۔

(اشفاق)

باب ہفتم

کلام

غزل

اے ماتر بھومی تیری سیوا کیا کروں گا
مشکل ہزار آئیں ہر گز نہ میں ڈروں گا
نشچے یہ کر چکا ہوں سندیہہ کچھ نہیں ہے
تیرے لیے جیوں گا تیرے لیے مروں گا
پھانسی ملے مجھے یا ہو جنم قید میری
بیڑی بجا بجا کر تیرا بھجن کروں گا
پھٹا یہ مونج کا پھر، پھولوں کی سیج ہو گی
اس کو بچھا کے تیری جب گود میں پڑوں گا
چکّی کی ہو مشقت یا رام بانس کی ہو
سب کچھ میں تیری خاطر ماتا کیا کروں گا

سچیند رناتھ بخشی اس غزل کی شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں :

"مقدمہ کی سماعت ملتوی ہو چکی تھی۔ فیصلے کے دن سے پہلی رات کو کھانے پینے کے بعد اشفاق نے طے کیا کہ کل کچہری میں گانے کے لیے کوئی نئی غزل یا گیت کہا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایک گیت لکھا جس کا کچھ حصہ ہنوز مجھے یاد ہے"!

اس کے بعد انھوں نے اس غزل کے تین مصرعے لکھے ہیں۔ مقدمہ کا فیصلہ چوں کہ ۱۳؍جولائی کو سنایا گیا تھا۔ اس لیے اس کی تالیف کی تاریخ بھی متعین ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ غزل ۱۲؍جولائی کی شام کو کہی گئی تھی۔

غزل

خیال آتا ہے جس دم دل میں چبھتا ہے سناں ہو کر
کہ کیوں ہے قبضۂ اغیار میں ہندوستاں ہو کر
شہیدانِ وطن کا خون اک دن رنگ لائے گا
چمن میں پھوٹ کر نکلے گا برگِ ارغواں ہو کر
فقط دار و رسن ہی کامیابی کا ذریعہ ہے
مقاصد تک یہ پہنچائے گی ہم کو نردباں ہو کر
نہیں واقف ہے مادر اور پدر اس امر شدنی سے
کہ آفت میں پڑیں گے ان کے بچے نوجواں ہو کر
ستالے اے فلک! مجھ کو جہاں تک تیرا جی چاہے
ستم پرور ستم جھیلوں گا میں شیر زماں ہو کر
کروں میں انقلاب دہر کا شکوہ معاذ اللہ
ہے تف مجھ پر ڈروں گر جیل سے میں نوجواں ہو کر
دہلتا ہے کلیجہ دشمنوں کا دیکھ کر حسرت
چلا کرتے ہیں بیڑی پہن کر، جب شاداں ہو کر

(L.D.J) (۱)
(لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل)

---

(۱) اس غزل کے خاتمہ پر ''ایل۔ڈی۔جے'' انگریزی حروف جو اشفاق اللہ خاں کے قلم سے ہیں، اس سے اس غزل کا عہدِ تصنیف متعین ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ غزل انھوں نے ''لکھنؤ سنٹرل جیل'' میں لکھی تھی۔

غزل

رنگت وہ اب کہاں ہے نسرین ونسترن میں
اُجڑا ہوا پڑا ہے، کیا خاک ہے وطن میں
کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں
اے پختہ کار الفت ہشیار ڈگ نہ جانا
معراجِ عاشقاں ہے، اس دار اور رسن میں
تھا نعرۂ انا الحق اور دعویِ محبت
رکھا ہوا تھا اور کیا منصور و کوہکن میں
موت اور زندگی ہے دنیا کا اِک تماشا
فرماں کرشن کا تھا ارجن کو بیچ رَن میں
جس نے ہلا دیا ہے دنیا کو ایک پل میں
افسوس کیوں نہیں ہے وہ روح اب وطن میں
اے خائنینِ ملت یہ خوب یاد رکھو
ہیں بوس اور کھنائی اب بھی بہت وطن میں
صیاد ظلم پیشہ آیا ہے جب سے حسرت
ہیں بلبلیں قفس میں، زاغ وزغن چمن میں!

(کنڈ منڈ سیل، فیض آباد جیل)

غزل

سنائیں غم کی کسے کہانی ہمیں تو اپنے ستا رہے ہیں
ہمیشہ صبح و مسا وہ دل پر ستم کے خنجر چلا رہے ہیں (۱)
نہ کوئی انگلش، نہ کوئی جرمن، نہ کوئی رشین، نہ کوئی ٹرکی
مٹانے والے ہیں اپنے ہندی، جو آج ہم کو مٹا رہے ہیں
کہاں گیا کوہِ نور ہیرا! کدھر گئی ہائے میری دولت
وہ سب کا سب لوٹ کر کے الٹا ہمیں کو ڈاکو بتا رہے ہیں
جسے فنا وہ سمجھ رہے ہیں بقا کا ہے راز اسی میں مضمر
نہیں مٹانے سے مٹ سکیں گے وہ لاکھ ہم کو مٹا رہے ہیں
جو ہے حکومت وہ مدعی ہے جو اپنے بھائی ہیں وہ ہیں دشمن
غضب میں جان اپنی آگئی ہے، قضا کے پہلو میں جا رہے ہیں
چلو چلو یارو رنگِ تھیٹر دکھائیں تم کو وہاں پہ لبرل
جو چند ٹکڑوں پہ سیم و زر کے نیا تماشا دکھا رہے ہیں
خموش حسرتؔ، خموش حسرتؔ اگر ہے جذبہ وطن کا دل میں
سزا کو پہنچیں گے اپنی بیشک جو آج ہم کو پھنسا رہے ہیں

---

(۱) اشفاق شہید نے یہ غزل لکھنؤ جیل میں کہی تھی اور سچیند رناتھ بخشی کے بقول، شاعر نے یہ غزل پنڈت جگت نرائن مُلا کے کردار سے متاثر ہو کر کہی تھی جو ان کے مقدمے میں سرکاری وکیل تھے اور پانچ سو روپے روزانہ لے کر محبِّ وطن انقلابیوں کے خلاف استغاثہ کی پیروی کر رہے تھے۔ مقدمہ کی کارروائی رنگ تھیٹر میں ہو رہی تھی۔ چھٹے شعر میں رنگ تھیٹر کا نام اسی سلسلے میں آیا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں مُلا صاحب کے کردار اور ان کے محنتانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غزل

گردن اب ہاتھ سے اپنے ہی کٹانی ہے ہمیں
مادرِ ہند پہ یہ بھینٹ چڑھانی ہے ہمیں
کس طرح مرتے ہیں احرارِ وطن بھارت پر
سارے عالم کو یہی بات دکھانی ہے ہمیں
بحر ذخارِ حوادث ہے تو ڈر کیا حسرت
قوم کی ناؤ کنارے سے لگانی ہے ہمیں (۱)

اپنے ہی ہاتھوں سے سر اپنا کٹانا ہے ہمیں
مادرِ ہند پہ یہ بھینٹ چڑھانا ہے ہمیں
مثل پروانہ کے رکھتے نہیں کچھ مال و زر
اک فقط جان ہے وہ تجھ پہ مٹانا ہے ہمیں
کس طرح مرتے ہیں احرار وطن بھارت پر
یہ تماشا ہے جو دنیا کو دکھانا ہے ہمیں
بحر ذخار حوادث ہے تو ڈر کیا حسرت
قوم کی ناؤ کنارے سے لگانا ہے ہمیں!

نوٹ : غزل کے پہلے تین شعر "یادگار اشفاق" میں اسی طرح آئے۔ قلمی مسودہ میں ترمیم واضافہ کے ساتھ آخری چار شعر ہیں۔

غزل

☆ بہار آئی، ہوئی شورشِ جنونِ فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر کرنا تو مرے جیب و گریباں کی
☆ صحیح جذباتِ حرّیت کہیں میٹے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی
☆ وہ گلشن جو کبھی آباد تھا گزرے زمانے میں
میں شاخِ خشک ہوں ہاں ہاں اسی اُجڑے گلستاں کی
☆ نہیں تم سے شکایت ہم صفیرانِ چمن مجھ کو
مری تقدیر ہی میں تھا قفس اور قیدِ زنداں کی
کرو ضبط محبت گر تمھیں دعوائے الفت ہے
خموشی صاف بتلاتی ہے یہ تصویرِ جاناں کی
یوں ہی لکھا تھا قسمت میں چمن پیرائے عالم نے
کہ فصلِ گل میں گلشن چھوٹ کر ہے قیدِ زنداں کی
☆ زمین دشمن، زماں دشمن جو اپنے تھے پرائے ہیں
سنوگے داستاں کیا تم مرے حالِ پریشاں کی
☆ یہ جھگڑے اور بکھیڑے میٹ کر آپس میں مل جاؤ
یہ تفریق عبث ہے تم میں ہندو اور مسلماں کی
☆ سبھی سامانِ عشرت تھے، مزے سے اپنی کٹتی تھی
وطن کے عشق نے ہم کو ہوا کھلوائی زنداں کی
خدا واقف ہے جیسی بھی گزرتی ہے، گزرتی ہے
سنو مت داستاں اے یار تم بیمارِ ہجراں کی

مثالِ قیس دیوانہ کسی لیلیٰ کی خاطر میں
مہینوں ٹھوکریں کھایا کیا کوہ و بیاباں کی
☆ بحمد اللہ چمک اٹھا ستارہ میری قسمت کا
کہ تقلیدِ حقیقی کی عطا شاہِ شہیداں کی
☆ ادھر خوفِ خزاں ہے، آشیاں کا ڈر، ادھر دل کو
ہمیں یکساں ہے تفریحِ چمن اور قیدِ زنداں کی
جبہ سائی درِ حضرتؐ کی حسرت اپنا ایماں ہے
مبارک حضرتِ واعظ کو خواہش باغِ رضواں کی

نوٹ : اس غزل کے اشعار نمبر ۱ تا ۴، ۷ تا ۹ اور ۱۲، ۱۳ پر نشان (☆) لگا ہوا ہے اور غزل کے خاتمے پر شہید مرحوم نے انگریزی میں لکھا ہے :

"Marked verses written in December 1925."

اس سے ان اشعار کا زمانۂ تصنیف معلوم ہو جاتا ہے۔ گویا کہ یہ اشعار ان کے زمانۂ فرار کی یادگار ہیں۔ اسی زمانے میں ان کی گرفتاری کے لیے وارنٹ نکل چکا تھا اور وہ شاہ جہاں پور سے دور کسی جگہ فرار کی زندگی کے شب و روز گزار رہے تھے۔ اس غزل پر سنہ کی صراحت کے بغیر تاریخ ۹/۹ بھی پڑی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقیہ اشعار انھوں نے ۹ر ستمبر کو لکھے ہوں گے۔ یعنی اس سے اگلے سال ۱۹۲۶ء میں یا ۱۹۲۷ء میں۔

۱۹۳۰ء میں یہ غزل ماہنامہ "کبرتی" امرتسر میں شائع ہوئی تھی اور نتیجتاً کبرتی کا یہ پرچہ ضبط کر لیا گیا تھا۔ "کبرتی" سے یہ غزل "ضبط شدہ نظمیں" نامی مجموعے میں نقل کی گئی ہے۔ لیکن "کبرتی" میں شاید اس کے صرف نشان زدہ (☆) نو۹ شعر چھپے تھے۔ اس لیے کہ مذکورۃ الصدر مجموعے میں یہی نو۹ شعر ہیں۔

تضمین بہ زمانۂ فرار

خدایا! دیکھ لے ہم کیسے خوار ہو کے چلے[1]
وطن کے نام پہ گویا نثار ہو کے چلے
خراب و خستہ و زار و نزار ہو کے چلے
وطن سے آہ! غریب الدیار ہو کے چلے
"نشانۂ ستمِ صد ہزار ہو کے چلے"

معاف ہو یہ مری گفتگوے بے تاثیر[2]
مقدرات میں چلتی نہیں کوئی تدبیر
ہماری طرح سے ہیں اور بھی کئی دلگیر
"پھرائے دیکھیے ہم کو کہا کہاں تقدیر"
"اسیر گردشِ لیل و نہار ہو کے چلے"

ترے ہی واسطے عالم میں ہو گئے بدنام
ترے سوا نہیں رکھتے کسی سے ہم کچھ کام
ترے ہی نام کو جپتے رہے ہیں صبح و شام[3]
"وطن نہ دے ہمیں ترکِ وفا کا تو الزام"
"کہ آبرو پہ تری ہم نثار ہو کے چلے"

---

[1] یہ مصرع قلمی مسودے میں اس طرح ہے ع "ترے ہی نام پہ پیارے نثار ہو کے چلے"
[2] قلمی مسودے میں یہ مصرع اس طرح ہے ع "جناب معاف ہو یہ گفتگوے بے تاثیر"
[3] یہ مصرع بھی قلمی مسودے میں اس طرح ہے ع "ترے ہی نام کو جپتے رہے ہیں ہم صبح اور شام"

زبان حال سے اشفاق کی تربت یہ کہتی ہے
محبانِ وطن نے کیوں ہمیں دل سے بھلایا ہے
بہت افسوس ہوتا ہے، بہت تکلیف ہوتی ہے
شہید اشفاق کی تربت ہے اور دھوپوں کا سایا ہے
جو قرباں گاہِ بھارت پر ہوا قربان ہنس ہنس کر
نہ بھولا تھا تمھیں جو تم نے کیوں اس کو بھلایا ہے

ہم ستم لاکھ سہیں شایقِ بیداد رہیں
آہ تھامے ہوئے، روکے ہوئے فریاد رہیں
ہم رہیں یا نہ رہیں، ایسے رہیں یاد رہیں
اس کی پروا ہے کسے، شاد کہ ناشاد رہیں
ہڈیاں رزقِ ہماں بن کے نہ برباد رہیں
گھل کے مٹی میں ملیں کھاد بنیں یاد رہیں

شہیدوں کے مزاروں پر جڑیں گے ہر برس میلے
وطن پہ مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا
بہت ہی جلد ٹوٹیں گی غلامی کی یہ زنجیریں
کسی دن دیکھنا آزاد یہ ہندوستاں ہوگا

بزدلوں ہی کو سدا موت سے ڈرتے دیکھا
گو کہ سو بار انھیں روز ہی مرتے دیکھا
ویر کو موت سے ہم نے نہیں مرتے دیکھا[1]
تختۂ موت پہ بھی کھیل ہی کرتے دیکھا

میرے اپنے بڑھ کے کر دیتے ہیں مجھ کو بے قرار
آہ بن کر تیر ہو جاتی ہے میرے دل کے پار
قابلِ عبرت یہ منظر ہے کہ بن کر غم گسار
میری آنکھیں حال پر روتی ہیں ہو کر بے قرار

[1] قلمی مسودے میں یہ مصرع اس طرح ہے ع "موت سے ویر کو ہم نہیں ڈرتے دیکھا"

واۓ ناکامی کہ اٹھ جاتی ہیں یہ آنکھیں جدھر
حیف ! سب دنیا مجھے تاریک آتی ہے نظر
رنج وغم، آفت، مصیبت، دردِ دل، دردِ جگر
کون سی آفت ہے یارب جو نہیں ہے میرے سر

شیداۓ بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگیں سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

ہوں گرفتارِ بلا کیا کیا پریشانی نہیں
دامنِ قسمت میں میرے تارِ آسانی نہیں
اُف ! مری تقدیر میں آسودہ سامانی نہیں
کون سا غم آج مجھ میں دردِ پنہانی نہیں

میں خزاں قسمت مجسم غم کی اِک تصویر ہوں
بے کسوں کی یاد ہوں، بگڑی ہوئی تقدیر ہوں
نالہ ہائے نارسا ہوں آہِ بے تاثیر ہوں
راس جو آئی نہیں، افسوس وہ تدبیر ہوں

گل بھی قسمت سے ہمارے واسطے اب خار ہیں
راحتیں جن کو سمجھتے تھے وہ سب آزار ہیں
بے کسی اپنی ہے ہمدم اور غم خوار ہیں
گو نہیں روتے مگر رونے کے سب آثار ہیں

جو دعائیں تھیں سراسر، بد دعائیں ہو گئیں
درد افزا آج کل ساری دوائیں ہو گئیں
جب کبھی بیڑا چلا اُلٹی ہوائیں ہو گئیں
ختم ہم پر آسماں تیری بلائیں ہو گئیں

جوش پر اللہ! کیسا دیدۂ خوں ریز ہے
اشک کا ہر ایک قطرہ آج طوفاں خیز ہے
آتش مایوسیِ دل آہ! کیسی تیز ہے
جو نظر کے سامنے منظر ہے، غم انگیز ہے

اس بسیط خاک پر میں نے قدم رکھا جہاں
وہ زمیں دینے لگی دکھ، بن کے مجھ کو آسماں
ٹوٹتی ہے روز مجھ پر اک بلائے ناگہاں
میری دشمن ہو گئی، برقِ حوادث بے گماں

موت اک روز جب آنا ہے تو ڈرنا کیا ہے
ہم سدا کھیل ہی سمجھا کیے، مرنا کیا ہے

تنگ آکر ہم بھی ان کے ظلم سے بے داد سے
چل دیئے سوے عدم زندانِ فیض آباد سے

زندگی بعد فنا تجھ کو ملے گی حسرتؔ
تیرا جینا ترے مرنے کی بدولت ہوگا

وطن ہمیشہ رہے شاد کام اور آزاد
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے
(جولائی ۱۹۲۶ء)

ہم اجڑتے ہیں تو اُجڑیں وطن آباد رہے
ہوں گرفتار تو ہوں پر وطن آزاد رہے

دعا

اے خداوندِ قدوس! اے دو جہاں کے مالک! اے کائنات پر حکومت کرنے والے! اے صاحبِ جبروت بادشاہ! اے حی وقیوم! اے ذوالجلال والاکرام! اے ستار العیوب! اے غفار الذنوب!

تری حمد وثنا کے لیے تیرا گناہگار، سیہ کار بندہ، جس نے اپنی زندگی کے اٹھائیس سال غفلت اور کبر ونخوت میں گزار دیے، وہ تجھ سے بھٹکا ہوا پھرا۔ جس نے تیری شانِ معبودیت کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو تیرا بندہ نہ سمجھا۔ جو ہمیشہ عیش وعشرت کو، اچھا کھانے کو اور اچھا پہننے ہی کو زندگی کا جزو اعظم قرار دیتا رہا۔ جس کی جبین نیاز تیری بے نیازی کی چوکھٹ پر نہ جھکی، جو حرص وہوا کا شکار رہا، جو شیطان ملعون کا گوے وچوگاں بنارہا جس نے اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو لہو ولعب میں گزار دیا۔ جس نے دنیا کی سیہ کاریوں، بدکاریوں اور گناہوں کا ریکارڈ بیٹ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور کیا، اور نفس کا غلام بنارہا۔

قصہ مختصر یہ کہ اے مالکِ بحر و بر! تجھ سے پوشیدہ نہیں، تو ہر وقت ہر عالم کی خبر رکھتا ہے، نہ تو اونگھتا ہے نہ سوتا ہے، آسمان وزمین کا جو بھی خلا ہے وہ تیری نظر کے سامنے ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں سے اوپر اور زمین کے نیچے تحت الثریٰ تک ہے، تو سب سے واقف ہے۔ اس سے زیادہ واقف، جتنا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میں پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا تجھ سے تحریر کے ذریعے سے یا تقریر کے ذریعے سے اقرارِ گناہ کر رہا ہوں۔ میں اپنے گناہ سے تجھے باخبر کرنے کے لیے نہیں، کیوں کہ تو پہلے ہی سے واقف ہے، لیکن میں یوں لکھ رہا ہوں کہ جب تک کہ یہ کاغذ اور روشنائی کا رنگ قائم رہے، یہ تحریر جس کے ہاتھ میں پہنچے وہ یہ سمجھ لے کہ اشفاق خدا کا گنہگار اور سیہ کار بندہ تھا۔ پس اس کے لیے دعائے مغفرت کرے۔ میں ایک فرد گناہ اور مجسم معصیت ہوں۔

اے میرے معبود! میری غرض نام و نمود نہیں۔ میں مصنف یا ناصح نہیں بننا چاہتا۔ میرا مقصد اس خصوصی کتاب کے لکھنے سے جو ہے وہ تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ تو مجھے اس وقت تک زندہ اور امن میں رکھ جب تک یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب اپیل خارج ہوئی تھی اور رحم کی درخواست مسترد ہو گئی تھی اور ۱۶/اکتوبر ۱۹۲۷ء پھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ صرف چار روز میرے پھانسی دیئے جانے میں رہ گئے تھے، سب انتظامات پورے ہو گئے تھے، جلاّد آ گیا تھا، اس وقت کی پریشانی تجھ پر خوب روشن ہے! کیا میں موت سے ڈر رہا تھا! کیا مجھے یہ خیال تھا کہ ہر چیز مجھ سے چھُٹ جائے گی اور یہاں پھر نہ آنا ہو گا؟ کیا مجھے دوست، احباب، اعزا، اقربا کی یاد ستاتی تھی؟ نہیں! میرے مالک نہیں! نہیں میرے آقا ایسی بات نہیں تھی۔ مجھے دُکھ اس بات کا تھا اور تکلیف اس بات کی تھی کہ تیری جناب میں کیا جواب دوں گا!

اے مالکِ ہر دو جہاں! تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہوں، تو میری مدد فرما کہ میں کچھ لکھ سکوں، میرا علم محدود ہے مگر تیرا علم اتنا وسیع ہے کہ کل کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی سے ذرے چمک اُٹھتے ہیں تو میرے ذرّۂ علم کو بھی اپنے آفتاب علم سے روشن کر دے تاکہ میرے بعد میری یہ ناچیز تحریر جب میرے گھر کے لوگوں کو ملے اور میرے وطنی بھائی دیکھیں تو اس پر عمل کریں۔

بعد اس کے تیرا اشفاق، کاکوری کیس کا پھانسی والا قیدی، تجھ سے تیری رضا چاہتا، تجھ سے تیری محبت چاہتا ہے، تیرا کرم چاہتا ہے۔ تو اس کی بدکاریوں کو نیکوکاریوں سے بدل دے اور اس سے راضی ہو جا۔

خداوند! تیری جناب میں اشفاق دامن پھیلائے کھڑا ہے، اس کا دامن بھر دے۔ تیری درگاہ سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ پھر کیا تو اسے خالی ہاتھ لوٹائے گا؟ کیا وہ پُر امید تیری جناب میں آ کر ناامید لوٹے؟ نہیں جو تجھ سے طلب کرتا ہے تو اسے دیتا ہے، جو تجھے ڈھونڈتا ہے تو اسے ملتا ہے۔ پس اس کو روتی ہوئی آنکھ اور دردمند دل عطا فرما اور اس کو قبول فرما۔ گناہ کس کے کیے، نافرمانی کس کی کی؟ بھٹک کر کس سے چلا، کیا اس کا کوئی معبود ہے؟ کیا تو اس کا خدا نہیں ہے؟ تیرے گناہ کیے، تیری نافرمانی کی، تجھ سے بھٹک کر چلا، تو ہی اس کا معبود ہے، تو ہی اس کا خدا ہے، تو کریم و رحیم ہے، تو غفار الذنوب ہے، تو ستار العیوب ہے، تو معاف کرے گا۔

اگر تیرے دربار سے ناامید ہوئے تو پھر تو ہی بتا، تیر ااشفاق کہاجائے ؟

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تُو ہو جائے

چھپالے دامنِ رحمت میں ان گناہوں کو
الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کریں نہ عدو دیکھ کر ذلیل ہمیں
کہ جس کے بندے ہیں اس کو کریم کہتے ہیں

تیرے کرم کی اُمید پر اشفاق پھانسی لگنے کے انتظار میں خوش خوش بیٹھا ہے، اور کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔

نقشِ زیبائے تو آوردہ مرا بر درِ تو
فارغم کرد ز نقش در و دیوارِ دگر

حصّہ سوم

کاکوری سازش کیس

اور اس کی

عدالتی کارروائی

(اخبارات کے آئینے میں)

اور یہ مواد!

اس حصے میں اخبارات کے تراشوں کا جو ذخیرہ محفوظ کر دیا گیا ہے، اس میں کاکوری کیس، اس کے ملزمان، مقدمے کی پیشیوں، ان کی کارروائیوں، گواہوں کے بیانوں اور کیس کے متعلق دیگر خبریں ہیں۔ یہ مقدمہ، اس کے ماخوذین اور اشفاق اللہ خاں شہید کے حالات اور دیگر تفصیلات کے بارے میں خام مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن اشفاق اللہ خاں کے تذکرے میں ضرورت کی جس حد تک اس سے استفادہ کیا گیا ہے، گونا گوں معلومات کا ذخیرہ اس سے بہت زیادہ پورے مقدمے اور تمام ملزمان کے بارے میں مفید معلومات کو محیط ہے! اس لیے اشفاق اللہ خاں کے بارے میں اس ذخیرے سے استفادے کے بعد اسے ضائع کر دینے کے بجائے اس کا محفوظ کر دیا جانا زیادہ مفید اور مناسب معلوم ہوا۔ میرے ذہن میں اس کی افادیت کے کم از کم دو پہلو ضرور رہیں :

۱- آیندہ اگر کوئی صاحبِ ہمت ریسرچ اسکالر اس پورے کیس یا اس میں ماخوذ کسی خاص شخص کے بارے میں تالیف و تحقیق کے میدان میں قدم اٹھائے تو اسے زیرِ نظر مواد کے ضیاع کا ماتم نہ کرنا پڑے۔

۲- اس کے علاوہ اس مواد کی حفاظت کی ضرورت ا۔۔

یہ ہے۔

خاکسار نے اشفاق اللہ شہید کے بارے میں یہ کتاب جو تالیف کی ہے، اس میں اس مواد سے اس حد تک فائدہ اٹھایا ہے کہ ان کی شخصیت، سیرت اور ان کے کارنامے کا ایک مرقع تیار ہو جائے لیکن یہ ممکن ہے کہ میں کسی بات کو سمجھنے سے قاصر رہا ہوں اور اس سے اخذِ مطالب میں ٹھوکر کھائی ہو۔ اگر آیندہ کوئی صاحبِ ذوق اشفاق اللہ خاں شہید پر قلم اٹھائے

اور اسے حالات و واقعات کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہو تو کم از کم یہ مواد اس کی دسترس سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

عام طور پر قدیم و جدید اخبارات کے مآخذ ایک خاص رفتار سے روز بہ روز معدوم ہوتے جاتے ہیں اور ان سے استفادے کی راہ مسدود ہوتی جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ وطن کے محسنوں، مجاہدوں اور شہیدوں پر آیندہ تالیف و تحقیق کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اس میں بہت سے کام انجام دیئے جائیں گے۔ اس وقت ان کے لیے ایسے بہت سے مواد کی ضرورت پیش آئے گی۔

کاکوری ڈکیتی کے مقدمہ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ ملزمین کی شناخت

لکھنؤ۔ ۲۱/اکتوبر : سید امین الدین اسپیشل مجسٹریٹ نے کاکوری کے ڈکیتی والے مقدمہ میں ملزمین کی شناخت کی کارروائی شروع کر دی ہے۔ بجز ایک کے کسی شخص کی ضمانت اب تک منظور نہیں ہوئی ہے۔ ایک لڑکا جو عمر میں ۱۶ برس سے کم تھا، اسپیشل مجسٹریٹ کے حکم سے کل ضمانت پر چھوڑ دیا گیا، بقیہ ملزمین تین مختلف جیلوں میں قید ہیں۔ ۱۰ لکھنؤ میں، ۵ شاہ جہاں پور میں اور باقی بنارس میں ہیں۔ شاہ جہاں پور کے ملزمین کی شناخت کل ختم ہو گئی۔ بابو سیتارام، ایم، ایل، سی اور پنڈت ہر کرن ناتھ ایم، ایل، اے جو ملزمین کی طرف سے وکیل ہیں، شناخت کے وقت موجود تھے۔ شاہ جہاں پور کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ خیال کیا جاتا ہے کہ بعض گواہوں نے وہاں کے تمام ملزمین کو شناخت کر لیا ہے۔ بنارس میں شناخت کرنے کی کارروائی کل شروع ہو گی اور لکھنؤ میں ۲۴/اکتوبر کو۔ جو مہلت اس کو دی گئی ہے وہ ۲۴/اکتوبر کو ختم ہو جاتی ہے لیکن سنا جاتا ہے کہ پولیس کی تحقیقات ابھی کچھ دنوں تک اور ختم نہ ہو سکے گی۔ اب اعزہ اور وکلاء کے ملزمین سے ملنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور ہر قیدی سے بیڑیاں اٹھالی گئی ہیں۔ معتبر ذریعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دو ملزمین نے مجسٹریٹ کے پاس اپنے بیانات داخل کیے ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۳/اکتوبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

ایک دلچسپ واقعہ

کاکوری ٹرین ڈکیتی کے مقدمہ میں ملزمان کی مردم شماری یوماً فیوماً ترقی پر ہے۔

گورنمنٹ پر کانگریس والے عام طور پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ کانگریس والوں کو اس لیے گرفتار کیا گیا ہے کہ کانگریس کے آیندہ اجلاس کو صدمہ پہنچے۔

شناخت کی کارروائی کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ بہت سے گواہوں نے بہت سے ملزمان کا ہاتھ پکڑا ہے۔ان کے متعلق دوران شہادت میں یہ گواہ بتائیں گے کہ انھوں نے انھیں کیوں شناخت کیا اور کیا کرتے دیکھا ہے۔ شناخت کے موقع پر جب ایک کمسن ملزم کو متواتر گواہوں نے شناخت کیا تھا تو ملزم پر غشی طاری ہو گئی تھی، لیکن جیل کے ڈاکٹر نے اسے فوراً طبی امداد پہنچائی اور وہ اچھا ہو گیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ کاکوری کا مقدمہ ابھی عدالت میں پیش نہیں ہو سکے گا، کیوں کہ گرفتاریاں برابر جاری ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہمارے علم میں آیا ہے۔ وہ یہ کہ شاہ جہاں پور کے ایک ملزم سے مسٹر بیدار ایم، ایل، سی ملنا چاہتے تھے۔اور ان کی خواہش تھی کہ وہ جیل نہیں جانا چاہتے، ملزم کو کوتوالی لایا جائے۔اس درخواست کو منظور کرنا ناممکن تھا کیوں کہ ملزم کی شناخت کی کارروائی ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن اسپیشل مجسٹریٹ نے خود شاہ جہاں پور جا کر شب کے وقت ملزم کو برقع پہنا کر اپنے ساتھ کوتوالی لا کر مسٹر بیدار کو اس سے ملنے کا موقع دیا اور ڈھائی گھنٹہ بعد پھر خود ملزم کو اسی احتیاط سے جیل پہنچا دیا۔

(ہمدرد۔دہلی، ۶/نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

ضمانت کی درخواست نامنظوری کر دی گئی

کلکتہ۔۷/نومبر: سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے ہاں آج کاکوری ڈکیتی کے ۱۶ ملزمین کی طرف سے ایک عرضی داخل کی گئی ہے۔ قبل وکیل ملزمین نے کئی اشخاص کی طرف سے یہ درخواست کی کہ انفراداً ہر ایک ملزم کی ضمانت پر غور کیا جائے۔ خیرات نبی وکیل سرکاری، آئی،ڈی نے ضمانت کی اس درخواست سے اختلاف کیا لیکن کہا کہ جس طرح دو ملزم ضمانت پر رِہا کر دیئے گئے ہیں، اسی طرح استغاثہ کی طرف سے اور ملزموں کو از خود رِہا کر دینے میں بھی کوئی تامل نہ ہو گا، جب مسل دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ، نہیں قید

رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وکیل سرکار نے یہ بھی کہا کہ مسلوں کے دیکھنے میں دیر اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ بیانات نہ صرف انگریزی اور اردو ہی میں ہیں، بلکہ ہندوستان کی تقریباً چھ زبانوں میں مثلاً مرہٹی، بنگالی، بہاری وغیرہ میں ہیں۔ فریقین کی طرف سے دلایل سن لینے کے بعد مجسٹریٹ نے کہا کہ اب وہ فرداً فرداً ہر ملزم کا مقدمہ لیں گے اور وکلاء کی بحث سننے کے بعد فیصلہ دیں گے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۰/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا کی اپیل

مسٹر سی، ایچ، بی، کینڈال آئی، سی ایس سیشن جج لکھنؤ نے آج وہ اپیل سنی جو پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا ممبر جمعیۃ مقننہ نے اسپیشل مجسٹریٹ کے اس حکم کے خلاف دائر کی ہے کہ اس نے ان لوگوں کے مقدمات کے متعلق جو کاکوری کی ریل کی ڈکیتی کے الزام میں حوالات میں ہیں۔ پھر تیسری مرتبہ پولیس کو مہلت دے دی۔ اسی مجسٹریٹ کے اس حکم کے خلاف ہی اپیل کی گئی ہے کہ اس نے ملزمین کو ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ اپیل کرنے والے اور سرکاری پیروکار دونوں کے بیانات سننے کے بعد مسٹر کینڈال نے کہا کہ حکم جمعرات کے روز ۱۲/ نومبر کو سنایا جائے گا۔

ایک ملزم کی علالت

معلوم ہوا ہے کہ مقدمہ ڈکیتی ریلوے ٹرین کاکوری کا ایک ملزم جیل خانہ لکھنؤ میں ملیریا بخار میں مبتلا ہو گیا ہے اور اس کو بغرض علاج اسپتال بھیجا گیا ہے۔

سر راس السٹن پیروی کریں گے

اس کی اطلاع ملی ہے کہ مقدمہ ڈکیتی ریلوے ٹرین کاکوری کی کارروائی کھلی عدالت میں باقاعدہ شروع ہونے پر سر راس السٹن مشہور بیرسٹر الٰہ آباد اثبات جرم کی طرف

سے پیروی کریں گے۔ (آپ ہی نے مشہور مقدمہ کراچی میں بھی حکومت کی طرف سے پیروی کی تھی)۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۱ر نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

اپیل برائے ضمانت ملزمین

کاکوری کے قریب کی گذشتہ ریلوے ڈکیتی کے ملزمین کی ضمانت کے لیے نیز اسپیشل مجسٹریٹ صاحب کے پولیس کو تیسری دفعہ مزید مہلت دینے کے احکام کے خلاف جو اپیل پنڈت ہرکرن ناتھ مصر نے سشن ججی میں مسٹر کینڈال کے اجلاس میں دائر کیا تھا، اس کی سماعت ہوئی۔ پنڈت ہرکرن ناتھ مصر نے اپنی بحث میں ملزمین کی گرفتاری اور پولیس کی مہلتوں کی تاریخیں بیان کر کے دکھایا کہ ایک ملزم بنام بنارسی لال نے ۱۹ر اکتوبر کو اقبال جرم کیا مگر وقوعہ کی ابتدائی اطلاع، کورٹ پولیس کی فرد جرم یا کسی قسم کی شہادت اب تک نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تحقیقات ہنوز شروع نہیں ہوئی ہے۔ عدالت کے سوال پر پنڈت جی نے کہا کہ صرف پولیس کی تفتیش ہو رہی ہے۔ عدالتی تحقیقات ابھی شروع نہیں کی گئی ہے۔

اسپیشل کورٹ انسپکٹر نے پولیس کو مزید مہلت دیئے جانے کے متعلق پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی اور جرم کی نوعیت پر زور دیا۔ آخر میں سیشن جج صاحب نے پنجشنبہ کو درخواست پر احکام صادر کرنے کا اظہار کیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۲ر نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴)

دو ملزم ضمانت و مچلکہ پر رِہا کر دیئے گئے

لکھنؤ۔ ۱۳ر نومبر: کاکوری کے ڈکیتی والے مقدمہ میں آج اسپیشل مجسٹریٹ نے ۱۶ ملزمین کی شہادت قلم بند کی، اور ان میں سے بجز دو کے سب کی ضمانت کی درخواستیں مسترد کر دیں۔ اگرچہ ان کے متعلق بھی مجسٹریٹ نے کہا کہ کافی ثبوت موجود ہے لیکن وہ اس ضمن میں نہیں آتے، چنانچہ ہرنام سندر لال اور بھیروں سنگھ تین تین ہزار کی ضمانت و مچلکہ لے کر رِہا کر دیئے گئے۔ جے، ایس، دکشت نامی ایک ملزم کی صحت کچھ خراب بتائی جاتی ہے۔ خیال کیا

جاتا ہے کہ پنڈت جگت نراین جو کبھی یوپی گورنمنٹ میں وزیر رہ چکے ہیں، اس مقدمہ میں سرکاری وکیل ہوں گے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۵رنومبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

سپرنٹنڈنٹ پولیس خفیہ کا بیان حلفی

لکھنؤ۔ ۲۰رنومبر: کاکوری کے ڈکیتی والے مقدمہ میں پولیس کی طرف سے مزید مہلت کی جو درخواست دی گئی تھی، اس کے سلسلہ میں پنڈت جگت نراین نے بہ حیثیت وکیل سرکار کے رائے صاحب درگا پرشاد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی، آئی، ڈی سے بیان حلفی لیا۔ جنھوں نے بیان کیا کہ اگرچہ ایک درجن افسران کے قریب ان مقدمات کی تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ابھی تک کارروائی مکمل نہیں ہوئی ہے اور کوئی فرد جرم پیش نہیں کی جاسکتی۔ کم سے کم ۱۵روز اور ملنے چاہئیں تاکہ تحقیقات پوری طور پر مکمل ہو۔ آر، این، لاہری جو ابھی کلکتہ میں بمسازی کے ایک کارخانہ میں گرفتار ہوئے ہیں ان کی موجودگی اس مقدمہ میں بہت ضروری ہے۔ گواہ مذکور ۱۹۲۴ء سے صوبہ متحدہ میں خفیہ انجمنوں کا پتہ لگانے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور وہ حلف لے کر کہہ سکتے ہیں کہ اس صوبہ کے بعض اضلاع میں خفیہ انجمنیں قائم کی گئی تھیں اور اپنے مقاصد کو ترقی دینے کے لیے ان انجمنوں کے بعض ممبروں نے ڈاکے ڈالے۔ ملزمین میں سے دو نے اقبال جرم کرلیا ہے اور پولیس امید کر رہی ہے کہ فرار شدہ اشخاص کو بھی گرفتار کرلے گی۔ پولیس کے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض ملزمین نے بیچپوری ضلع پیلی بھیت میں ڈاکے ڈالے تھے۔

چار ملزم رہا کردیے گئے

گواہ مذکور سے وکیل ملزمین نے جرح شروع کی اور سماعت ختم ہونے کے بعد مجسٹریٹ نے ۱۵دن کی مزید مہلت کی پھر منظوری دے دی۔ ملزمین میں سے ستیلا سہائے جو کبھی صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہ چکے ہیں، موہن لال گوتم، راوت شکل اور

چندر بھال (تار میں اس نام کے بیچ کا حصہ (بھ) غلطی سے رہ گیا ہے لیکن گمان غالب ہے کہ پورا نام "چندر بھال" ہوگا، جو اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے، (ہمدرد)۔ایک ایک ہزار کی ضمانت و مچلکہ پر رِہا کر دیئے گئے ہیں۔ مدن لال کو بلا ضمانت و مچلکہ کے چھوڑ دیا گیا ہے، باقی ملزمین کی ضمانت کی درخواستیں نامنظور کر دی گئی ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۲/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۴)

ایک مفرور ملزم کا خط

اخبار "ورتمان" نے مقدمہ سازش و ٹرین ڈکیتی کاکوری کے ایک مفرور ملزم کا حسب ذیل خط شائع کیا ہے۔

"کاکوری کے قریب ریلوے میں جو ڈاکہ پڑا تھا اس کے سلسلہ میں گذشتہ بیس پچیس دن سے پولیس میری گرفتاری کے لیے میری تلاش کر رہی ہے۔اب اس نے میری اور دیگر کئی ملزموں کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان بھی کیا ہے ہندوستان کے باشندوں کی زیادہ تعداد فاقہ مست ہے اور بھوکے مرنے والے گندہ سے گندہ کام بھی پیٹ بھرنے کے لیے کر دیتے ہیں اس لیے میرے لیے اب زیادہ دیر تک محفوظ رہنا مشکل ہے۔جب یہ فیصلہ شدہ امر ہے کہ کوئی بھوک کا مارا مجھے گرفتار کرا دے گا تو میں خود ہی کیوں نہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دوں اور دوسرے جب میں بے قصور ہوں تو ڈر کس بات کا ہے چونکہ مجھے امید نہیں کہ میرے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو حوالہ پولیس نہیں کر سکتا"۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/ نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

ہندو یونیورسٹی کا ایک ملزم طالب علم

کانپور۔ ۲۳/ نومبر: کاکوری کے ڈکیتی والے مقدمہ میں کل یہاں شناخت کی کارروائی عمل میں آئی۔ یہاں صرف ایک ملزم راج کمار سنہا ہیں جو بنارس ہندو یونیورسٹی کے

طالب علم ہیں۔ مجسٹریٹ جن کی عدالت میں یہ مقدمہ چل رہا ہے، لکھنؤ سے یہاں اسی غرض سے تشریف لائے۔ وکیل ملزم مسٹر گلزار محمد خاں نے مجسٹریٹ سے یہ گذارش کی کہ وہ ملزم کو اور دوسرے بنگالی نوجوانوں میں جو تقریباً ویسے ہی کپڑے پہنے ہوئے ہوں، ملا دینے کی اجازت دیں اور پھر اس کے بعد گواہوں سے شناخت کرائیں۔ مجسٹریٹ نے اسے منظور کرلیا، اور اس خیال سے کہ ملزم دوسرے لوگوں میں اچھی طرح مِل جُل جائے، خود اس کی داڑھی کے بال تراشے۔

۳۵ میں سے صرف ۳ گواہوں نے پہچانا

کُل ۳۵ گواہ تھے جن میں سے صرف تین نے پہچانا۔ ان میں بھی دو گیارہ گیارہ برس کے لڑکے تھے اور تیسرا ایک برف بیچنے والا تھا۔ اکثر گواہوں نے پہچاننے میں غلطی کی۔ گواہ غلطی سے کبھی مکرجی یا چٹرجی اور کبھی مترا یا بھٹاچاریہ کو ملزم کی بجائے بتاتے۔ مؤخر الذکر کو ایسی ہی غلطی کی بنا پر دوبار ملزم بتایا گیا۔

شناخت کی یہ کارروائی ایک تنہا کمرہ میں ہوئی اور پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا برابر اس کارروائی کو دیکھتے رہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۶ر نومبر ۱۹۲۵ء، ص۵)

شناخت کی کارروائی برابر جاری ہے

لکھنؤ۔ ۴ر دسمبر: اس دلچسپ مقدمہ میں برابر شناخت وغیرہ کی کارروائیاں جاری ہیں۔ اب پولیس زیرِ ہدایت پنڈت جگت نراین پراسیکیوٹنگ... کام کررہی ہے۔ پنڈت جگت نراین کی معقولیت اور قابلیت سے اس مقدمہ میں فریقین کو غیر معمولی فوائد حاصل ہونے کی امید کی جاتی ہے۔ ہم عصر "لیڈر" (الٰہ آباد) نے اپنی تازہ اشاعت میں سات ملزمان کی رہائی کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ پنڈت جگت نراین کی موجودگی کے باعث جیسی کہ امید تھی یہ ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اس مقدمہ میں نہایت انصاف اور واجبیت کے ساتھ کارروائی کی جائے گی۔ ہم عصر نے پولیس کے ابتدائی طرزِ عمل کے خلاف بے اطمینانی اور ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مقدمہ میں پولیس سے ابتدا میں کچھ

غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ شناخت وغیرہ کے سلسلہ میں اسپیشل مجسٹریٹ کانپور وغیرہ اضلاع کے دورہ پر گئے ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۷ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

کاکوری ڈکیتی کے مقدمہ میں ماخوذ ملزمین کی دوبارہ شناخت

کاشی ودیاپیٹھ میں ایک لڑکے کی گرفتاری

بنارس۔ ۴ر دسمبر: کل صبح آٹھ بجے سی، آئی، ڈی کا ایک سپرنٹنڈنٹ مسٹر مکرجی مع ایک سب انسپکٹر کے کاشی ودیاپیٹھ میں سیٹھ دمودر سروپ اور منمتھا گپتا جو مقدمہ ڈکیتی کاکوری کے سلسلہ میں ماخوذ ہیں، ان کی اور طلباء اساتذہ کی حاضری دیکھنے کے لیے آئے۔ جب وہ کالج کے رجسٹر کو دیکھ رہے تھے تو مسٹر مکرجی کو معلوم ہوا کہ سکینڈ ایئر کا ایک طالب علم موقع واردات کے دن کالج سے غیر حاضر تھا۔ بالآخر پولیس نے ساڑھے بارہ بجے زیر دفعہ ۵۴ تعزیرات ہند شبہ کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ مندرجہ بالا لڑکا باسدیو جاہا ودیاپیٹھ میں نہایت معصوم اور بے ضرر لڑکا تھا۔ طلباء اور اساتذہ کو یقین ہے کہ یہ آخری لڑکا ہوگا جو کسی انقلابی تحریک میں شریک ہو سکے۔ اگرچہ وہ اس دن بوجہ علالت کے کالج سے غیر حاضر تھا۔

آج ڈسٹرکٹ جیل بنارس میں دوسری مرتبہ تمام ملزمین کی جو کاکوری ڈکیتی کے سلسلے میں ماخوذ ہیں دوبارہ شناخت کرائی جائے گی۔ مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کی موجودگی میں شناخت عمل میں آئے گی۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۸ر دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

تین اور ملزم رِہا ہوئے

لکھنؤ۔ ۷ر دسمبر: سرکاری وکیل کی درخواست پر اسپیشل مجسٹریٹ نے کالی داس بوس اور دو ملزمین کو رِہا کر دیا جو کاکوری کے ڈکیتی والے معاملہ میں ماخوذ تھے۔ اب تک ۳۷

ملزمین میں سے کل ۱۳ اشخاص رہا ہو چکے ہیں، باقی لوگوں پر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ہارٹن نے دفعہ ۲۹۶، ۳۰۲ اور ۱۲۰ (ب) تعزیرات ہند کے ماتحت فرد جرم لگائی۔ اور دفعہ ۱۲۱ (الف) کے ماتحت استغاثہ دایر کیا۔ انھوں نے عدالت کے سامنے گورنر اجلاس کونسل کا وہ حکم بھی پیش کیا، جس کی بنا پر انھیں ان ۲۳ اشخاص پر دفعہ ۱۲۱ (الف) کے ماتحت مقدمہ چلانے کا اختیار دیا گیا تھا۔

ملزمین میں سے تین اب تک فرار ہیں اور اس وجہ سے مجسٹریٹ نے دفعہ ۵۱۲ ضابطہ فوجداری کے ماتحت یہ حکم دیا ہے کہ ان کی منقولہ اور غیر منقولہ سب جائیداد ضبط کرلی جائے۔ تین اور ملزمین بنگال میں گرفتار ہیں اور ایک ہسپتال میں ہے۔ مجسٹریٹ نے ان باقی ۱۷ ملزمین کی موجودگی میں مقدمہ کی کارروائی شروع کی۔ اور مسٹر ہارٹن نے دفعہ ۱۲۱ (الف) کے ماتحت جو استغاثہ دایر کیا تھا، اس کے متعلق ان کا حلفیہ بیان لینا شروع کیا۔

مقدمہ سازش میں آیندہ تاریخ ۲۱ر دسمبر پڑی ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

کاکوری ڈکیتی اور پولیس کی "نادر شاہی"

کاکوری ڈکیتی کے سلسلہ میں ۲۷ اشخاص گرفتار کیے گئے تھے جن میں سے ۱۳ اشخاص دو ماہ تک حوالات میں سڑنے اور ذلت اٹھانے کے بعد بے گناہ کہہ کر رہا کر دیے گئے۔ ان کو اس عرصہ میں جو جو جسمانی اور روحانی تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں، کیا گورنمنٹ اس کی تلافی کرے گی؟ ان معزز اور شریف نوجوانوں کو بلا قصور کیوں گرفتار کیا گیا، کیا اس کا جواب حکومت پولیس سے طلب کرے گی؟ پولیس کے اندھیر بڑھنے کی یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وہ اس قسم کی "نادر شاہی" مچاتی ہے، تو حکومت اس سے اظہارِ ناپسندیدگی کرنے کی بجائے اس کی پیٹھ ٹھونکتی ہے، جس سے اس کے زعم میں اور اضافہ ہوتا ہے، اس طرح کی من مانا کارروائی کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ مظلوم لوگوں کے دلوں میں انقلاب کی آگ اور بھڑکنے لگے۔ کہتے ہیں کہ غیر رہا شدہ ملزمین پر پولیس کئی ڈاکے کا الزام عاید کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے ایک معاصر کی روایت کے مطابق شناخت کے معاملہ میں پولیس گواہوں کو نامناسب امداد

دے رہی ہے پھر بھی وہ کمبخت پولیس کو مایوس ہی کرتے جا رہے ہیں!(وشوامتر)۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۹/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

مقدمہ سازش و ڈکیتی کے ملزمان

کاکوری ریل کی ڈکیتی کے مقدمہ میں تمام رہائیوں کے بعد اس وقت ماخوذ ملزمان کی تعداد ۲۴ ہے اور ان کے نام حسب ذیل ہیں :

مسٹر رام پرشاد، بشن سرن دبلس، رام سرن کھتری، منمتھاناتھ گپتا، پریم کشن کھنا، سچن بسواس، راج کمار سنہا، سریش چندر بھٹاچارجی، سیٹھ دمودر سروپ، رام دلارے، بیر بھدر تواری، ہر گووند، جی سی کار رام ناتھ پانڈے، روشن سنگھ، اندر بھوشن مترا، بنارسی لال، جیوتی شنکر دکشت، سچیندر ناتھ سانیال، راجندر لاہری، جگیش چٹرجی، اشفاق اللہ، ایس۔ این۔ بخشی، چندر شیکھر آزاد۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ

لکھنؤ۔ ۱۹/ دسمبر: تین مفرور ملزمان کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی قرقی عمل میں آنے پر دو ملزمان کے اعزہ نے عذرداری کی ہے کہ قرق شدہ مال و اسباب کے مالک وہ ہیں۔ ملزم کو اس مال پر ملکیت کا کوئی حق نہیں۔ تیسرے ملزم کے گھر سے کچھ زیادہ مال بر آمد نہیں ہوا ہے اور اس کے کسی عزیز نے عذرداری بھی نہیں کی ہے۔

کل اسپیشل مجسٹریٹ کے سامنے سچیندر ناتھ بخشی مفرور ملزم کے باپ کی عذرداری پیش ہوئی۔ ملزم کے باپ اور تین گواہوں نے بیان کیا کہ مال و اسباب ملزم کے باپ کا ہے، ملزم کا اس میں کوئی حق نہیں۔ عذردار کی طرف سے مسٹر بنرجی وکیل بنارس نے بتایا کہ بنگالی کمیونٹی اپنی مذہبی شرع 'دیا بھاگ' کے ماتحت ہے۔ جس میں لڑکا اس وقت تک کسی طرح حقدار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا باپ زندہ ہوتا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے ایسی نظائر پیش کرنے کا حکم دیا ہے، جس میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ بنگالیوں کے وراثت کے جھگڑوں میں

دیا بھاگ کے ماتحت عدالت سے حکم دیا جانا چاہیے۔ ان نظائر کی پیشی کے لیے ۱۶؍ جنوری مقرر ہوئی ہے۔ چوں کہ پولیس نے عذر دار کی تمام ضروری استعمالی اشیاء گرم کپڑے اور کھانے پکانے کا سامان و اشیائے خوردنی قرق کرلی ہیں۔ اس سے عذر دار اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو سخت تکلیف ہے۔ اس تکلیف کو معلوم کر کے فاضل مجسٹریٹ نے حکم دیا ہے کہ کچھ ضروری اشیاء سچیندر ناتھ بخشی کے باپ کو اس شرط سے کہ وہ دو سو روپیہ کی ضمانت داخل کرے اور طلب کرنے پر وہ اشیاء پھر واپس کر دی جائیں۔ مجسٹریٹ سے ملزم کے باپ نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ اپنے لڑکے کی گرفتاری میں پولیس کو امکانی مدد دے گا۔

دوسری عذر داری ملزم اشفاق اللہ خاں کے بھائیوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ اس میں بھی عذر داروں کی طرف سے ہی عذر کیا گیا ہے کہ ملزم صرف طالب علم تھا اور چند کتابوں کے سوا اس کا کوئی مال اس میں نہیں ہے جو مال و اسباب قرق ہوا ہے، وہ عذر داروں کا ہے۔ عذر داروں کی طرف سے مسٹر احسان الرحمٰن قدوائی بیرسٹر ایٹ لاء نے پیروی کی۔ اس عذر داری کی مزید سماعت کے لیے بھی ۱۶؍ جنوری مقرر ہوئی۔ اس روز پولیس کی طرف سے یہ ثابت کرنے کے لیے گواہ پیش ہوں گے کہ مال قرق شدہ میں ملزمان مفرور کا حصہ ہے۔

اس سامان کی مکمل فہرست پولیس نے ابھی تیار نہیں کی ہے۔ اس کی تیاری کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نیز اشفاق اللہ خاں ملزم کی زمینداری قرق نہیں ہوئی، اس کے لیے بھی کلکٹر شاہ جہاں پور کو حکم بھیجا گیا ہے کہ جائداد غیر منقولہ کی قرقی عمل میں لائیں۔

ان قرقیوں کے باوجود ہنوز مفرور ملزمان لاپتہ ہیں، لیکن پولیس ان کی تلاش میں برابر کوشاں ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۱؍ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۶)

دو ملزمان کو معافی نامہ عطا کیا گیا

لکھنؤ۔ ۲۱؍ دسمبر: آج سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ لکھنؤ کے سامنے کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ پیش ہوا۔ دو ملزم بنارسی لال اور اندو بھوشن متر اکو اس بنا پر معافی دی گئی کہ وہ اس مقدمہ کے ملزمین یا دیگر اشخاص کے متعلق ان کے جرم کا پورا حال بتا دیں۔ یہ ہر دو اشخاص

بحیثیت گواہ کے اس مقدمہ میں پیش ہوا کریں گے۔ چوں کہ اس مقدمہ کے دو بڑے ملزم یعنی جوگیش چڑجی اور راجیندر لاہری اب تک بنگال سے نہیں آئے ہیں، اس لیے مقدمہ ۴/ جنوری ۱۹۲۶ء تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۳/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

مقدمۂ سازش و ڈکیتی کاکوری عدالت میں پیشی

لکھنؤ۔ ۲۲/ دسمبر: مقدمہ سازش ڈکیتی کل ۲۱/ دسمبر کو عدالت میں پیش ہوا۔ ملزمین بنارسی لال ساکن ضلع شاہ جہاں پور اور اندو بھوشن متر اساکن شاہ جہاں پور کو واردات ڈکیتی وغیرہ کے متعلق تمام معلومات بطور شہادت بیان کر دینے کا وعدہ کرنے پر مسٹر سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ نے حسب دفعہ ۳۳۷ ضابطۂ فوجداری معافی دے کر گواہ بنانے کا حکم دیا۔ ہر دو ملزمین کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اگر کوئی بات چھپائیں گے تو وہ پھر ملزم قرار دیئے جائیں گے۔ اندو بھوشن متر املزم ضمانت پر رہا ہے اور بنارسی لال کو بھی رہائی دی گئی ہے۔ لیکن بخیال حفاظت ملزمان پولیس کی نگرانی میں رہیں گے تا کہ ملزمین یا ان کے کسی شریک کو ان کی جان لینے کی کوشش میں کامیابی نہ ہو سکے۔

پیشی کی تاریخیں

چوں کہ بنگال سے جگیش چندر چڑجی اور اجندر الال لاہری ابھی تک نہیں آئے ہیں، لیکن امید ہے کہ یہ لوگ ایک ہفتہ میں آجائیں گے۔ لاہری کے مقدمہ بم واقع کلکتہ میں کرسمس کی تعطیل کے بعد حکم سنایا جانے والا ہے۔ لہٰذا مقدمہ کی پیشی اور شہادت کی سماعت فی الحال ۴/ جنوری تک کو ملتوی ہو گئی اور بشرط ضرورت ۶/ جنوری تک مقدمہ ملتوی ہو سکے گا لیکن یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اگر ۶/ جنوری تک بھی کوئی ملزم نہ آسکا تو پھر مقدمہ کی سماعت ملتوی نہ ہو گی۔ اس التواء پر صفائی کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔

ایک ناگوار واقعہ

آج مقدمہ کی وجہ سے اور ملزمین کی غلط فہمی کی وجہ سے صورت حال کچھ غیر معمولی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ لیکن ملزمین کے وکلاء پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا اور بابو موہن لال سکسینہ نے کوشش کر کے سخت خطرناک اور ناگوار صورت حال کو جلد خوشگوار بنالیا۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ ضلع پولیس نے قاعدہ اور ضابطہ کی تعمیل میں نیز بنظر حفظ ماتقدم ملزمین کو جیل سے کمرہ عدالت تک لانے کے لیے انھیں بیڑیاں پہنانا ضروری سمجھا اگرچہ ملزمان پر جو الزامات ہیں ان کے لحاظ سے ضابطہ میں ملزمین کو بیڑیاں پہنایا جانا ہر وقت لازمی تھا، لیکن سید عین الدین صاحب اسپیشل مجسٹریٹ نے جو ملزمین کے انچارج جیل ہیں اور کمرہ عدالت میں ہیں۔ ملزمین کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ انھیں جیل میں اور کمرۂ عدالت میں بیڑیاں نہ پہنائی جائیں مگر جیل سے کمرۂ عدالت تک ملزمین کو لانے اور لے جانے کی ذمہ داری ضلع پولیس کے اوپر ہے اس وجہ سے ضلع پولیس کو اس پر اصرار ہے کہ وہ ملزمین کو بیڑیاں ڈال کر لائے گی تاکہ کوئی غیر خوشگوار حادثہ وغیرہ پیش نہ آسکے۔

ملزمین کی مقاومت مجہول

ملزمین نے اس حرکت سے ناراض ہو کر جیل سے روانگی سے انکار کر دیا لیکن پولیس نے جبراً انھیں بیڑیاں ڈال کر موٹر لاری میں سوار کر کے عدالت کو لانا چاہا۔ اسپیشل مجسٹریٹ کو بذریعہ ٹیلی فون اطلاع کی گئی اور انھوں نے ملزمین کو ہدایت کی کہ وہ عدالت تک جس طرح پولیس لائے چلے آئیں اور عدالت میں آکر عذر کریں ان کے عذر کی سماعت کی جائے گی۔ چوں کہ مجسٹریٹ کا ذاتی برتاؤ ملزمین کے ساتھ نہایت شریفانہ رہا ہے، انھیں اپنے اعزہ سے ملنے میں، جیل میں بآرام رہنے میں ہر طرح کی سہولتیں جو مجسٹریٹ کے اختیار میں تھیں، دی گئی ہیں، اس لحاظ سے مجسٹریٹ کو امید تھی کہ ملزم اس ہدایت پر عمل کر کے جس طرح پولیس لائے گی چلے آئیں گے لیکن ملزمین نے ایسا نہیں کیا اور انھیں بجبر لانا پڑا۔ کچہری آکر موٹر لاری سے اترنے سے بھی ملزمین نے انکار کر دیا۔ یہاں پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا اور بابو موہن لال سکسینہ وکلائے صفائی نے موٹر لاری میں جا کر ملزمین کو ان کی غلطی سے آگاہ کیا اور انھیں سمجھایا کہ انھیں ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے۔

وکلاء اور ملزمین میں بحث

اس موقع پر ملزمین اور وکلائے ملزمین میں ایک طویل دلچسپ بحث ہوئی۔ وکلاء نے کہا کہ یا تو ملزمین کامل نان کو آپریشن پر عمل کر کے عدالت میں صفائی اور جوابدہی سے انکار کریں اور اگر صفائی پیش کرنے کا انھوں نے ارادہ کیا ہے، ان کی طرف سے وکیل عدالت میں پیروی کے لیے موجود ہیں تو پھر انھیں تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا چاہیے۔ ملزمین کو شکایت تھی کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ ان کا مقدمہ اس قدر عرصہ سے ملتوی ہو رہا ہے، ان کے لیے پبلک بھی کوئی احتجاج نہیں کرتی۔ ملزمین کے ان تمام اعتراضات اور شکایتوں کا وکلاء نے جواب دیا اور انھیں سمجھا کر عدالت تک آنے پر راضی کیا۔ عدالت میں پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا نے ملزمین کی شکایت پیش کی اور درخواست کی کہ انھیں بیڑیاں ڈال کر نہ لایا جائے بلکہ صرف ہتھکڑیاں ڈال کر لایا جائے۔

بیڑی پہنانے کا مسئلہ

اسپیشل مجسٹریٹ نے کہا کہ جیل کے اندر اور کمرۂ عدالت میں میرا اختیار ہے۔ جیل سے لانے اور لے جانے کی ذمہ داری ضلع پولیس پر ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ضلع پولیس سے وکلاء کو چارہ جوئی کرنا چاہیے۔ پنڈت جگت نراین وکیل استغاثہ نے بھی کہا کہ انھیں بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ اگر عدالت اور پولیس چاہے تو ملزمین کو بیڑیاں نہ پہنائے۔ اس سلسلہ میں بنگال سے آئے ہوئے نظر بند قیدی مسٹر سچیندر ناتھ سانیال نے کہا کہ مجھے بنگال سے بغیر بیڑی پہنائے لایا گیا ہے اور وہاں جیل میں بھی بحالت نظر بندی مجھے بیڑیاں نہیں پہنائی گئیں، لیکن یہاں مجھے جیل سے لانے کے لیے بیڑیاں پہنائی گئی ہیں۔ مسٹر سانیال نے زوردار الفاظ میں مجسٹریٹ سے جو حکومت برطانیہ کے قائم مقام ہیں اپیل کی کہ ہمارے ساتھ ایسا خلاف انسانیت برتاؤ روا نہ رکھا جائے۔ مجسٹریٹ نے مسٹر سانیال کی تقریر کو نہایت دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ سنا اور کہا کہ یہاں بھی جیل کے اندر انھیں بیڑیاں نہ پہنائی جائیں گی۔ لیکن جیل سے باہر میں ذمہ دار نہیں۔ مسٹر سانیال کی طرف سے یہ درخواست بھی گزری کہ گورنمنٹ مسٹر سانیال کے لیے اپنے خرچ پر وکیل کا انتظام کرے۔

گورنمنٹ کی طرف سے وکیل کے انتظام کی درخواست

یہ درخواست ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی توجہ کے لیے اسپیشل مجسٹریٹ نے ارسال کر دی ہے۔ وکلائے ملزمین ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس سے سلسلۂ جنبانی کر کے آیندہ پیشی کے دن تک بیڑیوں کے پہنانے یا نہ پہنانے کا معاملہ طے کریں گے۔

ملزمین کمرۂ عدالت میں آتے اور جاتے وقت نہایت زور سے "بندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نہایت موثر اور پُر جوش نعرے لگاتے ہیں۔ مجسٹریٹ یا پولیس نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ عموماً ملزمین کے جذبات کی عزت کی جاتی ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

خاص خوراک کا انتظام

گذشتہ ہفتہ میں ملزمین نے اسپیشل مجسٹریٹ کو درخواست دی ہے کہ ابھی تک وہ اپنے صرفہ سے اپنی خوراک کا انتظام کرتے رہے ہیں۔ اب ایسا نہیں کر سکتے اور جیل کی خوراک ان کے حال کے مناسب نہیں، لہٰذا ان کے لیے خاص خوراک کا انتظام کیا جائے معلوم ہوا کہ یہ درخواست بھی اسپیشل مجسٹریٹ نے سفارش کے ساتھ گورنمنٹ کو ارسال کر دی ہے۔

جبل پور سے گرفتار ہو کر آنے والے ملزم کی شناخت کی کارروائی آج رائے بریلی میں ہو رہی ہے۔ رائے بریلی کے ملزم بنواری لال کی شناخت بھی آج ہی ہونے والی ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

ملزمین کا مقاطعہ جوعی

لکھنؤ۔ ۲۳ر دسمبر: تین اور اشخاص جو ابھی حال میں کاکوری ڈکیتی کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے۔ لکھنؤ لائے گئے۔ ان میں سے ایک پی کمار چٹرجی جبل پور میں اور دوسرے بنواری لال رائے بریلی میں گرفتار ہوئے، تیسرے بھوپال میں۔ یہ سچیندر ناتھ سانیال کے

چھوٹے بھائی ہیں۔

اسی مقدمہ کے ۱۱ملزمین نے بطور احتجاج کے ۲۱/ دسمبر سے مقاطعہ جوئی کر رکھا ہے، ان کی شکایت یہ ہے کہ انھیں جیل سے عدالت تک بیڑیاں پہنا کر لے جایا اور لے آیا جاتا ہے۔ ۴۸ گھنٹہ کے فاقہ کے بعد ان کے وکیل پنڈت ہر کرن ناتھ مصرا نے انھیں سمجھا بجھا کر کھانے پر راضی کیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

مقدمہ کاکوری میں انقلاب — دو مجرمین نے اقبال جرم کرلیا

لکھنؤ۔ ۲۱/ دسمبر: آج جب کہ کاکوری ریل ڈکیتی کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو مجرموں (۱) بنارسی لال (مجرم نمبر ۲۷) اور (۲) اندو بھوشن مترا (مجرم نمبر ۱۶) کو اس شرط پر معافی دی گئی کہ وہ اپنے معلومات کی بنا پر تمام حالات کا مکمل انکشاف کر دیں گے۔ تاکہ اس مقدمہ کے متعلق مجرموں کے بابت جو کچھ معلوم ہے یا ایسے لوگوں کے متعلق علم ہے، وہ سب کو معلوم ہو جائے۔ اب وہ گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔

چوں کہ ابھی دو مجرم جگیش چٹرجی اور راجندر لاہری کلکتہ و بہار سے لکھنؤ نہیں پہنچے ہیں۔ اس لیے مقدمہ ملتوی کر دیا گیا ہے اور آیندہ سماعت کی تاریخ چوتھی جنوری مقرر کی گئی ہے۔

(روزنامہ عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۳)

کاکوری ڈکیتی کا سلسلہ — ایک اور طالب علم کی گرفتاری

الٰہ آباد۔ ۱۷/ دسمبر: الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک فورتھ ایئر کلاس کے طالب علم مسٹر پھپھندرا ناتھ سانیال کو ان کے قیام گاہ واقع کرنل گنج الٰہ آباد میں پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ پولیس کا بیان ہے کہ ملزم کو بھک سے اُڑ جانے والی اشیاء کے قانون کے ماتحت گرفتار کیا گیا ہے، کیوں کہ ان کے پاس بائی کاربونیٹ آف سوڈا کا ایک پیکٹ برآمد ہوا تھا، نیز ملزم کا تعلق کاکوری ٹرین ڈکیتی سے بھی پایا جاتا ہے۔ ملزم کے وکیل مسٹر ایچ۔ ایم۔ رائے نے

جوائنٹ مجسٹریٹ کے اجلاس میں ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کی درخواست پیش کی تھی جس کی پولیس کی طرف سے مخالفت کی گئی۔ کیوں کہ ان پر ایسے جرم کے ارتکاب کا الزام ہے جس کی سزا حبسِ دوام ہے۔ مجسٹریٹ نے درخواست ضمانت پر حکم دیا جانا ملتوی کر دیا ہے اور پولیس کو آٹھ یوم کی مہلت بغرض تفتیش مزید منظور کی ہے۔ غالباً الہ آباد کے مجسٹریٹ کے یہاں یہ کارروائی......۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۳۰/ دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵)

۶/ فروری کی کارروائی

لکھنؤ۔ ۷/ فروری : مقدمہ سازش ڈکیتی ریلوے کاکوری شنبہ گذشتہ کو پھر مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا۔

بخشی کے باپ کا مکان و سامان واگذار

ابتدا میں صاحب مجسٹریٹ نے اس درخواست پر اپنا حکم صادر کیا، جو ایس، این، بخشی روپوش ملزم کے باپ کی طرف سے اپنے مکان و سامان کے واگذاشت کیے جانے کی بابت پیش کی گئی تھی، جس کو پولیس نے اس کے روپوش ہو جانے کے بعد بحکم عدالت قرق کر لیا تھا۔ درخواست میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ مکان اور اس کا سارا سامان بخشی کے باپ کی ملکیت ہے اور صرف ٹینس کا ایک شکستہ ریکٹ اور چند کتابیں بخشی کی ملکیت ہیں۔ اثبات جرم کی طرف سے اس امر کا زور دیا جاتا ہے کہ اصول دھرم شاستر کی رو سے آبائی جائداد و سامان پر بخشی ملزم کی ملکیت قائم ہے۔ صاحب مجسٹریٹ نے وکلائے فریقین کے دلائل پر غور کرنے کے بعد حکم دیا کہ اشیاء مندرجہ فہرست از (۵) لغایت ۱۰۶ جو ایس، این، بخشی ملزم کی ملکیت ہیں، بدستور قرق رہیں اور باقی تمام اسباب اور مکان جو اس کے والد کی ملکیت ہے اس کے حق میں واگذار کر دیا جائے۔

شاہ جہاں پور کے ڈاکٹر کی شہادت

ڈاکٹر درگاپال ساکن شاہ جہاں پور نے اپنی شہادت میں ہر گوبند کے مکان کی تلاشی

کے حالات بیان کیے، پنڈت ہر کرن ناتھ مصر بیرسٹر وکیل ملزمین کی جرح پر گواہ نے کہا کہ تلاشی دو گھنٹے کے قریب جاری رہی اس کو یاد نہیں کہ جس بکس سے چھری برآمد ہوئی تھی، اس میں اور کیا کیا چیزیں تھیں، وہ اگرچہ برہمن ہے مگر اس نے کبھی خود ہوَن نہیں کیا، البتہ دوسرے لوگوں کے ہاں اس رسم (ہوَن) میں شریک ہوتا رہا، جس میں مٹھائی بنتی تھی، اسے یاد نہیں کہ ہرگوبند کے مکان میں کوئی "ہوَن کنڈ" تھا، اس نے اکثر صبح کے وقت ہرگوبند کو سواہ، سواہ جپتے سنا تھا۔

ایک اور گواہ شاہ جہاں پور کی شہادت

اصغر علی خاں ساکن شاہ جہاں پور نے اپنی شہادت میں پریم کشن ملزم کے مکان کی تلاشی کا ذکر کیا (فہرست اشیاء کو جو تلاشی میں برآمد ہوئی تھیں پہچانا) مسٹر گووند بلبھ پنت وکیل ملزم کی جرح میں گواہ نے بتایا کہ جب اس کو بلایا گیا تو پستول کی بابت کوئی تذکرہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمرہ کے اندر ایک بکس تھا، گواہ نہیں کہہ سکتا کہ برابر والے کمرہ میں کون رہتا تھا، اس کو نہیں معلوم تھا کہ کتنے کمرے پریم کشن کے قبضہ میں تھے۔ سوٹ کیس کی تلاشی لینے سے قبل سب انسپکٹر نے پستول کی بابت دریافت کیا۔ پریم کشن نے اس کے اپنے قبضہ میں ہونے کا اقبال کیا، اور سوٹ کیس کھولا، سب انسپکٹر نے خود پستول اس کے لائسنس، چار پانچ ریل کے ٹکٹوں اور ایک چھوٹی سی نوٹ بک کو اپنے قبضہ میں لے لیا (نوٹ بک کو عدالت میں پہچانا) اسے یاد ہے کہ جب سب انسپکٹر تلاشی کے لیے گیا تو پستول اس کے ہاتھ میں نہیں تھا، نوٹ بک پر گواہ کے دستخط نہیں ہیں۔

گواہ کانپور کی شہادت

سید مرتضی حسین ساکن کانپور نے جس کی کپڑے رنگنے اور دھونے کی دکان ہے۔ اپنی شہادت میں راج کمار سنہا کے مکان کی تلاشی کے حالات بیان کیے، راج کمار اور اس کا باپ اس وقت مکان میں موجود تھے، راج کمار خط لکھ رہا تھا، اس کے باپ نے مکان کے اندر پہنچنے پر گواہ سے کچھ نہیں کہا، گواہ نے راج کمار کو خط کا ورق الٹتے اور پشت پر کچھ لکھتے نہیں دیکھا، گواہ ان خطوط کے نمبر سلسلہ نہیں بتا سکتا۔ وہ حلفیہ کہہ سکتا ہے کہ راج کمار نے پہلے اردو میں اپنے باپ سے گفتگو کی، راج کمار نے چاروں خطوط سب انسپکٹر کے ہاتھ سے چھین لیے، ان میں

سے دوز مین پر گر پڑے، وہ جو اس کے ہاتھ میں تھے ان کو وہ تلف کرنا چاہتا تھا۔ مگر سب انسپکٹر نے لپک کر ان کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

بقیہ کالم ۳

سردار... سنگھ اور میسر شاہ جہاں پور نے اپنی شہادت میں رام پرشاد کے مکان کی تلاشی کے حالات بیان کیے (فہرست اشیاء بر آمد شدہ کو پہچانا) مسٹر پنتھ کی جرح میں کہا کہ تلاشی... بجے سے کوئی دس بجے تک ہوتی رہی، مکان کے باہر دس بارہ پولیس کانسٹبل گھیرا ڈالے ہوئے تھے، گواہ کی پریم کشن سے کوئی دوستی یا دشمنی نہیں ہے، اس کو پولیس سے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی کہ رام پرشاد کے دروازہ کو تاڑ تا رہے۔ اس نے رام پرشاد کی نقل و حرکت کی کوئی یادداشت نہیں لکھی۔

اس کی پریم کشن سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی، بہت سے لوگ اس وقت مکان کے باہر جمع ہو گئے تھے، جب اندر تلاشی ہو رہی تھی، پولیس نے ان لوگوں کو نہیں ہٹایا، اور جو لوگ مکان کے اندر جانا چاہتے تھے، ان کو بھی نہیں روکا، سات آٹھ آدمی مکان میں داخل ہوئے تھے، گواہ نے پہلے کہا کہ رام پرشاد کا باپ نہیں تھا، پھر اس کو موجود بتایا، اس کی ماں بھی موجود تھی۔ رام پرشاد کو ٦ بجے صبح کے گرفتار کیا گیا، اس کے بعد کوئی شخص اس سے بات چیت نہیں کر سکا اور اسے گرفتاری کے بعد ہی پولیس کی زیر حراست کوتوالی میں بھیج دیا گیا۔

سب انسپکٹر کانپور کی شہادت

چندن سنگھ سب انسپکٹر پولیس کانپور نے اپنی شہادت میں رام دلارے ملزم کے مکان کی ۲۶؍ ستمبر کو تلاشی لینے کا حال بیان کیا۔ رام دُلارے اس وقت مکان پر موجود تھا، (گواہ نے عدالت میں رام دلارے کو شناخت کیا مگر ذرا دقت کے ساتھ) تلاشی کے بعد ملزم گرفتار کر کے تانگہ میں پردہ کے ساتھ جیل لے جایا گیا، (گواہ نے فہرست اشیاء تلاشی اور چند پوسٹ کارڈوں کو پہچانا، جو تلاشی میں ملے تھے) اس کے بعد عدالت کا اجلاس ڈھائی بجے کے بعد برخاست ہو گیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۰؍ فروری ۱۹۲۶ء، ص ٦)

۸؍ فروری کی کارروائی

لکھنؤ۔ ۸؍ فروری : مقدمہ ڈکیتی کاکوری کی کارروائی دوشنبہ کو گیارہ بجے دن کو پھر مسٹر سید امین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس میں شروع ہوئی۔ ملزمین حسب معمول حب وطن کا ایک گیت گاتے ہوئے کمرہ عدالت میں داخل ہوئے۔

تھانہ دار حضرت گنج پر جرح

چودھری اشفاق حسین صاحب انسپکٹر انچارج تھانہ حضرت گنج پر بابو موہن لال سکسینہ وکیل ملزمین کی طرف سے جرح کی گئی۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ بنواری لال اقبالی ملزم تھانہ حضرت گنج کی حوالات میں رہتا ہے۔ ڈی۔ این۔ چودھری ملزم کو ڈاکٹر سرکاری کے دواخانہ واقع سنٹرل روڈ لکھنؤ سے گرفتار کرنے کے متعلق گواہ نے کہا کہ نصف گھنٹہ کے قریب اس کی جامہ تلاشی میں صرف ہوا۔ نوٹ جو تلاشی کی فہرست میں درج ہیں وہ ایک پرس (کیسہ) کے اندر تھے جو ملزم نے اپنی قمیض کے اندر رکھ چھوڑی تھی، گھڑی، فاؤنٹن پین اور رومال کے سوا باقی سب چیزیں اسی پرس میں تھیں۔ پرس کو فہرست میں درج کرنا غلطی سے رہ گیا، وہ موجود تھی اور چودھری کو واپس کردی گئی تھی۔ ملزم کو دواخانہ سے پیدل ہوٹل میں لے جایا گیا۔ اس نے اپنے منہ پر کپڑا ڈال لیا تھا۔ گھر کے اندر جو چیزیں ملی تھیں ان کو گواہ نے بدیں وجہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا کہ چودھری نے گواہ سے کہا کہ اس کی غیر حاضری میں کوئی شخص اس کے سامان کی نگہداشت کے لیے نہیں ہے۔ آرڈر بک بھی اسی کمرہ سے ملی تھی، اس نے ہر کپڑے کو جو وہاں ملا تھا غور سے دیکھا اور اس کی کیفیت فہرست میں درج کردی۔ دھوبی کی نشانی کے پانچ نقطے اس نے کپڑوں پر تلاش کیے کیوں کہ اس کو اس نشانی کے دیکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ دیگر نشانات اگر کپڑوں پر تھے تو اس نے ان کو درج نہیں کیا۔ گاڑھے کے جھاڑن پر دھوبی کے ۵ نقطوں والی نشانی بھی ہے اور گواہ کے دستخط بھی ہیں اس کے خیال میں اس جھاڑن کی دستیابی خاص وقعت رکھتی تھی۔ چوں کہ اس پر پانچ نقطے موجود تھے، اس لیے اس نے اپنے دستخط ان نقطوں پر نہیں کیے۔ اگر ان پانچ نقطوں کو مٹادیا جائے یا یہ حصہ جھاڑن کا پھاڑ دیا جائے تو پھر کوئی نشانی اس پر باقی نہ رہے گی۔ اگر اس کے دستخط ہوتے تو بھی اس کے پھاڑ دیئے جانے کا

اندیشہ تھا، مزید سوالات پر گواہ نے کہا کہ انسپکٹران سی۔ آئی۔ڈی تلاشی کے وقت کمرے میں موجود اور چارپائی پر بیٹھے رہے۔ انھوں نے تلاشی میں کوئی مدد نہیں دی۔ صرف بر آمد شدہ اشیاء کو دیکھتے رہے۔

اقبالی ملزم کا مزید بیان

شاہ جہاں پور کے بنگالی نوجوان اندر بھوشن مترا طالب علم گورنمنٹ ہائی اسکول نے اپنی مزید شہادت میں بیان کیا کہ اس کو اس مقدمہ میں معافی دے دی گئی ہے، وہ رام پرشاد ملزم سے دو تین سال سے واقف تھا اور رام پرشاد نے اس کو کئی کتابیں پڑھنے کو دی تھیں، جن کے نام "بندی جیون"، "...... ہندوستان وامریکہ"، "انقلاب روس کی دادی" وغیرہ تھے، ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انگریز ہندوستان پر ناجائز طور پر حکمران ہیں، ادھر ان کو استبدادی طریقوں سے خارج کرنا...... رام پرشاد نے انقلابی درویش باسنی پرت نویدن" کے رسالے بھی اسے پڑھنے کے لیے دیئے تھے اور ایک زرد دو ورقہ بھی دیا تھا، ان سے گواہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسے انقلابی انجمن میں شامل ہو جانا چاہیے، یہ احساس اپنا اس نے رام پرشاد سے بیان کیا اور اس سے کچھ کام کرنے کے لیے مانگا۔ رام پرشاد نے کہا کہ چٹھیاں تمھارے نام آئیں گی، ان کو تم بغیر پڑھے مجھے لاکر دے دیا کرنا۔ رام پرشاد نے انقلابی انجمن کے قواعد و ضوابط بھی بتلا دیئے، جن کا مطلب یہ تھا کہ اسلحہ کی مدد سے انقلاب پیدا کر کے آزادی حاصل کی جائے گی اور اس کام کے لیے ہتھیار اور روپیہ ڈکیتیوں سے اور عوامی ورزشی کھیلوں کی انجمنوں سے حاصل کیے جائیں گے۔ اس کے پاس ۱۵-۲۰ چٹھیاں رام پرشاد کے لیے آئیں، جو اس نے لے جاکر اس کو دے دیں۔ یہ چٹھیاں بنارس، الہ آباد، کانپور، لکھنؤ، میرٹھ، کلکتہ وغیرہ سے آئی تھیں۔ چنانچہ یہ چٹھیاں اس نے کھولیں اور ان کو پڑھا، ان میں عجیب وغریب نام مثلاً کواٹلپ اسٹور (شہاب) "نواب" کالی بابو وغیرہ علامات امتیاز کے درمیان درج تھے۔

(۱۱رفروری ۱۹۲۶ء)

انقلابی ارکان کو آگاہی

اندر بھوشن مترا نے آگے چل کر اپنی شہادت میں بیان کیا کہ رام پرشاد کی گرفتاری کے وقت وہ اس کے مکان پر موجود تھا اور اس نے رام ناتھ پانڈے کے کو بمقام بنارس ایک چٹھی لکھی تھی، کیوں کہ رام پرشاد نے اس کو اشارہ کیا تھا اور چپکے سے بھی کہا تھا، اس چٹھی کے ذریعہ سے وہ انقلابی انجمن کے ارکان کو آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ رام پرشاد کے ہاں ایک تحریر شدہ چٹھی موجود تھی جو پولیس والوں نے دیکھ لی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ رام پرشاد کی گرفتاری کے بعد وہ اشفاق اللہ سے ان کے مکان پر جا کر ملا، آخری دفعہ وہ اشفاق اللہ سے ماہ ستمبر میں اس کے مکان پر ملا تھا، اسے معلوم تھا کہ اشفاق اللہ بھی انقلابی انجمن کا ایک ممبر ہے، اسی لیے وہ اس کے مکان پر گیا اور رام پرشاد، ہر گوبند و بنارسی لال کی گرفتاری کی اس کو اطلاع دی۔ ہر گوبند کی بابت اسے معلوم تھا کہ وہ انقلابی انجمن کا ممبر ہے مگر بنارسی لال کی نسبت اسے یہ معلوم نہیں تھا۔

ریلوے ٹرین کی ڈکیتی

کاکوری کی ریلوے ٹرین کی ڈکیتی کے متعلق اسی اشفاق اللہ سے بات چیت ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ انقلاب پسندوں کا کام ہے، وہ اندر بھوشن سنگھ سے واقف تھا اور اسے انجمن کا ممبر سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ اشفاق اللہ سے اس نے پریم کشن کے ممبر ہونے کی بابت پوچھا تو اس نے کہا ہم ایسے ویسے لوگوں کو ممبر نہیں بناتے۔ اور اس کی . . . بھی ہو گئی۔ پریم کشن کے پاس ایک پستول ملی۔ ایک دفعہ رام پرشاد سے پریم کشن کے اس پستول کی بابت ذکر آیا تو اس نے کہا کہ وہ بہت اچھا پستول ہے اور دور تک مار سکتا ہے۔ گواہ نے ایک کاغذ پر تاب دل کے نام سے جاری کی تھی (کاغذ کو پہچانا) یہ اس کے قواعد و ضوابط وغیرہ ہیں۔ رام پرشاد نے اس سے کہا تھا کہ شاہ جہاں پور کا نقشہ بنایا جائے اور خفیہ پولیس پر معمولی پولیس، دولت مند اشخاص، لائسنس داران اسلحہ و دیگر انعام کی بابت معلومات مہیا کی جائے۔ رام پرشاد نے سپید ورقہ تقسیم کرنے کے لیے اس سے کہا تھا مگر اس نے کہا کہ وہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ اس گفتگو کے دو تین روز بعد وہ ورقے نویں جماعت کے مانیٹر کے نام ڈاک میں آئے اور اس نے اور دیگر لڑکوں نے اسکول کے لڑکوں کو پڑھایا۔

ریلوے ٹرین کی ڈکیتی سے دس بارہ روز قبل باہر سے کچھ آدمی شاہ جہاں پور میں آئے تھے اور ٹکیسر سرائے میں رام پرشاد کے مکان کے سامنے ٹھہرے تھے۔ وہ رام پرشاد کے پاس آئے تھے۔ وہ یوپی کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان میں ایک بنگالی بھی تھا۔ ان آدمیوں کو اس لیے رام پرشاد کے مکان پر بھی دیکھا تھا، ریلوے ڈکیتی سے چار پانچ روز قبل وہ رام پرشاد سے ملا تھا اور اتنے ہی دنوں بعد بھی اس کو دیکھا تھا، وہ رام پرشاد کے مکان سے کوئی سو قدم کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ رام پرشاد درمیانی ایام میں شاہ جہاں پور میں نہیں تھا، وہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا جو لوگ باہر سے آئے تھے ان میں سے بعض آدمیوں کو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر اتنے زیادہ آدمی پہلے کبھی نہیں آئے تھے، وہ ان سب کو انقلابی انجمن کا ممبر سمجھتا تھا۔ ممبر دوسرے نام اختیار کر لیتے تھے۔ رام پرشاد، سچیندر ناتھ سانیال کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کو اپنا گرو سمجھتا تھا، اس نے اسپیشل مجسٹریٹ کے روبرو ۱ را کتوبر کو اپنا بیان دیا تھا جو بیان اس وقت اس نے دیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ گواہ نے راجندر ناتھ لاہری کو شناخت کیا، مگر چھوا نہیں، گواہ پر ملزمین کی طرف سے کوئی جرح نہیں ہوئی۔

ریلوے اہلکار کی شہادت

بھولا ناتھ سری واستو ریلوے بکنگ کلرک بنارس نے اپنی شہادت میں بیان کیا کہ ٹکٹوں کے رجسٹر سے ظاہر ہوتا ہے کہ درمیانہ درجہ کا ایک ریٹرن ٹکٹ رعایتی شرح پر اس نے ... ستمبر ۱۹۲۵ء کو برائے اَپ میل کے لیے دیا تھا۔ میل اس کے اسٹیشن سے دس بجے دن کے روانہ ہوتی ہے اور دس بجے شب کے مراد آباد پہنچتی ہے۔ یہاں میرٹھ کے لیے ٹرین تیار ملتی ہے (ٹکٹ کو پہچانا) یہ اس ٹکٹ کا پہلا نصف حصہ ہے، جس سے بنارس سے مراد آباد تک سفر کیا گیا۔ جرح میں کہا کہ مسافر کو یہ ٹکٹ مراد آباد پر دینا چاہیے تھا۔ مگر بہت سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ اگر مسافر دروازہ سے باہر نہیں گیا تو ٹکٹ کلکٹر اس سے ٹکٹ نہیں لے سکتا تھا۔ میل میں تیسرا درجہ نہیں ہوتا ہے۔ (مسٹر چودھری وکیل ملزمین نے ان سوالات پر اعتراض کیا)۔

کانسٹبلانِ اسٹیشن لکھنؤ کی شہادت

چھید سنگھ کانسٹبل چار باغ اسٹیشن لکھنؤ نے شہادت میں بیان کیا کہ اس نے خالی

کارتوس تھانہ چار باغ میں داخل کیے تھے۔ وہ ۱۰/ اگست کو ریلوے ڈکیتی کے موقع پر گیا تھا۔ سات کارتوس ڈکیتی کے موقع سے اس نے اٹھائے تھے۔ ان میں سے ایک بھرا ہوا اور باقی ماندہ خالی تھا، بھرا ہوا کارتوس اس نے ریل کی پٹری کے برابر سے اٹھایا تھا۔ خالی کارتوس لائن کے دونوں طرف بکھرے پڑے تھے۔

شیو بخش سنگھ دوسرے کانسٹبل چار باغ اسٹیشن نے کہا کہ وہ ٹرین کی ڈکیتی کے موقعہ پر گیا تھا اور بے دستہ کی کلہاڑی سنسیاں لوہے کی دیگر اشیاء پانچ خالی کارتوس، لالٹین اور کلہاڑی کا دستہ وغیرہ چیزیں اس نے وہاں سے لے کر مال خانہ میں داخل کی تھیں۔

حشمت علی کانسٹبل نے ڈکیتی کے موقعہ پر جانے اور دو خالی کارتوس وہاں سے اٹھا کرلانے کی شہادت دی۔

مسٹر چودھری وکیل ملزمین نے صاحب مجسٹریٹ سے کہا کہ وہ اسے کوئی تاریخ بتائیں، جس روز وہ نرائن چودھری ملزم کو سٹی مجسٹریٹ کے ہاں لے جا کر ۳۰/ جنوری والے گارڈ کے ایک کانسٹبل کے خلاف گالیاں دینے اور حملہ کرنے کا مقدمہ فوجداری داخل کردیں۔ مسٹر چودھری نے کہا کہ پولیس ۳۰/ جنوری کے واقعہ کی بابت مقدمہ چلا رہی ہے۔ اس کو اگر ترک نہ کیا گیا تو ہم آخر وقت تک مقدمہ لڑیں گے۔ صاحب مجسٹریٹ نے مسٹر چودھری کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی نالش ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے یہاں دائر کریں۔ چنانچہ آج غالباً نالش دائر ہوگئی ہوگی۔

مسٹر چودھری نے ملزمین کے نشانات انگشت پولیس کی طرف سے لیے جانے کے خلاف چیف کورٹ میں درخواست دی، مگر آنریبل چیف جج صاحب نے درخواست کو مسترد کردیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۱/ فروری ۱۹۲۶ء، ص ۴)

مقدمہ سازش و ڈکیتی کاکوری

لکھنؤ۔ ۱۱/ فروری : کل ۱۰/ فروری کو مقدمہ ٹرین ڈکیتی کاکوری کی سماعت شروع ہونے پر وشنو سرن ملزم نے میرٹھ کے یتیم خانہ کا رجسٹر حاضری طلب کیے جانے کے لیے

درخواست پیش کی تا کہ وہ اس بات کو ثابت کر سکے کہ جو لڑکے بینڈ بجاتے تھے وہ ۱۳ یا ۱۴/ ستمبر کو یتیم خانہ میں موجود تھے مگر عدالت نے درخواست نامنظور کر دی۔

اس کے بعد رام دلارے ملزم کو ایک ہندی کتاب دکھائی گئی جس کا اس نے اپنے مکان سے برآمد ہونا اور اس کے متعلق دیگر حالات بیان کیے۔

پھر مسمّی پر بھودیال ملازم پنجاب نیشنل بینک کی شہادت ہوئی جس نے گذشتہ دو ڈھائی سال سے اپنا بینک کی ملازمت میں ہونا بیان کیا۔ اس سے قبل وہ اخبار "ورتمان" کے دفتر میں کلرک تھا۔ گواہ نے آگے چل کر ۲۴ء کے ماہ دسمبر یا نومبر میں شہید اکالی کا ایک ڈرامہ ہونا بیان کیا جس میں چند طلبا اور ماسٹر شریک ہوئے تھے۔ طلباء اور ماسٹروں کے علاوہ چند ایکٹر بھی تھے۔

آگے چل کر گواہ نے رام دُلارے ملزم کو شناخت کیا جو ڈرامہ کے رِہرسلوں میں شریک ہوا تھا۔ اصل ڈرامہ چار باری باغ میں کھیلا گیا تھا۔

استغاثہ کی جرح میں گواہ نے کہا کہ جس مقام پر رِہرسل ہوتا تھا وہاں ویسی روشنی نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اصل ڈرامہ کے وقت ہوتی تھی۔ رہرسل کے وقت جو لوگ ملازم تھے ان کے نام گواہ کو یاد نہیں تھے۔ وہ ان کی عمر اور حلیہ بتا سکتا تھا۔ ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا کہ "ایکٹروں کے سوا کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں"۔

اس کے بعد سناتن دھرم کالج کے ایک طالب علم ستگر سہائے کی شہادت ہوئی جس نے شہید اکالی کے ڈرامہ میں شریک ہونا بیان کیا۔ اور رہرسل کے متعلق تفصیلی حالات بیان کر کے رام دلارے ملزم کو شناخت کیا اور کہا کہ وہ بھی رہرسل میں موجود رہتا تھا۔

جرح میں گواہ نے کہا کہ بیر بھدر اس ناٹک کا سکریٹری تھا جو گرفتار ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ رہرسل میں شریک ہوتے تھے ان کے نام یاد نہیں مگر رام دُلارے کو ان لوگوں میں سے شناخت کیا جو رہرسل میں شریک ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ شہید اکالی کا رہرسل راشتری اسکول کی دوسری اور تیسری منزل میں ہوا تھا۔ اس موقع پر عدالت برخاست ہو گئی۔

(ہمدرد۔ دہلی، فروری ۱۹۲۶ء)

۱۵/ فروری کی کارروائی

لکھنؤ۔ ۱۶/ فروری : ۱۵/ فروری ۲۷ء مسٹر چودھری نے عدالت سشن میں مسٹر ہملٹن کے سامنے ملزمین کی طرف سے پیروی کرتے ہوئے فرمایا کہ بنارسی لال کی شہادت کی تاریخی ترقی پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے جو اس نے جملہ واقعات کو ایک سیاسی سازش ثابت کرنے کے لیے عدالت میں دی ہے۔ اگر گواہ کا بیان صحیح ہے تو جوگیش نے جب میٹنگ کی ہے اس وقت تک کوئی سازش ثابت نہیں ہے بیان کچھ اس طرح کا ہے جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ سارے واقعات محض مقدمہ قایم کرنے کے لیے گڑھے گئے ہیں اور اس طرح بنارسی لال نے مقدمہ بنا کر اور بعد میں سرکاری گواہ بن کر خود مقدمہ سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اس کے بعد مسٹر چودھری نے بنارسی لال کی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ یہ شخص ہمیشہ رفتہ رفتہ اپنے خیالات کو بدلتا رہا۔ لہٰذا محض اس کے بیان پر ملزمین کی بابت کوئی رائے قائم کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہ شخص زمانۂ ترک موالات میں یکایک ترک موالاتی تھا۔ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری تھا لیکن گیا میں جب کانگریس نے کونسلوں میں نہ شریک ہونے کی قرارداد منظور کی تو اس نے ایکبارگی اپنے خیالات بدل دیے۔ اسی کے الفاظ کو لیجیے وہ کہتا ہے کہ کانگریس کے پروگرام میں میرا عقیدہ جاتا رہا اور میں اس سے علیٰحدہ ہو گیا۔ قدیم خیالات اور عقائد کو اتنی جلد اور یوں ترک کر دینا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہر واقعہ کو ایک سازش ثابت کرنے کے لیے اس نے سارے قصے تصنیف کیے ہیں اور گویا تحریک موالات سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ بالکل پارسا ہو گیا۔ بنارسی لال کا بیان ہے کہ چند آدمیوں کی ایک جماعت چھیدی لال کے دھرم شالہ میں آنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسے معلوم تھا کہ پولیس دھرم شالہ کے رجسٹر سے واقف ہے۔ عالم نگر کے واقعہ میں رام پرشاد کی عدم شرکت صرف اس وجہ سے بتائی گئی ہے کہ کاکوری ریلوے ڈکیتی میں اس کی شرکت ثابت کی جائے جو عالم نگر کے واقعہ کے دوسرے ہی دن وقوع پذیر ہوئی۔ بچپوری کی ڈکیتی میں ہر شخص کا نام اس نے گن گن کر بتایا لیکن نواب کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنارسی لال کے بیان میں پورے تصنع اور اعتنا سے کام لیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنارسی لال کو ہر موقع پر یہ خیال گذرتا ہے کہ کہیں اس کا بیان ناقابل قبول نہ ثابت ہو اس لیے اس نے ہر

واقعہ میں اس طرح کڑیاں جوڑی ہیں کہ وہ ایک مکمل سازش ثابت ہو اور اسی وجہ سے سارے واقعات تاریخ وار بیان کیے گئے ہیں۔

مفروضہ انقلابی جماعت کی طرف عدالت کو توجہ دلاتے ہوئے مسٹر چودھری نے فرمایا کہ بنارسی لال کا بیان دیگر ماخوذین کی بابت یہ نہیں کہتا کہ وہ ایک ہی جماعت کے رُکن ہیں جس کے یقیناً کچھ نہ کچھ قواعد و ضوابط ہوں گے۔ لیکن اگر بنارسی کا بیان صحیح ہے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جملہ ماخوذین کسی ایک جماعت کے ممبر تھے۔ اندر بھوشن کی شہادت کو لیجیے وہ بھی محتاج تصدیق ہے گو کہ وہ یہ قبول کرتا ہے۔ اسے خطوط موصول ہوئے اور اس نے پڑھا بھی، اجلاس دوسرے دن کے لیے ملتوی کیا گیا۔

بنارس۔ ۱۴ر فروری : سیٹھ دامودر سروپ کی حالت جو مقدمہ سازش کاکوری میں ملزم ہیں اور ضمانت پر رہا ہوئے ہیں اور اس وقت وِدیا پیٹھ میں مقیم ہیں نہایت نازک ہے اور تشویش کا باعث بن رہی ہے۔ آپ کی دونوں گھٹنوں پر زخم ہو گئے ہیں اور سیدھی نہیں کیے جاسکتے۔ تکلیف زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ حرکت نہیں کر سکتے اور معمولی سی غذا بھی ہضم نہیں کر سکتے۔ فوراً قے ہو جاتی ہے۔ گذشتہ پندرہ دنوں میں آپ پانچ بار بیہوش ہوئے ہیں۔ ہر بار آپ پانچ سے لے کر سات گھنٹے تک بیہوش رہے ہیں۔ آپ کے دوست بڑی محنت سے آپ کی خدمت کر رہے ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۱ر فروری ۱۹۲۶ء، ص ۶)

وکیل ملزمان کی بحث

لکھنؤ۔ ۱۷ر فروری : کل پھر یہ مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت سیشن سے مسٹر چودھری سینئر وکیل ملزمان نے اس امر کی اجازت چاہی کہ وہ منجانب راجندر ناتھ لاہری، منمتھ راج کمار، مکندی اور روشن سنگھ ملزمین تقریر کریں تاکہ وقت میں بچت ہو اور بحث میں بھی آسانی ہو۔

عدالت : لیکن ایک ہی بحث کو بار بار دہرانے کے لیے نہیں۔

مسٹر چودھری : جہاں تک واقعات مقدمہ کا تعلق ہے تکرار ناگزیر ہے۔ صرف زبانی بحث دہرائی نہ جائے گی۔

عدالت : اگر بحثوں میں کچھ فرق ہوگا تو عدالت معترض نہ ہوگی۔ ورنہ عدالت روک دے گی۔

پنڈت جگت نراین صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر جونیئر وکلاء کسی ایسی بحث پر جس کو مسٹر چودھری کر چکے ہیں داد فصاحت دیں گے تو یہ درست نہ ہوگا البتہ اگر کوئی صاحب کسی خاص ملزم کی طرف سے کوئی دوسری بحث اٹھائیں گے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

مسٹر چودھری نے عدالت اور اسیسروں کو مخاطب کرتے ہوئے ملزمین کی جانب سے بحث شروع کی۔ آپ نے جرم سازش پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ ۲۰ آدمیوں پر سازش کے شبہ میں اس وقت عدالت سیشن میں مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ اب عدالت کو دیکھنا ہے کہ آیا ملزمین کے خلاف کافی مواد موجود ہے جس سے اس جرم کی سازشی نوعیت پائی جاتی ہے۔ یقیناً اس میں بہت سے بے گناہ بھی ماخوذ ہوں گے۔ ملزمین کے خلاف اتنی صاف وصریح شہادت ہونی چاہیے جس کی صحت میں عام طور سے شبہ نہ کیا جاسکے۔ اگر کوئی شہادت ذرا بھی مشتبہ ہوئی تو عدالت کو اصولِ بالا مد نظر رکھ کر کوئی کارروائی کرنا چاہیے۔

مسٹر چودھری نے بحث ابتدائی کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مقدمات فوجداری میں ملزم کا بیان بھی ملزم کی طرز روش کا ایک حصہ ہے۔ حتی کہ ڈکیتی میں بھی مختلف ملزمین کے درمیان کوئی نہ کوئی بات مشترک ہوتی ہے۔ مگر ا، ب، ج کسی ڈکیتی کے جرم میں ماخوذ ہیں اور عدالت، د کو اس میں شامل کرنا چاہتی ہے تو عدالت کو چاہیے کہ وہ ا، ب، ج، د کو متحد الاغراض ثابت کرے۔ اور یہ کہ اس جرم میں د کا مفاد بھی اب د کے ساتھ شامل نہیں ہے۔ محض اشتراک عمل سے اتحاد اغراض نہیں ثابت ہوسکتا۔

بیچ پوری ڈکیتی کا حوالہ دیتے ہوئے مسٹر چودھری نے فرمایا کہ جرم سازش کو ڈکیتی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ایک کا صدور دوسرے سے لازم وملزوم ہے۔

کاکوری ڈکیتی کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جہاں تک قانون شہادت دفعہ ۱۰ کا تعلق ہے۔ ملزم کے بیان کے علاوہ اثبات جرم کے لیے کافی دوسری شہادت کی ضرورت ہے۔ عدالت کے سامنے جو کاغذات رکھے ہوئے ہیں یہ تحریری شہادت کا کام دیتی ہیں۔ حالانکہ جب تک ان کے مالکان کا پتہ نہ چلے گا یہ بالکل بیکار ہیں۔ بعض اوقات ان میں کے

خطوط مرسل الیہ تک پہنچے ہی نہیں۔ سانیال کے نام جو لفافہ میز پر رکھا ہوا تھا اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہی قصہ اس خط کا ہے۔

مسٹر چودھری نے عدالت سے استدعا کی کہ اثبات جرم میں ایسے غیر معتبر کاغذات سے کوئی مدد نہ لی جائے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایک مقام پر سازش سے کام لیا گیا ہے تو اسے وہیں تک محدود رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا ہی کہیں اور واقعہ ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ یہ اُسی سازش کا نتیجہ ہے۔

بنارسی لال کی شہادت رام دلارے کے خلاف غیر معتبر معلوم ہوتی ہے۔ بہت ممکن کہ یہ کسی بدلہ لینے کی نیت سے دی گئی ہے۔

بنارسی لال کے جوگیش چندر سے شاہ جہاں پور میں ملنے کی کوئی شہادت نہیں۔ اگر بنارسی لال کی شہادت صحیح تسلیم کی جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت ملزمین میں کچھ لوگ ایسے بھی شامل تھے جن کے مقاصد جماعت کی ضد واقع ہوئے تھے۔

(ہمدرد۔ دہلی، فروری ۱۹۲۶ء، ص ۴)

چرچ مشن اسکول ماسٹر کی شہادت

سب سے پہلے جگن ناتھ مدرس چرچ مشن ہائی اسکول نے شہادت دی اور کہا کہ جادو ناتھ سین کو جانتا ہے جو سال گذشتہ اس کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ ستمبر ۱۹۲۵ء میں ایک روز جادو ناتھ بہت ہی گھبرایا ہوا اس کے مکان پر گیا اور کہا کہ جس ہوٹل میں وہ (جادو ناتھ) رہتا تھا اس میں سے ایک شخص سلمیٰ چودھری ڈکیتی ریلوے کاکوری کے سلسلہ میں گرفتار ہوا ہے۔ گواہ نے اسے مشورہ دیا کہ مغویانہ اور انقلابی لٹریچر اپنے پاس نہ رکھے اور اگر ایسی کوئی کتاب وغیرہ ہو تو اسے جلا دے یا پھینک دے اس۔ نے جن کتابوں کا نام لیا تھا۔ ان میں سے گواہ کو یاد ہے کہ ایک کا نام ''دیش اودھار'' کا بھی تھا۔

جرح میں گواہ نے کہا کہ خود اس نے جادو ناتھ کی شمار کرائی ہوئی کتابوں میں سے ایک بھی نہیں دیکھی۔

ایک اقبالی گواہ کا انکاری بیان

اس کے بعد بنواری لال ولد نرنجن رائے کایستھ عمر ۲۲ سال ساکن موضع ادساہ ضلع رائے بریلی نے شہادت دی کہ وہ اپنا بیان اقبالی واپس لینا چاہتا ہے اور عدالت کے اکثر سوالات کا جواب اس موقع پر دینے سے انکار کیا اور کہا کہ درخواست اقبال جرم اس سے جبریہ لکھوائی گئی تھی اور یہ بتانے سے انکار کیا کہ کس نے جبریہ لکھوائی۔ کئی سوالات کا جواب دینے سے اس وقت انکار کرنے کے بعد ملزم نے کہا مسٹر ہارٹن اور انسپکٹر گوبند بہاری نے آج صبح کو اس سے اصرار کیا کہ اسے عدالت میں اپنا بیان مندرجہ درخواست عدالت کے سامنے لفظ بلفظ دہرانا چاہیے اور اس میں بعض ایسی باتیں بھی اضافہ کرنا چاہتے تھے جو وہ اس وقت عدالت کے سامنے دُہرانا نہیں چاہتا۔ مسٹر ہارٹن نے کہا کہ اگر وہ یہ تمام باتیں عدالت میں کہہ دے گا تو اس کی بریت کی سفارش کی جائے گی۔ گواہ نے اس شرط کو ماننے سے انکار کیا۔ گواہ نے کہا کہ وہ اپنی صفائی اور تفصیلی بیان عدالت میں بعد کو بوقت ضرورت پیش کرے گا۔

پریم کشن کھنہ کا بیان

پریم کشن کھنہ ولد رام کشن کھتری ساکن شاہ جہاں پور نے بیان کیا کہ وہ رام پرشاد سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور نہ اشفاق اللہ کو جانتا ہے۔ اندر بھوشن نے یہ باتیں غلط بیان کیں۔ بنارسی لال اور جگدیش چندر نے بھی غلط بیانی کی۔ عالم نگر ۲۰۵ کنھیالال کے اندراج کے متعلق ملزم نے کہا کہ اس میں کنھیالال میرے خالہ زاد بھائی کا نام ہے جو شہر سیتاپور میں ٹھیکہ کا کام کرتا تھا، اور عالم نگر میں رہتا تھا۔ ۲۰۵ غالباً عالم نگر کے کسی مکان کا نمبر ہے اور چوں کہ یہ اندراج بہت پُرانا ہے اس لیے وہ کہہ نہیں سکتا کہ اس کتاب میں کیوں کر لکھا گیا۔ یہ نہ میرے ہاتھ کا لکھا ہے نہ میرے منشی کے بلکہ کسی اور شخص کے ہاتھ کا ہے۔ عبدالودود کی شہادت کے متعلق، میں ملزم کا ڈکیتی ریلوے کاکوری میں شریک ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ملزم نے کہا کہ چوں کہ اس کا باپ اس حلقہ کا اگزیکیٹو انجینئر تھا اس لیے وہ او۔ آر۔ آر پر اکثر آیا جایا کرتا تھا اور زیادہ تر خود اپنے کاروبار کے سلسلہ میں عبدالودود سے میٹھے پانی کی بوتل اکثر لیا کرتا تھا۔ اور ایک مرتبہ قیمت کے بارے میں مجھ سے اور اس سے تکرار ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مجھے پہچانتا تھا۔ ورنہ موقع واردات پر تو میں موجود بھی نہ تھا بلکہ ۹ راگست کو اپنے کام

سے روسہ گیا ہوا تھا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/ مارچ ۱۹۲۶ء، ص ۸)

کاکوری ڈکیتی و سازش کا مقدمہ

شنبہ کو مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس پر مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کی پھر سماعت شروع ہوئی۔

ایک گواہ شاہ جہاں پور کی شہادت

مہاراج سنگھ ساکن کٹیا ٹولہ شاہ جہاں پور نے بیان کیا کہ رام پرشاد ملزم کو ۲ سال سے جانتا ہے، گواہ علاوہ کاروباری کے بھارت سلک مینوفیکچرنگ کمپنی شاہ جہاں پور کا آنریری مینیجنگ ڈائرکٹر بھی تھا، جس میں رام پرشاد تنخواہ دار منیجر تھا، گواہ نے رام پرشاد کو بہت دفعہ لکھتے دیکھا اور وہ اس کا خط پہچانتا ہے۔ گواہ نے رام پرشاد کی کئی تحریروں کو پہچانا۔

ماہر خط کی شہادت

مسٹر اسٹاٹ اسسٹنٹ گورنمنٹ اگزیمر کاغذات مشتبہ متعینہ دلی نے اپنی شہادت میں بیان کیا کہ وہ لندن یونیورسٹی کے ایم۔اے اور ریڈنگ یونیورسٹی کالج کے ایسوسی ایٹ ہیں۔ ۱۹۱۸ء سے گواہ رسم الخط کے مضمون کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ گورنمنٹ کا ملازم ہوا۔ اور ۱۹۲۳ء میں قایم مقام اگزیمز بھی رہا اس نے کوئی چار ہزار کیسوں کا مطالعہ کیا ہے اور متعدد مرتبہ عدالتوں میں شہادت دی ہے۔ اس نے رسم الخط پر اکثر کتابیں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن میں پڑھی ہیں (کئی کاغذات جو رام پرشاد کے قلم کے لکھے ہوئے بتائے جاتے ہیں دیکھ کر) گواہ کی قطعی رائے ہے کہ یہ سب کاغذات ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے ہیں۔ گواہ نے اپنی رائے کی تائید میں متعدد دلیلیں پیش کیں۔ اس کے بعد دیگر ملزمین کی تحریریں گواہ کو دکھائی گئیں، اور اپنے علیحدہ علیحدہ تحریروں کو دیکھ کر ان کے مشترک راقمان کی لکھی ہوئی ہونے کا اظہار کیا۔ اس کے بعد عدالت کا اجلاس برخاست ہوا۔

(۲۵/ مارچ ۲۶ء)

من موہن ناتھ گپتا ملزم کا بیان

من موہن ناتھ گپتا ولد بابو بشیشر ناتھ گپتا عمر ۱۹ سال ساکن بنارس نے جو اس مقدمہ میں ایک ملزم ہے بیان کیا کہ اس کا مجرمانہ سازش سے جس کا الزام اس پر لگایا گیا ہے۔ کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اس نے مغویانہ پروپیگنڈا اور خریداری اسلحہ اور دیگر اغراض سازش کی ترقی کے لیے کبھی روپیہ جمع نہیں کیا اور سفید پمفلٹ (انقلابی) کے کسی حصہ ملک میں شائع یا تقسیم کرنے میں مدد نہیں دی۔ زرد پمفلٹ کے متعلق اسے کوئی علم نہیں۔ اس ڈکیتی کا اسے کوئی علم نہیں، جس میں ایک شخص موہن لال نامی نمرولی ضلع پیلی بھیت میں ۲۵/دسمبر ۱۹۲۴ء کو قتل کیا گیا۔ اس نے بیچ پوری کی مسلح ڈکیتی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو توتی کوری کے مکان پر کی گئی اور ایک شخص شیام لال بندوق کی گولی سے ہلاک ہوا نہ اس نے دوار کاپور کی ڈکیتی میں کوئی حصہ لیا، جس میں ایک شخص بنام شیوسرن قتل کیا گیا۔ کاکوری کی ریلوے ٹرین کی ڈکیتی میں اس نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ بنارسی لال و عبدالودود وغیرہ نے اس کی جو شناخت کی، اس کے متعلق عدالت ہذا میں کوئی تشریح نہیں کرنا چاہتا، نہ ان اشیاء کی بابت کچھ کہنا چاہتا ہے جو اس کے مکان سے برآمد ہوئیں اور عدالت میں پیش کی گئیں۔ صاحب مجسٹریٹ نے گواہ کے ذہن نشیں کیا کہ وہ اس کو ان باتوں کی وجوہ بتانے کا موقع دے رہے ہیں، جو شہادت میں اس کے خلاف کہی گئی ہیں، مگر گواہ نے ان کی تشریح سے انکار کیا اور کہا کہ یہ غلط ہے کہ انقلابی سوسائٹی میں اس کا نام "نواب" تھا۔ وہ کبھی شاہجہاں پور نہیں گیا، اور عدالت سیشن میں اپنا بیان دے گا۔ صاحب مجسٹریٹ نے ریلوے ٹرین ڈکیتی سے چند روز قبل اس کے بنارس سے غیر حاضر ہونے کی وجہ دریافت کی مگر ملزم نے اس کے بتانے سے انکار کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ اسے یاد نہیں کہ اس نے پورنولیش کمار چٹرجی کو کوئی خطوط بھیجے یا ڈاک میں ڈالے۔ عدالت نے ملزم سے دریافت کیا کہ آیا وہ اثباتِ جرم کے خلاف کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ملزم نے کہا کہ اس نے اپنا بیان اس امر کی بابت عدالت سیشن کے لیے محفوظ رکھا ہے اور اس سوال کا بہتر جواب خود پولیس دے سکتی ہے۔ ملزم نے کوئی گواہ صفائی پیش کرنے سے بھی انکار کیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۵/مارچ ۱۹۲۶ء، ص ۶)

۲۲/ مارچ کی کارروائی

مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کی کارروائی کل پھر مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس پر جاری رہی۔ ملزمین حسب معمول جیل خانہ سے حب وطن کے گیت گاتے ہوئے آئے اور "بندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگاتے ہوئے زینہ پر چڑھے۔

بنواری لال ملزم کے اپنے سابق اقبال جرم کو واپس لینے اور عدالت سیشن میں بیان دینے کا ارادہ ظاہر کرنے اور افسر اعلیٰ پولیس پر صاف الفاظ میں ترغیب دہی کا الزام لگانے سے لوگوں میں ایک سنسنی سی پڑ گئی ہے۔ چوں کہ ملزمین کے بیانات داخل ہونے لگے تھے، اس لیے عام خیال تھا کہ اب اثبات جرم کی شہادت ختم کر دی گئی ہے مگر کل چار مزید گواہ پولیس کی طرف سے پیش ہوئے جن میں سے دو پولیس کے افسران اور ایک سنیٹری انسپکٹر اور ایک جیلر صاحبان تھے۔

انسپکٹر پولیس کی شہادت

جگناتھ پرشاد انسپکٹر نے بیان کیا کہ گواہ نے پریم کشن کھنہ ملزم کے پرانے کاغذات اپنے قبضہ میں لے لیے تھے۔ اس کے پستول کے لائسنس پر پچاس کارتوسوں کی خرید اندراج تھی۔ رجسٹر موجودہ عدالت کانپور کے تاجران اسلحہ بی۔ این۔ بسواس کمپنی کا ہے۔ یہ اندراج اس میں ۷/اگست ۱۹۲۴ء کو کیا گیا تھا اور خریدار کے دستخط بھی اس میں موجود ہیں (عدالت کے کہنے سے پریم کشن کھنہ نے ایک کاغذ پر اپنے دستخط کیے، جن کو رجسٹر کے دستخط سے ملایا گیا)۔ مسٹر چودھری وکیل ملزمین کی جرح میں گواہ نے کہا کہ لائسنس دفتر سی۔ آئی۔ ڈی سے لائے گئے ہیں۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ رجسٹر کب لایا گیا اور کون اس کو لایا۔ یہ کچھ عرصہ سے وہاں رکھا ہوا تھا۔ جہاں تک اس کو معلوم ہے یہ کہیں اور نہیں پہنچایا گیا۔ رجسٹر میں اندراج اس کے سامنے نہیں ہوا۔ کارتوسوں کی خریداری کے بعد پولیس نے تحقیقات کی کہ آیا وہ مستند خریدار نے لیے ہیں۔

سب انسپکٹر خفیہ پولیس کی شہادت

رادھے لال تیواری سب انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی الٰہ آباد نے سپید رنگ کے دو انقلابی

اشتہاروں کو پہچانا، جن میں سے ایک اس نے کناری بازار آگرہ اور دوسرا محلہ مرادت پور سے حاصل کیا تھا۔

سنیٹری انسپکٹر کی شہادت

جوالا پرشاد دوبے سنیٹری انسپکٹر آگرہ نے ایک انقلابی اشتہار موصول ہونے اور ایک ہفتہ بعد اس کو اگز یکیٹو افسر کے پاس بھیجنے کا حال بیان کیا۔ مسٹر چودھری کی جرح میں گواہ نے کہا کہ ایک راہ گیر نے یہ اشتہار اس کو دیا تھا۔ گواہ نے اس کو خود پڑھا۔ پھر پنڈت تارادت ولیس پریسیڈنٹ کو دکھایا، انھوں نے کہا کہ اس کو پولیس میں اگز یکیٹو افسر کو بھیج دیا جائے۔

ڈپٹی جیلر کی شہادت

عبدالشکور ڈپٹی جیلر لکھنؤ نے بیان کیا کہ حکام جیل زیر تحقیقات قیدیوں کو لکھنے کے کاغذات اور لفافے دیتے ہیں۔ یہ لفافہ رام کشن کھتری کا لکھا ہوا ہے۔ تمام چٹھیاں جو مقدمہ سازش کیس کاکوری کے ملزمین کی طرف سے لکھی جاتی ہیں، وہ اسپیشل مجسٹریٹ کو بھیج دی جاتی ہیں۔ رام کشن کھتری نے گواہ کے روبرو بہت سی چٹھیاں لکھی ہیں۔ یہ اسی کی تحریر ہے۔

۲۴/ مارچ کی کارروائی

مقدمہ ڈکیتی کاکوری کی کارروائی ۲۴/ کو مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس پر پھر شروع ہوئی۔ ملزمین لاریوں میں گیت گاتے ہوئے آئے اور "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہوئے کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے۔

چیئرمین میونسپل بورڈ بدایوں کی شہادت

خان بہادر مولوی وحید بخش چیئرمین میونسپل بورڈ بدایوں نے بیان کیا کہ سکریٹری نے گواہ کو ایک سپید اشتہار دکھایا تھا اور اس کے ڈاک میں چیئرمین کے نام آنے کا ذکر کیا تھا۔ گواہ نے حکم دیا کہ اشتہار کو تلف کر دیا جائے یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یا سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بھیج دیا جائے۔

سب انسپکٹر صیغہ خبر رسانی کی شہادت

بابو سریندر ناتھ مکرجی سب انسپکٹر مقامی صیغہ خبر رسانی الٰہ آباد نے بیان کیا کہ سی۔ آئی۔ڈی میں تمام سیاسی مشتبہ اشخاص کے علیحدہ علیحدہ فائل رکھے جاتے ہیں۔ گواہ دمودر سروپ سے واقف نہیں۔ مگر اس نے ایک مرتبہ دمودر سروپ کی ایک چٹھی راستہ میں روکی تھی اور اس کا مضمون صاحب سپرنٹنڈنٹ کی معرفت دفتر سی۔ آئی۔ڈی کو بھیجا تھا جو کاغذات عدالت میں پیش ہے۔ اس پر مسٹر دیو کے مختصر دستخط ہیں اور وہ گواہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر دمودر سروپ کی چٹھی اسمی جتندر ناتھ سانیال کے مضمون کی صحیح نقل ہے۔ گواہ نے اصل چٹھی مکتوب الیہ کو پہنچوادی۔ جتندر ناتھ سانیال، ایس۔این۔ سانیال اور بی۔این۔ سانیال کا بڑا بھائی ہے۔ (مسٹر چودھری وکیل ملزمین نے سوالات وجوابات پر اعتراض کیا)۔ چٹھی میں ''دادا'' کا جو لفظ ہے اس سے ایس۔این۔ سانیال ملزم مراد ہے۔ جتندر ناتھ سانیال ۱۹۲۴ء میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ الٰہ آباد میں انھی کے مکان میں رہتا تھا۔

سانیال ملزم کی جرح میں گواہ نے کہا کہ یہ دمودر سروپ کی روکی ہوئی چٹھی کی صحیح نقل ہے۔ گواہ کو یاد نہیں کہ وہ خط تھا یا پوسٹ کارڈ تھا۔ گواہ تمام خطوط کو جو ۱۹۲۴ء میں اس مکان کے پتے پر آتے تھے، روکتا تھا۔ مگر اس نے کسی چٹھی کو اپنے پاس نہیں رکھا۔ اس نے وسط ۱۹۲۴ء سے چٹھیوں کو روکنا شروع کیا تھا۔ جب وہ (سانیال ملزم) الٰہ آباد سے کہیں چلا گیا تو فروری ۱۹۲۶ء میں چٹھیوں کا روکنا بند کر دیا گیا۔ اسے یاد نہیں کہ اس نے دمودر سروپ کی کوئی چٹھی ایس۔این۔ سانیال کے نام آنے والی، روکی ہو۔ وہ روکی ہوئی چٹھیوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتا (سانیال نے شکایت کی کہ گواہ نے اس کے سوال کا قطعی جواب نہیں دیا) گواہ نے دمودر سروپ کی ایک اور چٹھی ایس۔این۔ سانیال کے نام آئی ہوئی روکی تھی۔ اس کی نقل موجود نہیں ہے۔ گو اس نے اس کی بابت رپورٹ کی تھی۔ جہاں تک اسے یاد ہے دمودر سروپ نے ایس۔این۔ سانیال کی صحت اور مقام وغیرہ کی بابت دریافت کیا تھا اور ''بندی جیون'' کی ایک کاپی مانگی تھی۔ گواہ ہندی نہیں پڑھ سکتا۔ سانیال کے سوال پر کہا کہ اس کا خیال ہے کہ وہ چٹھی انگریزی میں تھی۔ گواہ بنگالی جانتا ہے۔ ''بندی جیون'' کتاب جو بزبان بنگالی عدالت میں موجود ہے اس پر جے۔این۔ سانیال ۱۷۳ چک الٰہ آباد بطور پبلشر درج

ہے۔ جو چٹھی نقل کی گئی ہے وہ بھی اس پتہ پر آئی تھی۔ گواہ نے کبھی ملزم کی نقل و حرکت کو نہیں تاڑا۔ اسے یاد نہیں کہ سانیال نے یہ کہا تھا کہ جب وہ اللہ آباد سے کہیں جائے گا یا آئے گا تو دیکھ بھال کرنے والوں کو مطلع کر دے گا۔ اگر ملزم کے دیکھ بھال کرنے والے اس روانگی سے مطلع ہوتے تو وہ گواہ سے رپورٹ کرتے۔ اس کے بعد چند اور ملزمین کے بیانات لکھے گئے۔

پرتوش کمار چٹرجی خلف راجندر ناتھ چٹرجی ذات بنگالی برہمن ساکن جبل پور نے کسی مجرمانہ سازش کا ممبر ہونے سے انکار کیا۔ انقلابی سپید اور زرد اشتہاروں کا اسے علم نہیں۔ جو باتیں اس کے خلاف کہی گئی ہیں ان سب سے وہ انکاری ہے۔ عدالت سیشن میں بیان دے گا کہ اس کے خلاف کیوں شہادتیں گزریں۔ عدالت کے پیہم سوالات پر اس نے یہی کہا کہ وہ عدالت سیشن میں بیان دے گا۔

وشنو سرن وبلشن ساکن میرٹھ نے مجرمانہ سازش کا ممبر ہونے سے انکار کیا اور کہا کہ وہ ۶/ جنوری ۱۹۲۴ء سے اپنی تاریخ گرفتاری (۲۶/ ستمبر ۱۹۲۵ء) تک ویلش یتیم خانہ میرٹھ کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ وہ ۱۴/ ستمبر کو یتیم خانہ میں موجود تھا۔ مگر ممکن ہے تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا ہو۔ وہ رام پرشاد، آر۔ این۔ لاہری، ایس۔ سی۔ بھٹاچارجی یا دمودر سروپ سے پہلے واقف نہیں تھا۔ وہ یتیم خانہ میرٹھ میں اس مکان پر نہیں آئے نہ اس نے وہ چٹھی ارسال کی جو عدالت میں ہے۔ وہ اندو بھوشن متر اسے واقف نہیں تھا۔ جن کا یتیم خانہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ رام پرشاد یار ورا کو نہیں جانتا تھا۔ چٹھی میں ویلش یتیم خانہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اسے خبر نہیں کہ یتیم خانہ میں ۱۳/ یا ۱۴/ ستمبر کو کوئی جلسہ ہوا تھا۔ انسپکٹر برہما سنگھ اور پھیرو سنگھ پولیس والے نے جھوٹی باتیں کہی ہیں۔ البتہ شب چرن کی گواہی کم و بیش درست ہے۔ وہ اندو بھوشن، ندار مولوی اور حسن احمد یا ولایت رائے، سرجو دیال، انسپکٹر بنرجی و مسٹر ہارٹن کے خلاف کچھ نہیں جانتا۔ مگر اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ انھوں نے سچ کہا ہے۔ صرف پھیرو سنگھ نے اس کو شناخت کیا ہے اور اس کے لیے یہ اتی مشکل نہ تھا کہ یتیم خانہ جا کر اس کو دیکھ آتا۔ اس سے میرٹھ میں بہت سے لوگ واقف ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کے خلاف یہ کیوں مقدمہ چلایا گیا۔ پولیس کو اس کا بہتر علم ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی گواہ صفائی پیش نہ کرے گا۔

ایس۔ سی۔ بھٹاچارجی بھٹاچارجی ساکن کانپور نے مجرمانہ سازش کے ممبر ہونے سے انکار کیا اور اپنا ڈیفنس عدالت سیشن کے لیے محفوظ رکھا۔ وہاں وہ بتائے گا کہ کلن خاں،

روپ نرائن اور وید مو نے اس کو کیوں کاکوری کی ڈکیتی ریلوے میں شریک کے طور پر شناخت کیا۔

مکندی لال ساکن اٹاوہ نے مجرمانہ سازش کا ممبر ہونے سے انکار کیا اور اپنا بیان عدالت سیشن میں دینے کو کہا جس میں وہ ظاہر کرے گا کہ بنواری لال نے کاکوری ڈکیتی ریلوے میں اس کا نام کیوں لیا اور جگناتھ گارڈ اور ستیلا پاسی نے اسے کیوں شناخت کیا۔ اگست ۱۹۲۴ء میں بمقام اس مکان میں موجود تھا جس کو بنارسی لال نے کرایہ پر لیا تھا۔ ملزم نے تسلیم کیا کہ اسے مین پوری کے مقدمہ سازش میں سزا ہوئی تھی۔

(ہمدرد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۲۶ء، ص ۵،۶)

۲۵/مارچ کی کارروائی

لکھنؤ۔ ۲۶/مارچ : کل پھر مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس پر مقدمہ پیش ہوا اور مندرجہ ذیل شہادتیں ہوئیں۔

تاجر اسلحہ کانپور کی شہادت

مسٹر بی۔ سی۔ بسواس مالک دوکان میسرز بسواس کمپنی کانپور نے بیان کیا کہ وہ اس تجارتی دوکان کا حصہ دار ہے۔ وہ اسلحہ اور گولی بارود وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں اور فروخت شدہ اسلحہ اور کارتوسوں کا ایک رجسٹر میں اندراج کرتے ہیں جس کے ایک خانہ میں خریدار سے بھی دستخط کرا لیتے ہیں۔ انھوں نے ۵۰ کارتوس ماسر پستول کے پریم کشن ولد رام کشن اکزیکیٹو انجینئر کے ہاتھ فروخت کیے تھے۔ اس کے لائسنس کا نمبر ۸۳۳ تھا۔ وہ اس شخص کو نہیں پہچان سکتا جس نے رجسٹر کے خانے میں پریم کشن کے نام سے دستخط کیے تھے۔ خریدار نے لائسنس لا کر دکھایا اور کارتوس لے کر دستخط کیے۔ گواہ نے اس کو جو کارتوس دیئے تھے اس پر DWMMX کے حروف درج تھے۔ گواہ کے ہاں کسی اور وضع کے پستول کے کارتوس نہیں تھے۔

مسٹر چودھری کی جرح میں گواہ نے کہا کہ اسے ہر خریدار سے حسب الحکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دستخط لینے پڑتے ہیں۔ یہ حکم زبانی دیا گیا تھا۔ اسے یاد نہیں کہ ان کارتوسوں کے بیچنے

کے وقت کتنے کارتوس دوکان میں تھے، مگر نوے یا سو سے زیادہ نہیں تھے اور اس شناخت کے سوا دوسری شناخت کے کارتوس اس کے ہاں نہیں تھے۔ گواہ ان کارتوسوں کا سول ایجنٹ نہیں ہے۔ وہ ہر دوکان سے مل سکتے ہیں۔ ۷ار اگست ۱۹۲۴ء کے بعد اس نے دیگر خریداروں کے ہاتھ بھی یہ کارتوس بیچے۔ گواہ کم از کم تین سو کارتوس ولایت سے منگا سکتا ہے۔ اس سے کم ہندوستان کے تاجروں سے خرید تا ہے۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ۷ر اگست ۱۹۲۴ء سے قبل اس نے ماسر پستولوں کے کارتوس ولایت سے منگائے تھے یا ہندوستان سے لیے تھے۔

ہر گوبند ساکن شاہ جہاں پور نے بیان کیا کہ وہ سازش میں شریک نہیں تھا۔ ملزم نے ان تمام الزامات سے انکار کیا جو اس کے خلاف لگائے گئے تھے اور سیشن میں اپنا بیان دینے کو کہا۔

پریم کشن، ولد شیو لال کھتری بدایوں نے کہا کہ سازش سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا جس کا اس پر الزام لگایا گیا۔ ملزم نے یہ بھی بیان کیا کہ وہ عدالت سیشن میں اپنا بیان دے گا۔

راج کمار سنہا کا بیان، راج کمار سنہا ساکن کانپور نے بیان کیا کہ اس کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ملزم نے تمام الزامات سے انکار کیا جو اس کے خلاف لگائے گئے تھے۔ ملزم نے کہا کہ اس نے کاکوری ٹرین ڈکیتی یا کسی ڈکیتی میں کوئی حصہ نہیں لیا اور کہا کہ جیل میں عبد الودود، کلو چمار اور جوتی کورمی کی شناخت بالکل غلط تھی۔ اس وقت وہ ان کے متعلق کچھ زیادہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر ضرورت ہوئی تو عدالت سیشن میں بیان کرے گا۔ آگے چل کر ملزم نے بیان کیا کہ مضمون پیش کردہ عدالت میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کو میں نے بنگالی کلب میں پڑھا تھا۔ جس کا آر۔ این۔ لاہری سکریٹری ہے۔ ملزم نے یہ بھی بیان کیا کہ ملک دو سال تک اس کا ہم جماعت تھا۔ اس کا پورا نام سندر موہن ملک طالب علم بنارس یونیورسٹی انجینئرنگ کلاس ہے۔ اشیاء پیش کردہ عدالت اس کے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ ملزم نے کہا کہ ان بندوقوں کے متعلق اسے کوئی علم نہیں ہے۔ جو اس کے کمرے سے برآمد ہوئی تھیں، وہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ ملزم نے کہا کہ میرے لیے یہ ایک پُراسرار واقعہ ہے کہ یہ چیزیں اس کے کمرے میں کس طرح آئیں لیکن میں عدالت سیشن میں اس کی وضاحت کی کوشش کروں گا۔ کسی خود غرض جماعت نے کچھ شرارت کی ہے۔ چار خطوط کا ذکر کرتے ہوئے ملزم نے کہا کہ یہ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کمرے کی تلاشی ضرور لی گئی۔ جس کی اطلاع اسے بشمبر سنگھ نے کان پور سے

دی۔ یہ غلط ہے کہ اس نے یہ چاروں خطوط چھین لیے تھے، آگے چل کر ملزم نے بیان کیا کہ شانتی لال اس کے بھائی سے ملا اور چپکے سے بتایا کہ ایک لانبا شخص تلاشی کے لیے قبل ملزم اس کے کمرے میں گیا تھا۔ شانتی لال جانتا تھا کہ ملزم بنارس میں نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اس لانبے آدمی پر شبہ کیا اور اس سے سبب دریافت کیا۔ اس لانبے آدمی نے بیان کیا کہ وہ چند کتابیں لینے آیا ہے۔ شانتی لال نے پوچھا کہ پھر تم نے کتابیں کیوں نہ لیں۔ اس پر اس نے کہا کہ اس کو دستیاب نہ ہو سکیں۔ شانتی لال نے ملزم کے بھائی سے بیان کیا یہ لانبا شخص سر پر پگڑی اور دھاری دار سفید کرتا پہنے ہوئے تھا اور صورت سے صوبہ جات متحدہ کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ شانتی لال نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی عدالت میں نہیں کہا۔ بلکہ برعکس ازیں اس نے یہ کہا کہ ہم ملزم کے کمرے میں کوئی بھی داخل نہیں ہوا، جو بالکل غلط ہے۔ ملزم نے اپنی کنجی کے گم ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ممکن ہے یہ ٹرین میں یا الہ آباد میں چھوٹ گئی ہو۔ وہ الہ آباد سے بنارس ہرگز نہیں آیا بلکہ کانپور گیا۔

دمودر سروپ ملزم کا بیان آج ہسپتال میں لیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ بیمار ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۸/مارچ ۱۹۲۶ء ص ۵، ۶)

کاکوری ٹرین ڈکیتی

دو اور گرفتاریاں

رنگون۔ ۱۲/اپریل : کاکوری کے مقدمے کے سلسلے میں بی۔ کے۔ بسواس اور بسوانا تھ۔ یہ دو شخص گرفتار کیے گئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں یہاں شمالی ہندوستان سے آئے اور سکھوں کے مندر میں رہتے تھے۔ مقدمہ تھرڈ ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ (روزنامہ عصر جدید، کلکتہ۔ ۱۸/اپریل ۱۹۲۶ء، ص ۳)

کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ عدالت سیشن میں

یکم مئی کی کارروائی

کاکوری ریلوے ڈکیتی کے مقدمہ کی کارروائی گذشتہ شنبہ کو گیارہ بجے دن کے

عدالت سیشن میں مسٹر اے۔ ہملٹن کے اجلاس پر شروع ہوئی جو اس مقدمہ کی تحقیقات کے لیے خاص طور پر مامور کیے گئے ہیں۔ ملزمین جیل خانہ سے حسب معمول لاریوں میں لائے گئے اور وہ گیت گاتے ہوئے آئے۔ سیٹھ دمودر سروپ ملزم جو گزشتہ دو ماہ سے زیر علاج ہے ملزمین کے ساتھ نہیں آیا بلکہ بعد میں اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا۔ اس کی زار و نزار حالت دیکھ کر ملزمین نے گورنمنٹ کے خلاف بہت کچھ طعن و تعریض کی اور شرم شرم کے نعرے لگائے نیز سابق و موجودہ ممبران کی بھی مذمت کی۔ دمودر سروپ درد سے برابر کراہ رہا تھا، جس کا حاضرین کے قلوب پر بھی اثر ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ عدالت نے اس ملزم کی حالت صحت کو جانچنے کے لیے بہترین قابل و تجربہ کار ڈاکٹروں کے بورڈ کو مامور کیا تھا جو کرنیل ہنٹر صاحب سول سرجن لکھنؤ، ڈاکٹر بھاٹیہ صاحب پروفیسر سرجری کنگ جارج میڈیکل کالج (لکھنؤ) اور میجر سلامت اللہ صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ نے ملزم کا بہت غور سے طبی امتحان کرنے کے بعد کوئی خاص جسمانی شکایت نہیں پائی تھی۔ اور گو وہ کچھ کمزور تھا، مگر ان کی رائے میں حاضری عدالت کے قابل تھا، ملزمین نے یہ بھی کہا کہ وہ کوئی ڈیفنس پیش کرنا نہیں چاہتے اور انھوں نے مسٹر چودھری و پنڈت ہر کرن ناتھ کو بھی اپنی طرف سے پیروی کرنے سے منع کر دیا۔

دمودر سروپ کی آمد پر بہت شور و غل برپا ہوا۔ اس وقت تک جج صاحب اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ بعد میں انھوں نے ظاہر فرمایا کہ میڈیکل بورڈ کی رپورٹ کو مد نظر رکھ کر وہ دمودر سروپ کو حاضری عدالت کا حکم دینے پر مجبور تھے۔ انھوں نے خود جیل میں جا کر اس سے پوچھا تھا کہ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی وکیل سرکاری خرچ پر مقرر کرائے تو اس کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ مگر اس نے کسی وکیل کو حکومت سے خرچ پر بھی مقرر کرنے سے انکار کیا اس لیے اس کو عدالت میں بلایا گیا۔

پنڈت جگت نراین صاحب نے اثبات جرم کے پیروکار کی حیثیت میں اس امر پر آمادگی ظاہر کی کہ دمودر سروپ کو اس وقت ملزموں میں شامل نہ کیا جائے۔ اور اس کے تندرست ہونے پر اس کے خلاف وہ علیحدہ مقدمہ چلائیں گے۔ جج صاحب نے وکلائے ملزمین سے اس معاملہ میں مشورہ کیا اور ان کی طرف سے رضامندی ظاہر کیے جانے پر دمودر سروپ کی نسبت حکم دے دیا کہ وہ جیل کے ہسپتال میں رکھا جائے اور عدالت میں دیگر ملزمین مقدمہ

کے ساتھ فی الحال نہ لایا جائے۔ چنانچہ دمودر سروپ کی تحقیقات ہونے کے احکام جج صاحب نے ثبت کیے اور اس کو اسپتال واپس بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد مسٹر چودھری بیرسٹر نے ظاہر کیا کہ بنواری لال ملزم نے ان سے پیروی مقدمہ کی استدعا کی ہے مگرچوں کہ وہ دیگر ملزمین کی طرف سے پیروکار ہیں اور ممکن ہے کہ ان ملزمین اور بنواری لال کے اغراض میں کوئی تصادم ہو اس لیے وہ بنواری لال کی طرف سے پیروی کرنی مناسب نہیں سمجھتے۔ اس پر سیشن جج صاحب نے پنڈت ہر کرن ناتھ مصر بیرسٹر سے بنواری لال کی طرف سے پیروی کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کو بنواری لال اور پنڈت جی دونوں نے منظور کیا۔

بعد ازاں متعدد اصحاب میں سے مسٹر بنواری لال بھارگو، مسٹر محمد یعقوب، مسٹر چٹرجی و مسٹر عبدالسلام خاں کو اسیسر منتخب کیا گیا اور وہ مقام جیوری پر متمکن ہوئے۔ پھر ملزمین کو فرد قرارداد جرم پڑھ کر سنائی گئی۔ بعض ملزمین نے انگریزی میں اور بعض نے اردو میں فرد قرارداد جرم پڑھ کر سنائے جانے کی خواہش کی۔ جس کے مطابق عمل درآمد ہوا مگر ایک بنگالی ملزم کی طرف سے بنگالی زبان میں فرد قرارداد جرم سنائے جانے کی خواہش ہونے پر مجبوری کا اظہار کیا گیا اور اس کو انگریزی میں فرد سنائی گئی۔ جملہ ملزمین نے خود کو ان الزامات سے بے قصور بتایا۔

اس کے بعد پنڈت جگت نراین نے اثبات جرم کی طرف سے اپنی تقریر شروع کی جس میں ڈکیتی ریلوے کے بعد پولیس کی تفتیش وغیرہ کا حوالہ دیا گیا۔ یہ تقریر عدالت کے برخاست ہونے تک جاری تھی۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۵؍ مئی ۱۹۲۶ء ص ۶)

کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ

خاص سلوک کے لیے درخواست

لکھنؤ۔ ۴؍ ستمبر: کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ یکم ستمبر سے پھر شروع ہو گیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ اب تک ہوم ممبر صاحب (نواب صاحب چھتاری) نے ملزمین کی اس درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا ہے، جس میں انھوں نے یہ التجا کی تھی کہ ان کے ساتھ خاص قیدیوں کا

سلوک کیا جائے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۷؍ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۶)

ملزمین مقدمہ کاکوری کا مقاطعہ جوعی

سیاسی قیدیوں کا سا برتاؤ چاہتے ہیں!

لکھنؤ۔ ۶؍ستمبر: سازش کاکوری کے تمام قیدیوں نے جن پر مقدمہ چل رہا ہے، آج سے مقاطعہ جوعی شروع کر دیا ہے۔ بجز جگلیش چٹرجی کے جو بیمار ہیں اور بنواری لال کے جو پہلے ہی سے اقبال جرم کر چکا ہے۔ جن اسباب کی بنا پر آج مقاطعہ شروع کیا گیا ہے، وہ ملزمین نے گزشتہ پیشی کے موقع پر بیان کر دیئے تھے۔ انھوں نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ ان کے ساتھ مخصوص برتاؤ کیا جائے۔ لیکن چوں کہ کچھ جواب نہ ملا، اس لیے انھوں نے عدالت کو مطلع کر دیا کہ وہ فاقہ کشی کریں گے اور اپنی طرف سے مقدمہ کی پیروی بھی نہ کریں گے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۸؍ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۶)

کاکوری ڈکیتی سازش کے ملزمین

مقاطعہ جوعی کی وجہ

لکھنؤ۔ ۸؍ستمبر: کاکوری ڈکیتی اور سازش کے زیر مقدمہ ملزمین کے مقاطعہ جوعی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے مقامی حکومت سے درخواست کی تھی کہ ان کے ساتھ خاص قیدیوں کا برتاؤ کیا جائے۔ جسے حکومت نے نامنظور کر دیا ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۰؍ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۵)

مقدمہ کاکوری ڈکیتی

ملزمین کا مقاطعہ جوعی

لکھنؤ۔ ۱۳؍ستمبر: مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کے ملزمین نے لوکل گورنمنٹ کی طرف سے اپنی عرضداشت کا کوئی جواب موصول نہ ہونے کے خلاف احتجاج کے طور پر جیل

خانہ میں جو مقاطعہ جوئی شروع کیا ہے اس کو آج (دوشنبہ) آٹھواں روز گزر رہا ہے۔ عدالت سیشن میں ان کے مقدمہ کی کارروائی دوبارہ ملزمین کی حاضری کے بغیر ملتوی کی جاچکی ہے۔ آج (دوشنبہ) پھر کارروائی مقدمہ شروع ہونی چاہیے۔ مگر باآثار ظاہر اس کی کوئی توقع نہیں ہے۔ مقدمہ کے التوا سے پبلک کو ملزمین کی حالت صحت کے متعلق صحیح اطلاع حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا اور حکام جیل خانہ کی طرف سے اخبارات کے قائم مقاموں یا ملزمین کے وکلاء و اعزہ کو اس کے سوا کچھ نہیں بتایا جاتا کہ جملہ ملزمین بخیریت ہیں۔ حالانکہ کامل سات یوم کے مسلسل ترک غذا سے ان میں کمزوری پیدا ہونی لازمی ہے۔ حکام کی طرف سے کوئی مستند بیان شائع نہ ہونے کے باعث عوام طرح طرح کی افواہوں سے غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ میں ملزمین کے ساتھ تعزیری کارروائیاں ہونے کی افواہ اڑی، جس کی حکام جیل کی طرف سے تردید کی گئی۔ اب یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ ملزمین کو ربر کی نلکی کے ذریعے سے جبریہ غذا دی گئی ہے۔ خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۶)

اشفاق اللہ کی پیشی

لکھنؤ۔ ۶ر اکتوبر : مقدمہ سازش و ڈکیتی کاکوری کے سلسلے میں اشفاق اللہ ملزم کا مقدمہ کل پھر مسٹر سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس میں شروع ہوا۔ مسٹر اسمٰعیل صاحب انسپکٹر خفیہ پولیس کلکتہ نے بیان کیا کہ انھوں نے جوگیش چٹرجی کو کلکتہ میں گرفتار کیا تھا جس کے پاس زرد پرچہ کے متعلق ایک انقلابی جلسہ کی کارروائی جو کانپور میں ہوا تھا، برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بعد جوگیش چٹرجی بنگال آرڈیننس کے ماتحت نظر بند کردیئے گئے تھے۔ مسٹر فصاحت سب انسپکٹر شاہ جہاں پور نے بیان کیا کہ جو وہ وارنٹ لے کر اشفاق اللہ کو گرفتار کرنے گئے تھے تو وہ فرار ہو چکے تھے۔ اشفاق اللہ کے مکان سے بہت سی تلواریں، کارتوس، گولیاں اور بندوقیں ملی تھیں جو ان کے بھائی مسٹر عبدالقدیر خاں پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر کی تھیں۔ رگھبیر دیال سب انسپکٹر شاہ جہاں پور نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں اشفاق اللہ کی چیزیں قرق کرنے کے متعلق شہادت دی۔ چودھری اشفاق حسین (حضرت گنج پولیس) نے وی۔ این۔

چودھری (یکے از ملزمین مقدمہ کاکوری) کے پاس سے بر آمد شدہ کاغذات ثابت کیے۔ مسٹر آسٹن (خفیہ پولیس الٰہ آباد) نے عدالت میں ان تمام پرچوں کو پیش کیا جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ جہاں پور میں شائع کیے گئے تھے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۸/ اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۵)

صفائی کی شہادتیں

لکھنؤ۔ ۲۱/ جنوری : مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کی جو کارروائی مسٹر اے۔ ہملٹن اسپیشل سیشن جج کے اجلاس پر ہو رہی ہے۔ اس میں ملزمین کے بیانات لیے جانے کے بعد اب صفائی کی طرف سے شہادتیں گزر رہی ہیں۔

موضع بمرولی ضلع پیلی بھیت کے (جہاں ڈاکہ پڑا تھا) ایک بنئے بنام رام غلام اور برہمن بنام گنگا پرشاد نے روشن سنگھ کے بچپن کے زمانہ سے اپنی واقفیت اس سے ظاہر کی اور اس کے نیک چلن ہونے کی تصدیق کی۔ رام غلام نے کہا کہ اس نے ۸، ۹ سال سے روشن سنگھ کو اپنے موضع میں نہیں دیکھا۔ گنگا پرشاد برہمن نے جرح میں تسلیم کیا کہ چوکیدار کو دھمکانے کے جھوٹے الزام میں اس کو اور سردار سنگھ کو چھ چھ ماہ کی سزا ترک موالات کے ایام میں ہو گئی تھی۔ اس نے کانگریس کے لیے بھی کام نہیں کیا۔ نہ وہ تارک موالات تھا۔ مگر تھانیدار نے اس کو و سردار سنگھ کو تارک موالات ظاہر کیا۔ بمرولی کے گجراج سنگھ نے بھی روشن سنگھ کی نسبت صفائی پیش کی۔ جرح میں کہا کہ اس نے ڈکیتی سے ایک روز پہلے روشن سنگھ کو دیکھا تھا۔

ڈاکٹر این۔ آر۔ دھانے جو لندن و پیرس کی یونیورسٹیوں کے ڈاکٹر آف سائنس ہیں اور تین سال تک الٰہ آباد یونیورسٹی میں سائنس کی فیکلٹی کے ڈین رہے ہیں۔ ایک طالب علم کے کپڑوں میں آتش گیر مصالحوں کے بھڑک اُٹھنے سے آگ لگ جانے کی بابت شہادت دیتے ہوئے کہا کہ اگر ان مصالحوں میں فاسفورس ہوتی تو اس کا کچھ نہ کچھ نشان باقی رہتا۔ گواہ جرح میں اپنے اس دعویٰ پر قائم رہا اور اس نے کئی مصالحوں کے نام بتائے جو باہم ملنے سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۲۳ جنوری ۱۹۲۷ء)

کاکوری ڈکیتی کے سلسلے میں ایک اور گرفتاری

بھاگل پور میں سنسنی

سچیندر ناتھ بخشی جس کا تعلق کاکوری ڈکیتی کیس سے بتایا جاتا ہے۔ ۱۷ر جنوری کو گاندھی آشرم بھاگل پور کے قرب وجوار میں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار کرنے والوں میں ایک سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ساتھ مقامی پولیس کے لوگ بھی تھے۔ اس سلسلے میں گاندھی آشرم کی تلاشی بھی لی گئی۔ لیکن کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔ پولیس آشرم سے چند کتابیں اور خطوط لے گئی ہے۔ اس واقعے سے اس علاقے میں بہت سنسنی پھیل رہی ہے۔ (روزنامہ عصر جدید، کلکتہ۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۷ء ص ۲)

کاکوری ڈکیتی کا مقدمہ

اشفاق اللہ کی گرفتاری

لکھنؤ۔ ۲۸ر ستمبر: کئی دن ہوئے معلوم ہوا تھا کہ مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کے روپوش ملزم اشفاق اللہ ساکن شاہ جہاں پور کا پولیس کو پتہ لگ گیا ہے۔ اور وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر عین الدین کے جنھوں نے بحیثیت اسپیشل مجسٹریٹ اس مقدمہ کی ابتدائی تحقیقات کی ہے، شناخت کی کارروائی کے لیے جانے کی خبر ملی۔ اب معلوم ہوا کہ اشفاق اللہ گرفتار کر کے لکھنؤ لائے گئے ہیں اور براہِ راست ان کا عدالت سیشن میں چالان کر کے دیگر ملزمین کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۳۰ر ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۶)

کاکوری ڈکیتی اور سازش کا مقدمہ

ماہر فن تحریر سے جرح

لکھنؤ۔ ۴ر اکتوبر: پرسوں عدالت سیشن کے اجلاس میں مسٹر چودھری وکیل صفائی نے مسٹر اسٹاٹ ماہر فن تحریر سے اپنی جرح جاری رکھی اور ان کی جرح ختم نہ ہونے پائی

تھی کہ اجلاس برخاست ہو گیا۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۶/ اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۵)

اشفاق اللہ ملزم کا مقدمہ

مقدمہ سازش وڈکیتی کاکوری کے مفرور ملزم اشفاق اللہ کا مقدمہ جو حال میں مقام دہلی سے گرفتار ہو کر آیا ہے۔ سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے اجلاس میں یکم اکتوبر کو پیش ہوا۔ مسٹر خیرات نبی پبلک پراسیکیوٹر و مشیر قانونی خفیہ پولیس نے استغاثہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کی اور مسٹر جبیلا ملزم کی جانب سے پیروکار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ملزم کی شناخت بہت سے گواہوں نے کی ہے کہ وہ کاکوری، بمرولی اور بیچ پوری کی تین ڈکیتیوں میں شریک تھا۔

یکم اکتوبر کو بمرولی ڈکیتی کے پانچ گواہوں اور ۲/ اکتوبر کو دو گواہوں کے بیانات ہوئے۔ بعض گواہوں سے مسٹر جبیلا نے جرح بھی کی۔

ملزم عدالت میں آفریدیوں کے لباس میں حاضر کیا گیا۔ اگرچہ افواہاً معلوم ہوا ہے کہ وہ دہلی میں بروقت گرفتاری ہندو بنا ہوا تھا۔ اصل مقدمہ ڈکیتی کاکوری حسب معمول اسپیشل سیشن جج کی عدالت میں چل رہا ہے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۶/ اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۵)

صفائی کی شہادتیں

لکھنؤ۔ ۲۵/ جنوری : مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کی کارروائی کل (دوشنبہ) بھی مسٹر اے۔ ہملٹن اسپیشل سیشن جج کے اجلاس پر جاری رہی اور صفائی کی طرف سے چند اشخاص کی شہادتیں قلمبند کی گئیں۔ دیبی پرشاد و نرائن لال دو شخصوں نے رام کشن کھتری ملزم کے نیک چلن ہونے کی تصدیق کی اور اس کے خاندانی معاملات پر روشنی ڈالی۔ نرائن لال نے یہ بھی بیان کیا کہ ایک ہولی کے موقعہ پر رام کشن ملزم نے کیچڑ وغیرہ اُچھالنے اور فحش گیت گانے سے لوگوں کو منع کیا تھا اور ان طریقوں سے ہولی کے تہوار کی پاکیزگی میں فرق ہونے پر زور دیا تھا۔ موہن لال کھتری نے بھی رام کشن کے چال چلن کی بابت شہادت دی اور کہا کہ رام کشن کو ویدنت وغیرہ کا شوق تھا۔ وہ پہلے ہردوار میں ایک گرو سے روحانی تعلیم پاتا رہا

پھر اسی تعلیم کے لیے بنارس گیا۔

ستید رناتھ بخشی کی گرفتاری

چند روز قبل اس امر کی اطلاع ملی تھی کہ پولیس مقدمہ ڈکیتی ریلوے کے ایک ملزم بنام ستید رناتھ بخشی کی گرفتاری میں کامیاب ہو گئی ہے جس کو اشفاق اللہ خاں کی طرح روپوش بتایا جاتا تھا اور جس کے اسباب کی بمقام جھانسی تلاشی لیے جانے پر پولیس کی اطلاع کے بموجب کچھ خطوط و کاغذات بر آمد ہوئے تھے۔ جو اس مقدمہ میں بطور ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ستید رناتھ بخشی کے متعلق اس کی گرفتاری کے مقام پر مطلوبہ قانونی کارروائیاں مکمل ہو گئی ہیں اور وہ لکھنؤ لایا جا رہا ہے۔ یہاں وہ غالباً آجکل میں پہنچ جائے گا۔ اس کی توقع کی جاتی ہے کہ ستید رناتھ بخشی کے متعلق مسٹر عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کے سامنے ابتدائی تحقیقات کے مراحل جلد طے کیے جائیں گے۔ اور اگر اس کے سیشن سپرد کرنے کی نوبت آئی تو اشفاق اللہ اور بخشی کے مقدموں کو ملا دیا جائے گا۔ اور آئندہ مارچ میں مسٹر اے۔ ہملٹن اسپیشل جج ان دونوں کے مقدمہ کی سماعت شروع کر سکیں گے۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۷ر جنوری ۱۹۲۷ء، ص ۷)

رنگ پور کے وکلاء کی خانہ تلاشیاں

رنگ پور۔ ۱۵ر فروری : بابو ہر مہا چند گنگولی وکیل، رتلا چند گپتا وکیل ہائی کورٹ اور رتل چندر کے یہاں ایک ہی وقت میں آج صبح سی۔ آئی۔ ڈی نے تلاشی لی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تلاشیاں مقدمہ سازش کاکوری کے ایک کیس میں ہوئی ہیں۔ پولیس کچھ کاغذات و خطوط لے گئی ہے۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۲ر فروری ۱۹۲۷ء، ص ۵)

اسیسروں نے اپنی رائے دے دی

لکھنؤ۔ ۲۴ر مارچ : تقریباً ایک سال کی مسلسل سماعت کے بعد مسٹر ایچ۔ ڈی۔ بی

رملٹن سیشن جج نے کاکوری ڈکیتی کے مشہور مقدمہ کی سماعت ختم کی۔ ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کی سازش کے سوال میں اسیسروں نے بالاتفاق چار ملزمین (۱) رام پرشاد (۲) راجندر ناتھ لاہری (۳) من متھ ناتھ گپتا (۴) بنواری لال کو مجرم پایا۔ ایک اسیسر نے دو اور ملزمین (۱) جگیش چندر چڑجی اور (۲) سچیندر ناتھ سانیال کو بھی سازش کا ملزم پایا۔ نیز اسیسروں نے تمام ملزموں کو ہر طرح کی ڈکیتی اور ٹرین ڈکیتی کے جرم میں مجرم نہیں پایا۔ فیصلہ ابھی تک محفوظ رکھا گیا ہے اور اپریل کے وسط میں سنایا جائے گا۔

(عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۶/مارچ ۱۹۲۷ء، ص ۳)

کاکوری کے مقدمہ سازش کا فیصلہ

تین ملزمین کو سزائے موت کا حکم

لکھنؤ۔ ۶/اپریل : آج مسٹر اے۔ ایچ۔ ہملٹن آئی۔ سی۔ ایس۔ سیشن جج نے کاکوری کے مقدمہ سازش کا فیصلہ سنایا جو بہت عرصہ سے چل رہا تھا۔ تین ملزمین رام پرشاد، روشن سنگھ اور راجندر ناتھ لاہری کو سزائے موت دی گئی۔ ایس۔ این۔ سانیال کو حبس دوام بعبور دریائے شور، علاوہ سترہ قیدیوں کو ۱۰ سال سے کم میعاد کی مختلف سزائیں دی گئیں۔ دو ملزمین عدالت میں حسب معمول نہایت شاداں آئے اور سزائے موت کا فتویٰ انھوں نے نہایت سکون سے سنا۔ اس مقدمہ میں تقریباً ڈھائی سو گواہان استغاثہ پیش ہوئے اور اس سلسلے میں جو ثبوت پیش کیے گئے ان کی تعداد ۱۰۰۰ ہے۔

واقعہ کی تفصیل

کاکوری کی سازش کا مقدمہ جن واقعات کا نتیجہ ہے وہ ۹/اگست ۱۹۲۵ء کو وقوع پذیر ہوئے۔ ایک پسنجر گاڑی کو لکھنؤ اسٹیشن سے دس میل کے فاصلے پر چند اشخاص نے روک کر لوٹ لیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صوبہ متحدہ میں ایک انقلابی مجلس ہے۔ جس کی شاخ صوبہ متوسط میں موجود ہے اور یہ مجالس بنگال کی مرکزی انجمن کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہیں۔ جب خفیہ پولیس کو یہ خبر ملی تو انھوں نے صوبہ متحدہ کے مشتبہ اشخاص پر نظر رکھنی شروع کی اور ان کے خطوط بھی کھولے جانے لگے۔ آخرکار ۲۵/ستمبر ۱۹۲۵ء کو مسٹر آر۔

اے۔نارٹن نے صوبہ کے مختلف شہروں میں خانہ تلاشی اور گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کر دیئے۔ وارنٹ کی تعمیل دوسرے دن کر دی گئی اور تیس سے زیادہ آدمی گرفتار کیے گئے۔ پولیس کی تلاشی کا نتیجہ ہوا کہ بعض آتشی اسلحہ اور انقلابی لٹریچر کے کاغذات بھی پکڑے گئے۔ ان کاغذات سے اس مجلس کے معاملات کا زیادہ حال معلوم ہوا۔ چند مزید گرفتاریاں کی گئیں اور اسلحہ اور گولی بارود پر بھی قبضہ کیا گیا۔

۱۹۲۵ء کے خاتمہ پر پولیس نے بعض گرفتار شدہ اشخاص کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا۔ جنگ کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کے الزام میں سید عین الدین اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیجا گیا۔ ان میں سے دو سلطانی گواہ بن گئے۔

(روزنامہ عصر جدید۔ کلکتہ، ۷/اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳)

مقدمہ کا فیصلہ — ہولناک سزائیں
پولیس کی کارگزاری کی تعریف

لکھنؤ۔ ۶/اپریل ۱۹۲۷ء۔ سازش کاکوری کے مقدمہ میں مسٹر ہملٹن اسپیشل جج نے آج فیصلہ سنادیا۔ بائیس ملزمین میں سے تین یعنی رام پرشاد، راجن لاہری اور روشن سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ ایک کو حبس دوام بعبور دریائے شور، ایک کو چودہ سال کی قید بامشقت، پانچ کو دس دس برس کی دو کو سات سال کی اور چھ کو پانچ پانچ سال کی سزا ملی ہے۔ دو ملزم بری کیے گئے ہیں اور دو کو جو سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ معافی دے دی گئی ہے۔ سازشوں کے مقدمات میں سے یہ سب سے بڑا سازش کا مقدمہ ہندوستان میں ہوا ہے۔ استغاثہ کی طرف سے ڈھائی سو سے زیادہ گواہ پیش کیے گئے تھے۔ لوگوں کو یاد ہوگا کہ ۹/اگست ۲۵ء کو ایک مسافر گاڑی کو لکھنؤ جنکشن سے دس میل کے فاصلہ پر بعض آدمیوں نے روک کر لوٹ لیا تھا۔ اس دلیرانہ ڈکیتی کی تحقیقات کے دوران میں یہ پتہ چلا کہ صوبہ متحدہ میں ایک وسیع نظام انقلابی سازش کا موجود ہے جس کی شاخیں صوبہ متوسط میں بھی ہیں۔ اور جو اس خاص نظام کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے جو بنگال میں ہے۔ جج نے اپنے فیصلہ میں ظاہر کیا ہے کہ صوبہ متحدہ میں ایک بہت وسیع سازش موجود تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ حکومت کو اکھیڑ کر پھینکنے

کے لیے ایک مسلح انقلاب عمل میں لایا جائے۔ اس سازش کا ابتدائی تخم اس صوبہ میں ۲۳ء میں بویا گیا تھا۔ لیکن اس پودے کی نمود و پرداخت زیادہ تر ملزمان رام پرشاد اور آر۔ این۔ لاہری نے کی۔ دکھنیشور اور شیو بازار کلکتہ میں اس سازش کے خاص جزو تھے اور بنگالی حصہ کا فرض یہ تھا کہ شمالی ہند کی جماعت کو برابر ہتھیار اور کارتوس وغیرہ مہیا کیا کرے۔ جج نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ سازش کے ممبروں نے اپنی جماعت کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے بکثرت ڈاکے ڈالے جن میں وہ انسانی جان کا کچھ احترام نہ کرتے تھے۔ ان میں سے دو ڈکیتیوں میں ان سازشیوں نے پیشہ ور مجرموں کے ساتھ شریک ہو کر کام کیا۔ سازش کے ممبروں نے جو ڈاکے ڈالے ان میں ہر چار ڈاکوں میں ایک آدمی کے قتل کا اوسط ہے۔ فیصلہ کے آخر میں جج نے مسٹر نارٹن اور ان کے ماتحت عملہ پولیس کی دانشمندی اور کارکردگی کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے اس طرح تحقیقات کی اور مقدمہ تیار کیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۸/اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۶)

دل ہلا دینے والے نظارے — ملزمین کی رُلا دینے والی نظمیں

معزز ہم عصر ہندوستان ٹائمز کا نامہ نگار رقم طراز ہے کہ حکام لکھنؤ کے قومی ہفتہ کا افتتاح تین شخصوں کو پھانسی، ایک کو حبسِ دوام، پانچ کو دس سال کی دو کو سات سال کی، پانچ کو پانچ سال کی قید بامشقت اور دو کو معافی سے کاکوری کا مقدمہ سازش جو دو برس سے چل رہا تھا کل ختم ہو گیا۔

سرفروشانہ داخلہ

ملزمین کے وکلاء اور فاضل جج ملزموں کی آمد کے منتظر تھے جو ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر آئے۔ سب کے سب خوش اور بشاش تھے اور ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے جیل میں صبح کو پوجا کی تھی۔ سب کا لباس کھدر کا تھا، گاندھی ٹوپی اوڑھے تھے اور قومی غزلیں گا رہے تھے۔ بندے ماترم کے نعرے لگاتے ہوئے وہ لوگ موٹر لاری سے اُترے اور مندرجہ ذیل اشعار گاتے ہوئے آہستہ آہستہ عدالت کے کمرے تک گئے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہید ملک و ملت میں ترے اوپر فدا
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے[1]

گیارہ بج کر بیس منٹ پر فاضل جج نے اپنا فیصلہ سنایا جو تقریباً دو سو صفحوں پر ٹائپ کیا ہوا تھا۔ جج صاحب کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی اس لیے انھوں نے سب فیصلہ پڑھ کر نہ سنایا بلکہ صرف سزائیں سنانے پر اکتفا کی۔

جج کی نصیحت

عام طور پر یہ دستور ہے کہ سزائے موت سنانے کے بعد جج فوراً کمرے میں چلے جایا کرتے ہیں مگر مسٹر ہملٹن نے جو اس مقدمہ میں اسپیشل جج تھے اس کے خلاف کیا۔ جج صاحب نے سب ملزمین کو خطاب کر کے کہا کہ جس طریقہ پر انھوں نے کام کیا وہ غلط طریقہ تھا لیکن ان کی غلطی ایماندارانہ تھی۔ آپ نے ملزمین سے درخواست کی کہ وہ اس بات کو سمجھیں کہ ابھی ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ باقی ہے۔ کیا یہ غلط طریقہ کار نہ تھا کہ انھوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ ان سب نے اپنے عقیدے کے مطابق ایمانداری سے کام کیا تھا کہ وہ اس تحریک میں شریک ہوئے اور کسی اپنی ذاتی غرض کے لیے شریک نہیں ہوئے بلکہ اپنے ملک کے لیے۔ لیکن یہ بھی سراسر غلطی تھی۔ آپ نے درخواست کی کہ انھیں لوگوں کی تحریرات و تقریرات سے بہک نہ جانا چاہیے بلکہ تنہائی میں خود ہر ایک بات پر غور کرنا چاہیے۔

ملزموں کی مردانہ شان

---

[1] کارروائی مقدمہ کی روداد میں یہ مصرعے اسی طرح غیر مرتب ہیں۔ ایک دوسری جگہ یہ غزل مکمل اور مرتب دے دی ہے (شاہ جہاں پوری)

ملزموں کے چہرے پر خفیف سے خفیف پریشانی کے آثار نہ تھے۔ وہ سب کے سب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ اور کٹہرے میں بغل گیر ہو کر ایک دوسرے کو الوداع اور خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دیکھنے والوں پر حیرت چھائی ہوئی تھی اور سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں نے اس موقع پر ملزمین کی جرأت اور دلیری کی داد دی۔

مسٹر رام پرشاد، مسٹر راجندر ناتھ لاہری اور مسٹر روشن سنگھ جنھیں پھانسی کا حکم ملا تھا اور مسٹر سچیندر ناتھ سانیال جنھیں حبس دوام کی سزا دی گئی تھی سب کے سب کٹہرے کے اندر بڑی شان و شکوہ کے ساتھ خاموش اور پُر سکون حالت میں ٹہل رہے تھے۔

پولیس کی ملزموں سے ہمدردی

مسلح حفاظتی پولیس کا بڈھا صوبیدار اور اس کے ماتحت جو دو برس سے ان ملزمین کو جیل سے لانے اور لے جانے پر مامور رہے تھے اور دن بھر عدالت میں ان کی حفاظت پر متعین رہتے تھے۔ وہ ان سخت سزاؤں کو سن کر بہت ہی متاثر معلوم ہوتے تھے۔ خاص کر اس لیے کہ اس تمام زمانے میں ان کا اور ملزمین کا باہمی برتاؤ بہت دوستانہ رہا تھا۔ آخری خدمت جو وہ لوگ مادر وطن کے ان فرزندوں کی کر سکتے تھے، یہ تھی کہ انھیں ضرورت کے وقت ٹھنڈا پانی پلا دیں۔ صوبیدار اور اس کے بعض کانسٹبلوں نے کل بڑے شوق اور سرگرمی سے ملزمین کو تین گھنٹے تک جب تک کہ وہ عدالت کے کمرے میں رہے بار بار پانی پلایا اور اس لیے ملزمین نے ان کا سچے دل سے شکریہ ادا کیا۔

الوداعی نظارہ

جدا ہوتے وقت جب ملزمین نے دوبارہ ایک دوسرے کو گلے لگایا تو حاضرین عدالت کے دل ہل گئے۔ سب ملزمین نے ان چاروں کے قدم چھوئے جنھیں پھانسی اور حبس دوام کی سزائیں ملی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عدالت سے باہر نکلتے وقت رام پرشاد ان سب کے آگے آگے تھے۔ بندے ماترم کے نعرے لگ رہے تھے اور مندرجہ ذیل غزل گائی جا رہی تھی۔

ہائے ہم جس پر بھی تیار تھے... کیا   جیتے جی ہم سے چھڑایا اسی... لا کے
ہم بھی اس باغ میں تھے قید   پھر نہ گلشن میں ہمیں لائے صیاد...

اب تو کا ہے کو ...　　　　　ہائے ہم جس پر بھی تیار ...

(ہمدرد، دہلی۔ ۱۱/اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۶)

کاکوری کے مقدمہ سازش کا فیصلہ

قیدیوں نے کھدر ترک کرنا منظور نہیں کیا

کانپور۔ ۷/اپریل : کل کاکوری کی سازش کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ جیل کے افسروں نے قیدیوں سے کہا کہ وہ کھدر چھوڑ کر دوسرے کپڑے پہنیں۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ حکام نے مزید اصرار نہیں کیا۔ قیدیوں کو صوبہ کے مختلف جیلوں میں بھیجا گیا ہے۔

(عصر جدید۔ ۹/اپریل ۱۹۲۷ء)

کاکوری کے مقدمہ سازش کی اپیل

لکھنؤ۔ ۱۱/اپریل : کاکوری کے مقدمہ سازش کی تمام اپیلیں اس ہفتہ تک چیف کورٹ میں پیش کر دی جائیں گی۔ لیکن سماعت جولائی سے پہلے نہیں ہو سکے گی۔ خفیہ پولیس کے افسر شہر میں سزا کے متعلق لوگوں کی رائے معلوم کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ سزا زیادہ سخت ہے۔ (عصر جدید۔ ۱۴/اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۲)

مقدمہ کاکوری کے دو قیدیوں کا مقاطعہ جوعی

الٰہ آباد۔ ۱۷/اپریل : مقدمہ ڈکیتی کاکوری کے دو قیدیوں نے نینی سنٹرل جیل میں جوعی مقاطعہ کر رکھا ہے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۱۹/اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۷)

مقدمہ سازش کاکوری کا فیصلہ

موت اور طویل قید کی سزائیں

کل (چہار شنبہ) ۶/اپریل : دوپہر کو مسٹر اے۔ ہملٹن اسپشل سیشن جج نے

مقدمہ ڈکیتی ریلوے کاکوری کے ملزمین کی نسبت اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ بعض لوگوں کو فیصلہ سنانے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس لیے وہ عدالت کے احاطے کے اندر مجتمع ہو رہے تھے مگر پولیس کی طرف سے سیشن جج صاحب کے مقام اجلاس پر اور چاروں طرف حفاظت کے خاص انتظام کیے گئے تھے اور غیر متعلق اشخاص کو اندر نہیں جانے دیا تھا۔

سوا گیارہ بجے کے بعد ملزمین جیل خانہ کی لاریوں میں لائے گئے اور احاطہ عدالت کے اندر داخل ہونے کے وقت بہت سے لوگ ان کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ملزمین حسب معمول خوش و خرم نظر آتے تھے اور وہی پرانی غزل گا رہے تھے۔

سر کٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

غزل گانے کے دوران میں وہ "بندے ماترم" کے نعرے بھی لگاتے تھے۔ جن کا عوام کی طرف سے تائیدی جواب دیا جاتا تھا۔ سیشن جج صاحب کے اجلاس کی کرسی پر متمکن ہونے کے بعد جملہ ملزمین ان کے سامنے خاموش کھڑے ہو گئے۔ مگر ان کے چہروں سے کوئی آثار تشویش نہ ظاہر ہوئے تھے۔ جج صاحب نے اپنا فیصلہ بکس سے نکالا تو معلوم ہوا کہ وہ طویل اور کئی جز پر مشتمل ہے۔ فیصلہ میں مقدمہ کی نوعیت بیان کرنے، دوران تحقیقات میں ظاہر شدہ واقعات پر نظر ڈالنے اور ملزمین کی شخصیتوں کا حوالہ دینے کے بعد سیشن جج صاحب نے لکھا تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضور شہنشاہ معظم کو ان کی بادشاہت ہند سے محروم کرنے کے لیے ایک سازش موجود تھی اور وہ صرف ان صوبجات تک محدود نہ تھی بلکہ سارے اقطاع ہند پر پھیلی ہوئی تھی اور اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لیے سازشیوں نے ڈکیتیوں کا ارتکاب کیا۔ پھر ملزمین کی ذمہ داری برائے شہادت مختلف کے متعلق الگ الگ متعین کرنے کے بعد سیشن جج صاحب نے ظاہر کیا کہ

ہر گووند اور سچیندر ناتھ بسواس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ان دونوں کو بری کیا جاتا ہے۔

سزاؤں کی تفصیل

بنواری لال اقبالی ملزم اور بھوپندر ناتھ سانیال کو ہر دفعہ کے ماتحت ۵، ۵ سال قید کی

سزائیں دی گئیں جو بیک وقت جاری رہیں گی۔

ڈی۔این۔ چودھری عرف گووند سرن کار کو ہر دفعہ کے ماتحت دس دس سال قید سخت کی سزائیں ایک ساتھ جاری رہنے والی دی گئیں۔

مکندی لال اور جوگیش چٹرجی کو ہر دفعہ کے ماتحت دس دس سال قید سخت کی ایک ساتھ جاری رہنے والی سزائیں۔

من متھ ناتھ گپتا کو ہر دفعہ کے ماتحت سات سات اور دس دس سال قید سخت کی ایک ساتھ جاری رہنے والی سزائیں۔

پریم کشن کھنا اور پورن دیش چٹرجی کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵،۵ سال قید سخت کی ایک ساتھ جاری رہنے والی سزائیں۔

راجیندر ناتھ لاہری کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت حبس دوام بعبور دریائے شور اور دفعہ سوم کے ماتحت سزائے موت۔

راج کمار سنہا کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵،۵ سال اور تیسری دفعہ کے ماتحت دس سال قید سخت کی ایک ساتھ جاری رہنے والی سزائیں۔

رام دلارے ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵،۵ سال قید سخت کے ساتھ۔

رام کشن کھتری کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵،۵ سال اور تیسری دفعہ کے ماتحت قید سخت کی ایک ساتھ۔

رام ناتھ پانڈے کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵ سال قید سخت۔

رام پرشاد کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت حبس دوام اور تیسری دفعہ کے ماتحت سزائے موت۔

روشن سنگھ کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۵،۵ سال قید سخت اور تیسری دفعہ کے ماتحت سزائے موت۔

سچیندر ناتھ سانیال کو ہر دفعہ کے ماتحت حبس دوام کی سزائیں جو مقدمہ بالکورٹ کی سزاؤں کے ساتھ جاری رہیں گی۔

سریش چندر بھٹا چارجی اور وشنو سرن ویلس کو ابتدائی دو دفعات کے ماتحت ۷،۷ سال قید سخت یک جائی۔

بنارسی لال واندو بھوشن مترا اقبالی ملزمین نے جج صاحب کی رائے میں تمام باتیں سچ سچ بتادیں لہٰذا ان کو معافی دی گئی۔

رام پرشاد لاہری وروشن سنگھ کی موت کی سزائیں اودھ چیف کورٹ سے تصدیق طلب ہیں۔ ملزمین صدور فیصلہ کے سات روز کے اندر عدالت عالیہ سے اپیل کرسکتے ہیں۔

فیصلہ سنانے کے بعد جج صاحب نے ملزمین کو نصیحت کی کہ انھیں تنہائی میں ٹھنڈے دل سے اپنے طریق عمل کے نتائج واثرات پر غور کرنا چاہیے۔ ملزمین مطمئن رہے۔ جملہ ملزمین نے فیصلہ اور اپنے متعلق سزاؤں کے احکام کو سکون کے ساتھ سنا۔ اور سزائے موت کے احکام جن لوگوں کے خلاف صادر ہوئے ہیں۔ ان کی طرف سے بھی کسی رنج و اضطراب کا اظہار نہیں ہوا۔ جج صاحب کے اٹھ جانے کے بعد ملزموں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ وہ مفارقت کے خیال سے ملول تھے۔ گو اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ رام پرشاد نے باآواز بلند کہا کہ وہ ملک کی خاطر ہر وقت مرنے کو تیار ہے۔ انھوں نے اپنے رفقاء کو تسکین دی اور ہم وطنوں سے کہا کہ وہ مطمئن رہیں۔

(عصر جدید۔ ۲۰؍اپریل ۱۹۲۷ء، ص۱)

کاکوری ڈکیتی اور سازش کے ایک ملزم کی صحت

سیٹھ دامودر سروپ کا وزن

دہلی۔ ۲۰؍اپریل : سیٹھ دامودر سروپ کچھ دنوں سے دہلی میں بغرض علاج پڑے ہوئے تھے مگر معلوم ہوا ہے کہ علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آپ کا وزن ۶۰ پونڈ سے بھی کم ہوگیا ہے۔ اب صلاح ہے کہ آپ کو کسی پہاڑ پر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ سیٹھ جی آج کل میں پہاڑ پر جانے والے ہیں۔ آپ کی حالت بہت نازک ہوگئی ہے۔ آپ آج کل بوجہ خرابی صحت ضمانت پر رہا ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۴؍مئی ۱۹۲۷ء، ص۶)

اسیرانِ سازش کاکوری کا مقاطعہ جوعی

افسرانِ جیل کے سلوک پر احتجاج

لکھنؤ۔ ۱۹رمئی : مسٹر گنیش شنکر ودیارتھی ایڈیٹر پرتاپ کانپور نے مقدمہ کاکوری کے قیدیوں کے مقاطعہ جوعی کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے :

"سزایابی کے وقت سے مقدمہ کاکوری کے قیدیوں نے جو بریلی سے آگرہ اور نینی کے قید خانوں میں مقاطعہ جوعی کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیل کے اندر ان سے اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ ۱۴رمئی کو ان کے مقاطعہ کا چالیسواں دن ہے۔ ان کے وزن میں معتدبہ کمی واقع ہو چکی ہے۔ ان کو مقاطعہ جوعی سے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ بریلی جیل میں ایک قیدی کی ماں نے اس وقت کھانا کھانے سے انکار کر دیا جب تک اس کا بیٹا کھانا نہیں کھاتا۔ اس خاتون کو بھوک کے مارے غش آگیا جو کئی گھنٹہ رہا۔ اس اطلاع نے قیدیوں کو روزہ شکنی پر مجبور کر دیا اور سپرنٹنڈنٹ جیل نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے فتح گڑھ جیل میں جوگیش چٹرجی، رام دلارے اور گوبند کنور کو دیکھا، انھیں پالکی میں ہسپتال لایا گیا۔ وہاں انھوں نے کچھ کھایا۔ ۱۴روز کے مقاطعہ کے بعد آگرہ اور نینی کے جیلوں میں بھی بڑی مشکل سے انھیں کھانا کھانے پر مجبور کیا۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۳رمئی ۱۹۲۷ء، ص۶)

مقدمہ کاکوری کے گواہ کا مقدمہ

قانون اسلحہ کی خلاف ورزی کا راز

لاہور۔ ۲۶رمئی : کاکوری مقدمہ کے گواہ مسٹر کے۔ ایل۔ بنرجی جس کو لاہور کے اسٹیشن پر ایکٹ اسلحہ کی دفعہ ۲۰/۱۹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا اور جس کے قبضے سے ایک پستول اور چند کارتوس برآمد ہوئے تھے۔ آج پھر یہاں محمد یوسف مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ابھی اس کے مقدمہ کا فیصلہ محفوظ رکھا گیا۔ ملزم نے رہائی کے لیے

ضمانت کی درخواست دی تھی۔ آج ضامن حاضر عدالت نہ ہو سکا کل وہ عدالت میں پیش ہو گا اور ضمانت تافیصلہ مقدمہ لی جائے گی۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۲۹ر مئی ۱۹۲۷ء، ص ۶)

سازش کاکوری

اشفاق اللہ کے خلاف مقدمہ

لکھنؤ۔ ۴ر جون : مقدمہ سازش وڈکیتی ریلوے کاکوری کا ضمیمہ اشفاق اللہ خاں اور ایس۔ این۔ بخشی کے خلاف ختم ہونے والا ہے۔ کیوں کہ ملزمین کے وکلاء کی تقریروں کے بعد خان بہادر مسٹر خیرات نبی کورٹ انسپکٹر کی اثبات جرم کی طرف سے جوابی تقریر تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ آج مسٹر بیسنت سیشن جج صاحب ارکان جیوری سے خطاب فرمائیں گے اور اس کے بعد ان سے رائے لی جائے گی۔ ارکان جیوری کے اظہار رائے کے بعد ان کو رُخصت کر دیا جائے گا اور سیشن جج صاحب فیصلہ تحریر کرنے کے لیے پہاڑ پر تشریف لے جائیں گے۔

مقدمہ کا فیصلہ

ہم عصر 'ہمدم' رقم طراز ہے کہ مسٹر اے۔ ہملٹن اسپیشل سیشن جج نے فیصلہ سازش وڈکیتی ریلوے کاکوری کا جو فیصلہ صادر کیا ہے اس میں یہ دیکھ کر ہم کو بے حد تعجب وافسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ اشفاق اللہ خاں بحثیت ملزم اس وقت مسٹر ہملٹن کے روبرو پیش نہیں تھا مگر مسٹر موصوف نے اپنے فیصلہ میں اس بدنصیب کی نسبت بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اور دو جگہ بحوالہ اور ایک جگہ صاف طور سے اشفاق اللہ خاں کا نام لے کر اس کو قتل کا مجرم قرار دے دیا ہے۔ ایک جگہ اشفاق اللہ خاں کے ایک مکان کی چھت پر موجود ہونے کا ذکر کر کے مسٹر ہملٹن اپنے فیصلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

> "جو گولی دیوار میں گھسی ہوئی تھی اس کی پوزیشن پر غور کرتے ہوئے یہ واضح ہے کہ ایک نہیں بلکہ دو گولیاں ان اشخاص پر جو وہاں موجود تھے چلائی تھی اور شام لال جس کے کولھے میں گولی لگی تھی، ان دو آدمیوں کے ہاتھوں جو چھت پر تھے قتل کیا گیا۔ ان دونوں آدمیوں کو ذمہ داری میں

شریک ہونا پڑے گا"۔

آگے چل کر ایک جگہ مسٹر ہملٹن نے صاف صاف لکھا ہے :

"میری رائے میں (شہادت اور اس سے بر آمد ہونے والے نتائج) ایک شخص کے یہ رائے قائم کرنے کے لیے کافی ہے کہ روشن سنگھ نے یہ ڈکیتی اشفاق اللہ خاں کی طرح پارٹی ۔کے ایک ممبر کے طور پر کی اور بطور ایک بد معاش کے نہیں کی"۔

اس سے آگے چل کر پھر اشفاق اللہ خاں کا حوالہ دیا گیا ہے اور مسٹر ہملٹن نے اس فقرے میں اس کے لیے سزا بھی تجویز کردی ہے کہ رام پرشاد اس ڈکیتی میں لیڈر تھا اور نقل کی ذمہ داری کے طور پر میں وہی حکم وسزا ان دونوں آدمیوں کی نسبت جو چھت پر تھے، صادر کروں گا۔

کیسی تعجب کی بات ہے کہ اشفاق اللہ خاں بحیثیت ملزم جج صاحب کے سامنے موجود نہیں تھا اور اس کو مقدمہ میں اپنی صفائی پیش کرنے کا مطلق کوئی موقع نہیں ملا۔ مگر جج صاحب نے اپنے فیصلے میں اس بد نصیب کو قتل کا مجرم قرار دینے میں تامل نہیں کیا اور اس کی نسبت حکم سزا بھی تجویز کر دیا۔ خدا جانے قانون کی رو سے یہ کارروائی کس حد تک جائز تھی یا ناجائز تھی مگر عقل سلیم اس کو ہر گز روا نہیں کر سکتی کہ کسی شخص کی صفائی سنے بغیر ہی اس کو ایک ہولناک جرم کا مجرم قرار دیا جائے۔

(ہمدرد، دہلی... ۷ ۱۹۲ء، ص ۵)

سازش کاکوری — اسیروں کی رائے

لکھنؤ۔ ۵/جون : گزشتہ شنبہ کو ضمیمہ مقدمہ کاکوری کی کارروائی اشفاق اللہ خاں اور ایس۔ این۔ بخشی کے خلاف مسٹر آر۔ بیسنٹ سیشن جج کے اجلاس پر ختم ہو گئی۔ جج صاحب نے ارکان جیوری کو مقدمہ کی نوعیت اور قانون کا منشا سمجھایا۔ اس کے بعد جیوری کے ممبروں سے ملزمین کی نسبت دریافت کیا گیا۔ من جملہ چار ارکان جیوری کے جو ابتداء میں بلائے گئے تھے، ایک اسیسر کا دوران کارروائی مقدمہ میں انتقال ہو گیا اور اس کے بجائے کوئی

دوسرا مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ باقی ماندہ تین حضرات نے حسب ذیل رائے ظاہر کی:

محمد زکی صاحب اسیسر نے کہا کہ کوئی سازش اعلیٰ حضرت شہنشاہ معظم کو مسلح انقلاب کے ذریعے سے ان کی بادشاہت ہند سے محروم کرنے کے لیے موجود نہیں تھی اور اشفاق اللہ خاں وایس۔این۔ بخشی ڈکیتی کے بھی قصوروار نہیں ہیں۔

مسٹر ایم۔ایس۔ کوشل نے یہ رائے ظاہر کی کہ حضور شہنشاہ معظم کو مسلح بغاوت کے ذریعے سے ان کی بادشاہت ہند سے محروم کرنے کی سازش تھی اور اشفاق اللہ خاں و ایس۔این۔ بخشی اس سازش میں شریک تھے اور بیچ پوری اور کاکوری کی ڈکیتیوں کے بھی وہ قصوروار ہیں۔ مگر بمرولی کی ڈکیتی میں ان کی شرکت برروئے شہادت مشتبہ ہے۔

مرزا محمد علی صاحب نے رائے ظاہر کی کہ حضور شہنشاہ معظم کو ان کی بادشاہت ہند سے بذریعہ مسلح انقلاب محروم کرنے کی سازش بھی تھی اور ہر دو ملزمین اس میں شریک ہونے کے لحاظ سے قصوروار ہیں اور وہ بیچ پوری اور بمرولی کی ڈکیتیوں اور کاکوری کی ریلوے ڈکیتی میں بھی شامل تھے۔

اسیسران کی رائے ظاہر کرنے کے بعد سیشن جج صاحب نے ان کو رخصت کر دیا اور اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔ معلوم ہوا ہے کہ جج صاحب پہاڑ پر جاکر فیصلہ لکھیں گے اور کچھ روز بعد لکھنؤ واپس آکر سنادیں گے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۸رجون ۱۹۲۷ء، ص ۶)

اپیل مقدمہ سازش کاکوری

رام پرشاد کی درخواست نامنظور

لکھنؤ۔ ۱۹رجولائی: مقدمہ سازش و ڈکیتی ریلوے کاکوری کے سزایافتہ ملزمین کی اپیل کی سماعت کل سے اودھ چیف کورٹ میں آنریبل چیف جج و جسٹس سید محمد رضا صاحبان کے بنچ پر شروع ہوئی ہے۔ صرف سانیال برادران و بنواری لال کی اپیل اس وقت زیر سماعت ہیں۔

اپیل کی بحث شروع ہونے سے پہلے مسٹر ایل۔ایس مصر بیرسٹر نے جن کو گورنمنٹ نے رام پرشاد کی طرف سے پیروی کرنے کے لیے مقرر کیا ہے، اطلاع دی ہے کہ رام پرشاد نے ان کو کسی قسم کی ہدایات نہیں دیں۔ اس کا اصرار ہے کہ یا تو پنڈت گوبند بلبھ

پنت ممبر کونسل صوبہ ولیڈر سوراج پارٹی کونسل کو اس کی طرف سے مقرر کیا جائے۔ ورنہ وہ خود اپنے مقدمہ میں عدالت کے روبرو بحث کرے گا۔ آنریبل چیف جج صاحب نے فرمایا کہ رام پرشاد نے جیل سے اپیل کیا ہے۔ اور اس صورت میں بروئے قواعد اس کو اصالتہً حاضر عدالت ہو کر بحث کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ آپ نے مسٹر ایل۔ ایس۔ مصر کو حکم دیا کہ اگر ملزم کی طرف سے ہدایات نہیں ملیں تو وہ مسل مقدمہ کو دیکھ کر خود اس کی طرف سے پیروی کریں۔

اس کے بعد پنڈت ہرکرن ناتھ مصر بیرسٹر نے جو عدالت ہائے ماتحت میں کئی ملزموں کی طرف سے پیروی کر چکے ہیں، شہادتوں کے بعض حصے پڑھ کر سنائے۔ اور الزام سازش کا ثبوت کامل نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کی تقریر دن بھر جاری رہی۔

چوں کہ پریم کشن کھتری اور وشنوسرن وبلس کے سوا جملہ ملزمین نے افلاس کا عذر پیش کیا ہے۔ اس لیے گورنمنٹ نے ان کی طرف سے مختلف وکلاء کو بغرض پیروی مقرر کر دیا ہے۔ پریم کشن کھتری کی طرف سے مسٹر جان جیکسن بیرسٹر لکھنؤ اور مسٹر پاٹن بیرسٹر کلکتہ اور وشنوسرن وبلس کی طرف سے پنڈت کپل دیو مالوی پیروکار ہیں۔ پنڈت جگت نرائن ایڈوکیٹ، مسٹر ایچ۔ طامس بیرسٹر اور خان بہادر مسٹر خیرات نبی افسر سی۔ آئی۔ ڈی اثبات جرم کی طرف سے پیش ہوئے۔ (ہمدرد۔ دہلی، ۲۰/ جولائی ۱۹۲۷ء، ص ۴)

مجرمین مقدمہ کاکوری کی پھانسی میں التوا

لکھنؤ۔ ۱۱/ اکتوبر : اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اشفاق اللہ یکے از ملزمین مقدمہ سازش وڈکیتی کاکوری کی طرف سے عدالت چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل دائر کی جانے والی ہے اور پریوی کونسل کے فیصلے کے وقت تک کے لیے اشفاق اللہ کو پھانسی دیا جانا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پنڈت رام پرشاد، آر۔ این۔ لہری اور ٹھاکر روشن سنگھ کے وکلاء نے جوڈیشنل سکریٹری حکومت صوبجات متحدہ کو تار دے کر درخواست کی تھی کہ پریوی کونسل میں ان ملزمین کی طرف سے اپیل کی جا رہی ہے۔ اس لیے پریوی کونسل کے فیصلے کے وقت تک کے لیے ان ملزمین کو پھانسی دیا جانا ملتوی کر دیا جائے۔

معلوم ہوا ہے کہ درخواست مذکور منظور کرلی گئی ہے اور ان لوگوں کو ابھی پھانسی نہیں دی جائے گی۔ پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کے لے انگلستان کے کسی ممتاز قانون پیشہ شخص کی خدمات حاصل کرنے کے متعلق انتظامات کیے جارہے ہیں۔

(ہمدرد۔ دہلی، ۱۳/اکتوبر ۱۹۲۷ء، ص ۵)

کشکول

اسیرانِ کاکوری کا خاتمہ

کاکوری کے مقدمہ کے واقعات اور حالات سے قارئین ہمدرد بخوبی واقف ہیں۔ افسوس ان نوجوانوں نے حب وطن کے جوش میں بعض کارروائیاں ایسی متشددانہ بھی کیں، جن سے کسی محبّ ملک و وطن کو اتفاق نہیں ہو سکتا، لیکن حکومت کے قہرمانی قوت نے جو انتقام لیا، کیا کوئی مہذب حکومت اس پر اپنے کو قابل ستائش سمجھ سکتی ہے۔ اشفاق اللہ خاں، راجندر ناتھ لاہری، روشن سنگھ، اور رام پرشاد بسمل بے شک مجرم تھے۔ لیکن حب وطن کے ان سیاسی مجرموں کی کیا یہی سزا مناسب تھی کہ ان کی نوجوانی کے جوش کی کارروائیوں پر بھی نظر نہ کی گئی اور ان کو پھانسی کے تختہ پر چڑھادیا گیا۔ کیا مذہب سلطنتوں میں سیاسی مجرمین کی سزا کا یہی دستور ہے کہ ان کی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تمام ملک نے متفق اللفظ ہو کر حکومت سے درخواست کی، صوبہ ممالک متحدہ کے مجلس مقننہ کے اراکین نے ایک قرارداد کی تحریک کی، اسمبلی کے مختلف سیاسی خیال کے اراکین کی دستخطوں سے میموریل بھیجا گیا، اور ان سب میں یہی درخواست کی گئی کہ ان نوجوانوں کو جو اپنے جذبہ حب وطن سے بعض نامناسب کارروائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں سزا ضرور دی جائے لیکن پھانسی کے تختہ پر نہ چڑھایا جائے۔ ان کی نوجوانی، ان کی تعلیم، سوسائٹی میں ان کے درجہ پر خیال کر کے معمولی ڈاکوؤں کی طرح ان کی زندگیوں کا خاتمہ نہ کیا جائے لیکن ہماری مہذب حکومت کی مہذب پالیسی اس کی مقتضی نہ ہوئی کہ جس جماعت نے متشددانہ کارروائیوں کے ذریعہ حکومت کا خاتمہ کرنے اور غیر ملکی حکمرانوں کو ملک سے خارج کر کے اہل ملک کی حکومت قائم کرنے کا تہیہ کیا تھا ان کو زندہ باقی چھوڑے۔ چنانچہ ملک کی آواز کی کوئی شنوائی نہ کی گئی اور ان

نوجوانوں کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا کر ان کی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ غیر ملکی حکومت کی عدالتوں سے گو سزایاب ہو گئے، ان کے گلوں میں پھانسی کا پھندا ضرور پڑ گیا اور ان کی روحیں اس عالم سے گذر کر اب منتقم حقیقی کے سامنے پہنچ گئیں، جہاں وہ اپنے اعمال کے مطابق سزا و جزا پائیں گی۔ لیکن حب وطن کے جس جذبہ صادقہ نے ان کو ان کارروائیوں پر مجبور کیا وہ سیاسیات ہند میں قابل یادگار باب کا اضافہ کرنے کا باعث ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ اشفاق اللہ اور لاہری وغیرہ ہنسی خوشی اور نہایت استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر چڑھ گئے، اور انھوں نے اپنے الفاظ اور اپنے استقلال سے ظاہر کر دیا کہ ان کے اپنے خیال میں وہ ملک کی آزادی کی کوششوں پر قربان ہو رہے ہیں۔ آج بے شک وہ معمولی ڈاکوؤں کی طرح پھانسی پر چڑھا دیے گئے لیکن ایک وقت آئے گا جب ان غلط مگر حب وطن کے جذبہ صادقہ سے متاثر نوجوانوں کی حب الوطنی اور ان کی قربانیوں کے گیت آزاد ہندوستان کو گانے کا موقع ملے گا۔

(روزانہ ہمدرد۔ دہلی، ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء، ص ۴-۳)

وکیل ملزمین کی بحث

لکھنؤ۔ ۱۶ر فروری : کل کاکوری کا مقدمہ سازش مسٹر ہملٹن اسپیشل جج کی عدالت میں پیش ہوا۔ مسٹر چودھری نے جو ملزمین کی جانب سے وکالت کر رہے ہیں، طویل بحث کی جو ختم نہیں ہوئی اور اجلاس ملتوی ہو گیا۔

(عصر جدید۔ کلکتہ، ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

اشفاق اللہ خاں کی زندگی کے آخری لمحے

مسٹر اشفاق اللہ خاں کاکوری کے قیدی نے بڑی خوشی سے پھانسی کا سامنا کیا۔ وہ نہایت خوبصورت، تنومند اور اونچا پورا جوان تھا۔ جیل میں بہت دنوں تک رہنے کی وجہ سے اس کی تندرستی بہت خراب ہو گئی تھی۔ جب اس کے دوستوں نے جیل میں اس سے ملاقات کی تو اس نے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ جیل کی کوٹھری میں رہنے کی وجہ سے میری تندرستی خراب ہو گئی ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ اس نے کہا "آج کل میں بہت تھوڑا کھانا کھاتا

ہوں اور اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ مذہبی عبادات میں گزارتا ہوں"۔

پھانسی سے ایک روز پہلے ان کے دوست فیض آباد جیل میں ان سے ملاقات کرنے گئے۔ اس روز انھیں پرانے کپڑے واپس دیئے گئے تھے۔ انھوں نے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھو کر پہن لیے تھے اور اپنے بدن کو تیل اور صابن وغیرہ سے خوب صاف کیا تھا اور اچھی طرح نہا کر بالوں میں کنگھی کی تھی۔ بال۔ بے قاعدہ بڑھے ہوئے تھے۔ اپنے دوستوں سے بہت خوشی سے گفتگو کی اور کہا کل میری شادی ہو گی۔ دوسرے دن ساڑھے چھ بجے صبح پھانسی دی گئی۔ جس وقت پھانسی کے لیے لے جا رہے تھے تو وہ راستہ چلتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ قرآن مجید ایک جزودان میں ان کی گردن میں حمائل تھا۔ زبان پر کلمہ توحید جاری تھا۔ پھانسی کے تختے کے پاس گئے اور اس کو چوم لیا اور اپنے دوستوں کو جو وہاں جمع تھے مخاطب کر کے کہا "یہ میرے ہاتھ انسانی خون سے کبھی رنگین نہیں ہوئے۔ میرے خلاف جتنے الزامات لگائے گئے وہ سب غلط ہیں۔ خدا میرا اور میرے کاموں کا انصاف کرے گا"۔

اس کے بعد رسّی گلے میں ڈال دی گئی اور وہ خدا کا نام لیتے ہوئے اس جہاں سے گذر گئے۔ رشتہ داروں کی درخواست پر میت دفن کرنے کے لیے ان کے سپرد کر دی گئی، جسے وہ لوگ شاہ جہاں پور لے گئے جو مرحوم کا وطن تھا۔

اشفاق اللہ حسرتؔ

مسٹر اشفاق اللہ خاں اردو کے شاعر تھے اور ان کا تخلص حسرتؔ تھا۔ انھوں نے اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے چند اردو اشعار موزوں کیے جن کے معنی تقریباً یہ ہیں :

"دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ میں اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہوں۔

صرف خدا ہمیشہ قائم رہنے والا ہے"۔ (امرت بازار بحوالہ آج)

(عصر جدید۔ کلکتہ، ۵/ جنوری ۱۹۲۸ء، ص ۳)

☆☆☆



اشفاق اللہ خاں شہید کا جسد خاکی

کاکوری کیس کا ہیرو



اشفاق اللہ خاں (شہید)